سلسلۂ نصابات تعلیم جامعۂ عثمانیہ

یونانی شہنشاہیت

مصنفہ

ولیم اسکاٹ فرگسن پروفیسر تاریخ قدیم
ہرورڈ یونیورسٹی

مترجمہ

محمد عنایت اللہ بی۔ اے۔ ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ

سنہ ۱۳۴۲ھ م سنہ ۱۳۳۳ف م سنہ ۱۹۲۴ء

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہہ کتاب مسرز کانسٹیبل اینڈ کمپنی کے ایجنٹ
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی اجازت سے اُردو میں
ترجمہ کرکے طبع کی گئی ہے

تقدمہ

مصنف اپنی والدۂ محترمہ کے نام سے
اس کتاب کو معنون
کرتا ہے

دیباچۂ مرقومۂ مصنّف

اس کتاب میں سات مضامین ہیں۔ جن میں سے چھ مضمون ماہ فروری ۱۹۱۳ء میں لوول انسٹیٹیوٹ واقع بوسٹن میں پڑھے گئے تھے۔ ابتدائی مضامین میں ایک سرسری بیان اُن ضروری باتوں کا کیا ہے جن سے حکومت شہنشاہی کا نشو ونما ہوا۔ باقی مضامین میں خاص خاص شہنشاہیوں کی امتیازی باتوں کا ذکر ہے جو یونان میں قائم ہوئیں اور ایسے زمانہ میں قائم ہوئیں جبکہ شہری ریاستوں نے آخری صورت اختیار کرکے اُن سیاسی افراد میں اپنا تجزیہ شروع کردیا تھا جن سے وہ بنی تھیں۔ اس مضمون میں میں نے کسی قسم کی ندرت یا تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ بلکہ زیادہ تر خیال اس کا رہا ہے کہ جو بات کہی جاوے وہ صاف ہو۔ اتھنز۔ اسپارٹا۔ اسکندر سلاطین بطلیموسی و سلیوقیہ اور شاہان انٹی گونی کی شہنشاہیوں کے نظم حکومت کے بارے میں نظری یا عملی پہلو سے جو بحثیں یہاں ہوئی ہیں مجھکو اُمید ہے کہ وہ عام ناظرین کتاب کیلئے مفید ثابت ہونگی۔ اور خاصکر اُن طالب علموں کیلیے جنکا مضمون سیاسیات اور تاریخ ہے۔ جس خیال کو میں نے خاص طور پر ذہن نشین کرنا چاہا ہے وہ یہ ہے کہ اس کل زمانہ میں دستوری ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ پیرک لیز کے زمانے میں شہری ریاست اپنے درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔ لیکن شہری ریاستوں میں اتحاد کی تکمیل کیلیے اس زمانے کے دوسو برس بعد بھی کوششیں جاری تھیں۔ علوم کی طرح نظم حکومت کے بارے میں بھی عہد کلاسک (قدیم) یونان کا ابتدائے شباب تھا لیکن اسکی پوری طاقت وپختگی کا زمانہ مقدونیہ والوں کے دور میں آیا۔ مگر رومانے اسی دور میں اسکا کام تمام کردیا۔

مختصر طور پر میرا دعویٰ جس پر دلیل لایا ہوں یہ ہے کہ شہری ریاستیں گویا ایک ایک خانہ والے عضویات (Unicellular Organism) تھے جن میں ہر ایک کی اندرونی کیفیت قابل اعتنا تھی مگر ان میں ازدیاد اسی وقت ممکن تھا جبکہ وہ تقسیم در تقسیم ہوتے رہتے۔ یہ مادہ اُن میں موجود تھا کہ اپنی مثل بے شمار خانے (Cells) پیدا کر دیں۔ مگر خانے چاہے نئے ہوں یا پرانے اُن میں یہ قابلیت نہ تھی کہ سب جُڑ کر ایک مضبوط قوم پیدا کر دیتے۔ چنانچہ جب اتھنز اور اسپارٹا اس کوشش لاحاصل میں پڑے کہ یونان پر اپنی اپنی سرگروہی کو شہنشاہی کی شکل میں تبدیل کر دیں تو پھر کل یونان ایک سرطان کا سا زخم بن گیا جس کا معقول علاج یہ نہ تھا کہ ہر ایک شہری ریاست کے اندرونی انتظامات کو تبدیل کیا جاتا جیسا کہ افلاطون اور ارسطاطالیس نے چاہا تھا بلکہ علاج در اصل یہ تھا کہ ان خانوں (Cells) کی دیواروں کی جو کچھ ساخت تھی انہیں کوئی ایسی تبدیلی پیدا کرتے کہ ایک خانہ کی دیوار دوسرے خانہ کی دیوار سے وصل ہو سکتی۔ لیکن آخری زمانہ میں پرانے قاعدوں کی پابندی یونانی قوم کی طبیعت کا ایسا خاصہ ہو گئی تھی کہ وہ اس ناگزیر اور سودمند تبدیلی کو پیدا کرنے کی جگہ اُس کے خلاف کوششوں میں مصروف ہو گئی۔ مگر آخر کار یہ مخالفت نہ چل سکی اور اس تبدیلی کی ضرورت ماننی پڑی۔ پھر بھی یونانیوں نے اپنی اپنی شہری خصوصیت اور علحدگی کو برقرار رکھا مگر اتحاد و اشتراک کے طریقوں کو کام میں لا کر اور فرمانرواؤں کو دیوتا بنانے کا طریقہ نکال کر بظاہر ملکی ریاستیں (Territorial States) پیدا کر لیں۔ بس ان دونوں طریقوں سے وہ شکلیں پیدا ہوئیں جن سے ایک بڑا سیاسی مسئلہ ایک ہی طرز پر حل ہو جاتا تھا۔ مگر یونانیوں کے سیاسی نظریہ کے تنگ و محدود ہونے کو کوئی امر اس سے زیادہ منکشف نہیں کرتا کہ اس نظریہ میں نہ تو وہ ان دونوں طریقوں کو کسی شمار میں لائے اور نہ انھوں نے اُن کے مقدم اسباب پر پورا غور کیا۔

کیمبرج۔ بیس جون ۱۹۱۳ء

فہرست مضامین

پہلا باب ۔ شہنشاہی اور شہری ریاست

ساتواں باب۔ سلاطین انتی گونی کی شہنشاہی

تمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یونانی شہنشاہیت (امپیریل ازم)

پہلا باب

شہنشاہیت اور شہری ریاست

میں چاہتا ہوں کہ پہلے یہاں ایسی چند اصطلاحات کی تعریف بیان کر جاؤں جو کتاب میں بار بار آئینگی اور پھر یونانی ریاستوں کی اُن خصوصیات کو بھی کسیقدر تفصیل سے تحقیق کروں جنکی سلامتی کو شہنشاہی حکومت سے خطرہ رہتا تھا نیز شہنشاہی حکومت کی تدریجی ترقی کا حال بھی لکھوں جو اسکندر اعظم اور اسکے جانشینوں کے زمانے میں ایک دیوتائی حکومت کے درجے تک پہنچ گئی تھی (یعنی بادشاہوں نے بادشاہ اور دیوتا ہونیکی دونوں حیثیتوں کو اختیار کرلیا تھا) اور علاوہ ان تنقیحات کے ان مقدمات کو بھی ایک خاص اسلوب سے ترتیب دوں جن سے آگے کے چھ بابوں میں اکثر بحث کرنی ہوگی۔

جب ایک ریاست (اسٹیٹ[1]) دوسری ریاستوں پر حکومت کرنے لگے تو ایسی

---

[1] مصنف نے یہ تعریف "امپائر" یعنی شہنشاہی کی کی ہے جسمیں "اسٹیٹ" یعنی ریاست کا لفظ ایسا آیا ہے جو خود تعریف کا محتاج ہے۔ اسلئے اسٹیٹ کی تعریف بیان کر دینی بھی مناسب ہوگی۔ علم اصول قانون میں اس لفظ کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ "اسٹیٹ" یا ریاست ایک ایسا گروہ آدمیوں کا ہوتا ہے جو اکثر ایک ہی قطعۂ زمین پر آباد ہوتا ہے اور جس کی

حکومت سے جو ریاست قائم ہو اسکو شہنشاہی (امپائر) کہتے ہیں۔ اس خصوص میں یہ امر غیر متعلق ہے کہ ایسی ریاستِ بالادست کا جمہور[1] ذی اختیار خاص اپنی ریاست کے انتظام کیلئے کس قسم کی نظمِ حکومت پسند کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس ریاستِ بالادست میں اختیارات ایک مونر کی یعنی حکومت شخصیہ کے قبضے میں ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک اولیگارکی (حکومت عدیدیہ) یعنی قوم کے چند نفوس ملکر اُسکے منتظم ہوں۔ ممکن ہے کہ جملہ انتظام حکومت عموم کے ہاتھ میں ہو۔ مگر نظمِ حکومت میں اس فرق کا کوئی اثر اُس تعلق پر نہیں پڑتا جو ریاستِ بالادست کو اپنی ریاستہائے ماتحت سے ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ یہ امر بھی غیر متعلق ہے کہ کسی ریاستِ ماتحت کا نظمِ حکومت کیا ہے۔ یعنی اسمیں ایک شخص حکومت کرتا ہے یا چند اشخاص حکومت کرتے ہیں یا اختیارات عموم کے قبضے میں ہیں۔ کیونکہ ایک شہنشاہی کی ماتحت ریاستوں میں ہر قسم کا نظمِ حکومت چلنا ممکن ہے اور ایسا ہی اکثر دیکھنے میں بھی آیا ہے۔

(۲) پس جمہور حاکم یا جمہور محکوم اپنی اپنی ریاست کا انتظام خواہ کسی طریقے سے کرے شہنشاہی ہر حال میں اسکے ساتھ چل سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ جمہورِ حاکم معاملات سیاسی کو ایک ایسی جماعت کے ذریعے سے انجام دیتا ہو جو پیشۂ حکومت میں خاص تربیت رکھتی ہو جیسا کہ بیوروکریسی (حکومت دفتری) میں ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ریاست محکوم اپنا تمام سیاسی کاروبار جمہور کے کبھی ایک حصّے کو اور کبھی دوسرے حصّے کو سپرد کرتی ہو جیسا کہ ری پبلک (حکومتِ عمومیہ) میں ہوتا ہے۔ مگر تاوقتیکہ مختلف ریاستیں یا ریاستوں کے حصّے کسی ایک ترکیب میں شامل ہوں شہنشاہیت کا تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ مگر جہاں مختلف ریاستوں کی باہمی ترکیب سے ان میں ایک تعلق برتر

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کثرت افراد یا افراد کی ایک مخصوص جماعت کا حکم بوجہ ایسی کثرت رکھنے یا جماعت ہونے کے ان افراد کے مقابلے میں غالب ہے جو اس سے مخالفت کریں (مترجم)

[1] "پیپل" یا جمہور ایسے لوگوں کی ایک جماعت کثیر کو کہتے ہیں جو ایک ہی زبان۔ ایک ہی سے رسم و رواج۔ ایک ہی سے خیالات رکھنے کی وجہ سے ایسی جماعت بنی ہو اور ایسی جماعت کے لوگوں میں یہ یک رنگی بالعموم انکے ہم نسل۔ ہم مذہب اور ایک ہی سی روایات سابقہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو" (مترجم)

وکہتر کا پیدا ہوگیا تو پھر فوراً ایک شہنشاہی قائم ہوجاتی ہے ۔

برتر و کہتر کے تعلق کا موجود رہنا ہر صورت میں شہنشاہی (امپائر) کی ایک لازمی
شرط ہے ۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کے تعلق کا علانیہ اقرار کرلیا جاتا ہے ۔ انتظام حکومت
میں زیادہ لیاقت کا رکھنا خواہ اسکا دعویٰ عیسائیوں کو ہو یا مغربی تمدن کو یا انگلوسیکسن
قوم کو مگر یہی لیاقت وہ چیز ہے جسکی بنیاد پر آجکل کی چند ممتاز قوموں نے خواہ اس کو
انکا غرور سمجھئے ۔ خواہ حرص دنیا ۔ خواہ مقتضائے ایمان کمتر قوموں پر حکومت کرنے کو
اپنا ایک استحقاق سمجھ لیا ہے ۔ (نصرانیت کا) پرانا حکم تو یہ تھا کہ " دنیا کے ہر گوشے
میں جا اور خدا کی مخلوق کو انجیل کا سبق دے ۔ " مگر اب اسکی جگہ یہ حکم ہے کہ " اٹھ اور گورے
کا بوجھ کندھے پر لیکر چل ۔ " آجکل کے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ پہلے جسطرح عاقبت
کی بہتری کیلئے ایک صحیح مذہب ملنے سے اسکی تبلیغ لازم ہوجاتی تھی ۔ اسیطرح اب دنیا
کی بہتری کیلئے کوئی عمدہ دستور العمل ملنے سے دوسروں کو اپنا مطیع بنانا ضروری ہوجاتا ہے ۔

اس اخلاقی وسیاسی برتری سے کیقدر کم مکلف وہ حق سمجھا جاتا ہے جس کو
صاف صاف الفاظ میں زبردست کا حق کہتے ہیں ۔ اسکی اہمیت کا حال یہ ہے کہ بین الاقوامی
قانون میں فتح و کشور کشائی کے حق کو جس سے دوسرے کی زمین پر قبضہ ہوجاتا ہے
درآنحالیکہ پہلے سے کس قسم کا کوئی حق موجود نہیں ہوتا جائز تسلیم کیا گیا ہے ۔ مگر جس
حالت میں ریاستوں میں یہ معاہدہ ہوجاتا ہے کہ کوئی ریاست دوسری ریاست پر برتری
کا دعویٰ نہ رکھہ سکیگی تو پھر یہ شکل ایک ریاستی اتحاد (فیڈریشن) یا اسکی مثل کسی چیز کی ہوتی (۳۱)
ہے جسکو شہنشاہی نہیں کہہ سکتے ۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمانہ گذرنے کے
بعد برتری و کہتری کا تعلق مٹ جاتا ہے اور اسکی جگہ ایک ہی سے حقوق برتر و کہتر میں
قائم ہوجاتے ہیں ۔ گو ریاست کی یہ شکل بالکل ایک جدا چیز ہے مگر اسکو بھی امپائر یا
شہنشاہی کہہ جاتے ہیں جیسے کہ موجودہ زمانے میں برطانوی دنیا کا حال ہے مگر یہاں
امپائر یا شہنشاہی کا نام کیقدر نادرست ہے ۔

اب ان سب کے علاوہ ایک دوسری شکل شہنشاہی کی ہے جسکو ہم شہنشاہی
مطلق کہہ سکتے ہیں یعنی اسمیں حاکم بالادست جمہور نہیں ہوتا بلکہ ایک شخص واحد ہوتا
ہے جسکو امپراطور یا شہنشاہ کہتے ہیں اور اسکے خاندان کو خاندان شاہی ۔ اس تنفس کو

جو اختیار حاصل ہوتا ہے اسکی نسبت ۱۹۰۱ء میں کو اینز برگ کے مقام پر شہنشاہ جرمنی نے کہا تھا کہ یہ اختیار کسی پارلیمنٹ یا جمہور کی مجلسوں و فیصلوں سے نہیں ملا کرتا بلکہ وہ خدا کے فضل و کرم کا ایک عطیہ ہوتا ہے۔ اس شہنشاہ کا قول ہے کہ "امپراطور خدا کا تجویز کردہ آلۂ حکومت ہے اور بلا لحاظ زمانے کی رائے اور خیالات کے وہ اپنے طریقے پر چلتا ہے"۔ پس امپرالمور یا شہنشاہ کی تعریف جب ایسے الفاظ میں کیجاوے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنی ریاست یعنی اُس جمہور کا جس سے ریاست بنی ہے کوئی حصّہ نہیں ہے بلکہ اس سے خارج ہے۔ یا تو وہ اسکے برابر ہے یا اس سے بڑھکر۔ ایسا شہنشاہ اپنی ذات سے ایک ریاست ہوتا ہے اور اسکے اختیارات ریاستی نہیں بلکہ شہنشاہی ہوتے ہیں۔

امپراطور کی یہ تعریف کہ وہ اپنی ذات سے ایک ریاست ہے گو مکمل نہیں مگر اسمیں یہ شرط ضرور موجود ہے کہ شہنشاہ کی رعایا خود کوئی سیاسی ترکیب یا ارادہ نہیں رکھتی اور اس تعریف میں اس شرط کا بھی ہمیشہ موجود رہنا مان لیا گیا ہے کہ رعایا نے ہمہ تن اپنے تئیں شہنشاہ کے حوالے کر دیا ہے۔ یہی حالت رومانیوں کی اُس وقت سے پہلے رہی تھی جبکہ اُنکی ریاستوں کو وسعت ہوئی اور رعایا کے حقوق سابقہ پھر زندہ کئے گئے۔

مگر یہ سب کچھ سہی دنیا میں کہیں ایسے حاکم کا وجود نظر نہیں آتا جو کامل طور پر مطلق العنان ہو۔ ایک (۴)
کامل اختیارات رکھنے والے کا ارادہ بھی ہمیشہ ان قوانین کا پابند رہتا ہے جو اسنے خود وضع کئے ہیں یا جنکو تخت کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے کے سامنے اپنی کسی بات کا جواب دہ نہو لیکن جو روایات یا دستور پہلے سے چلے آتے ہیں انکے سامنے ضرور جوابدہ ہے۔ اپنے فرامین کو وہ مسترد کر دے لیکن جس حالت میں کہ وہ جاری ہیں بلا خوف بدنامی انکے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

جس تدبیر یا عملی حکمت (پالسی) سے ایک جمہور حکمران یا حاکم مطلق العنان کسی شہنشاہی (امپائر) کو چلاتا ہے اُسکو شہنشاہیت یا امپیریل ازم کہتے ہیں۔ یہ لفظ فی الواقع رومتہ الکبریٰ کا ایک ترکہ ہے اور اُس کمالِ قدرت کا بیزبان شاہد رہ چکا ہے جو ریاست سازی میں رومانی شہنشاہی کو حاصل تھی۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ شہنشاہیت (امپیریل ازم) کا لفظ زبان پر آتے ہی رومانی امپیریل ازم (شہنشاہیت) کی طرف فوراً ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ رومانیوں کی شہنشاہیت کوئی امر اتفاقی نہ تھا کیونکہ وہ ہی خاص رومانی

شہنشاہی نہیں جسکی دنیا میں شہرت ہوئی بلکہ شہنشاہیت کی جسقدر اقسام ہوسکتی تھیں وہ سب
رومانیوں کے تجربے میں آکر دنیا پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ رومانیوں کے زمانے میں سیاسی ترقی کا رخ
کچھ ایسا رہا کہ شہنشاہیت کامیاب ہوتے ہوتے اپنے منطقی نتیجے کے بالکل قریب پہنچ گئی
اور ایسی قریب پہنچ گئی جسکی مثال دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے یا اسکے بعد کہیں نظر نہیں آئی
منطقی نتیجہ کسی شہنشاہی کی پالسی یا تدبیر کا جسمیں فوجی طاقت کا موجود ہونا پہلے
سے فرض کر لیا گیا ہو یہ ہے کہ وہ ایک عالمگیر سلطنت پیدا کرلے۔ زمانۂ سلف کے دو بڑے
شہزور بانیان شہنشاہی یعنی اسکندر اعظم اور جولیوس سیزر کا بھی یہی مقصد تھا کہ کسیطرح
اپنی قلمرو میں تمام عالم آبادان کو شامل کرلیں۔ میلادِ مسیح کے قبل اور بعد کا ایک بڑا
زمانہ ایسا گزرا ہے جسمیں یہ نتیجہ قریب قریب حاصل کر لیا گیا تھا۔ اس زمانے میں بجز (۵۱)
چند خانہ بدوش قوموں یا سرکش پارتھیوں (شمال مشرقی ایرانیوں) کے کوئی ایسا نہ تھا
جسنے رومانی مجلس (سینٹ) یا رومانی شہنشاہوں کے حکم سے کامیابی کے ساتھ سرتابی
کی ہو۔ قسطنطین اعظم کے زمانے سے پانچسو برس بعد تک لوگوں کا یہ خیال رہا کہ جسطرح
دین عیسوی تمام دنیا کی ہدایت کیلئے اترا ہے اسیطرح رومانی شہنشاہی کل دنیا کو مسخر
کرنے کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ سنہ ۸۰۰ء کے حالات میں جہاں پروفیسر برِی نے
بادشاہ فرانس شارلیمین کی تخت نشینی کے اسباب بیان کئے ہیں وہاں لکھا ہے کہ "آجکل
دنیا میں بہت سی شہنشاہیاں ہیں لیکن اوس زمانے کے لوگوں کے ذہن میں شہنشاہی
سے مراد صرف رومانی شہنشاہی تھی جو ایک ہی تھی اور اسکے ٹکڑے نہیں ہو سکتے تھے۔
دو رومانی شہنشاہیوں کا خیال کسی طرح ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ خیال البتہ ہوسکتا
تھا کہ ایک شہنشاہی میں ایک سے زائد شہنشاہ یا امپراطور ہوں لیکن یہ زائد امپراطور یا
شہنشاہ صرف اسی حالت میں جائز سمجھے جاتے تھے جبکہ ایک ہی امپراطور یا شہنشاہ
کے وہ مددگار اور دست و بازو ہوں۔ رومانیوں نے شہنشاہی کے مفہوم میں عمومیت
اور عالمگیری کا خیال جسقدر پیدا کیا تھا اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آئین
میں شاہان فرنگ اور بوسفورس پر قیصران قسطنطنیہ اپنے تئیں رومانی شہنشاہی
کا خادم سمجھتے تھے اور شہنشاہی کی وسعت کا یہ حال تھا کہ آرمینیہ کی سرحد سے لیکر
بحر اطلانٹک کے ساحلوں تک پھیلی تھی۔

اگرچہ شہنشاہی کے قائم کرنے میں رومانی درجۂ کمال کو پہنچ گئے تھے اور جس لیاقت اور ہوشیاری سے انھوں نے اپنی قوتوں کو یکجا کر کے سلطنت کو استحکام دیا اسکی کوئی اور مثال موجود نہیں۔ لیکن باایں ہمہ سیاسیات کے متعلق کوئی فن خواہ لڑائی کا ہو یا تدبیر ملکی کا ایسا نہ تھا جسمیں وہ اپنے سابقین یعنی یونانیوں کے شاگرد نہ رہ چکے ہوں (۶) رومانیوں نے جن ریاستوں سے شہنشاہی پیدا کی وہ ان ریاستوں سے رقبے میں بہت زیادہ تھیں جنسے اسپارٹا اور ایتھنز والوں نے شہنشاہی قائم کرنی چاہی تھی اور انھوں نے بہ نسبت یونانیوں کے زیادہ قوت کیساتھ کام کیا۔ رومانیوں نے مقدونیہ والوں کی بادشاہیوں کو غارت کر دیا مگر انہی کے ایجاد کئے ہوئے طریقوں کو اختیار کر کے اور انہی کی غلطیوں سے سبق لیکر اپنا فائدہ نکالا۔ اور آخر کار انکی کامیابی سے وہ شہنشاہی معدوم ہو گئی جسکے بنانے میں اسپارٹا۔ ایتھنز۔ اور مقدونیہ نہایت لیاقت اور سرگرمی سے مصروف ہوئے تھے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلۂ مضامین میں اپنے اپنے موقع سے شہنشاہی کے متعلق وہ تمام تجربات معلوم کریں جنکے عمل سے یونانیوں نے نہ صرف اپنی ذہانت و ذکاوت کے جوہر دکھلائے بلکہ ایک راستہ کھول دیا کہ آگے چلکر پرانی دنیا کی ریاستیں رومانی سلطنت کے سایہ میں آکر متحد ہو جاویں۔

ابھی ابھی میں نے ان ریاستوں کے قلیل الوسعت ہونے کا ذکر کیا ہے جنسے اسپارٹا اور ایتھنز کو شہنشاہی قائم کرنے میں کام پڑا۔ اس باب کے اخیر حصے میں میں نے ان حالات کے پیش آنے اور قوت پکڑنے کا ذکر کیا ہے جنکی وجہ سے پہلے تو شہنشاہیت کو ایک مبہم و دقیق مسئلہ سمجھا گیا اور پھر اسکو اختیار کرنے سے جہانتک ممکن ہوا گریز کیا۔ مگر آخر کار شہنشاہی قائم کرنا قرین مصلحت سمجھ لیا۔ مگر ان شکلوں کو بیان کرنے سے پہلے میں ایسے امور کو صاف کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے یونانیوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو شہنشاہی کیلیئے بہت دیر ہضم بنا دیا۔ یونان کے جس قدیم زمانے کو عہد کلاسک کہتے ہیں اسپین اور ایطالیہ کے دوسرے دور ترقی میں شہر سے مراد ریاست ہوتی تھی مگر ہمیشہ سے یہ شہر یا ریاستیں موجود نہ تھیں کیونکہ عصر قدیم میں ایک وقت ایسا تھا کہ زمین ایسے گروہوں کے قبضے میں ہوتی تھی جو تمدن کی بالکل ابتدائی حالت میں ہوتے تھے۔ ان گروہوں کو یونانی زبان میں ایتھنی کہتے تھے۔ انکو شہر یا ریاست قائم کرنے سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ لیکن عہد کلاسک جب آیا تو صرف شمال

اور جنوب کے بعض حصے ایسے رہ گئے جنکے لوگوں نے اپنی غیر تمدنی حالت کو چھوڑ کر شہری ریاستیں قائم نہیں کیں۔ اور اسطرح کسی شہنشاہیت میں شرکت کے قابل نہ بنے۔ باقی تمام اطراف میں شہری ریاستیں چھٹی صدی قبل مسیح کے زمانے سے قائم ہو گئی تھیں۔

جسطرح ہر چیز کی ابتدا تاریکی میں ہوتی ہے اسیطرح ان شہری ریاستوں کی ابتدا پر بھی ایک پردہ پڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قیاس دوڑانے کیلیئے خوب خوب موقعے ملتے ہیں۔ ان ریاستوں کی ابتدا کی نسبت جو خیالات ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقبول تھے وہ فسٹل دی کولانژے کی فکر رسا کا نتیجہ تھے جسکو اس مصنف نے اپنی دلچسپ کتاب "شہر قدیم" میں ظاہر کیا تھا۔ کولانژے کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک شہری ریاست اپنی مکمل صورت میں یکلخت پیدا ہو گئی۔ اسکی ساخت بالکل مصنوعی تھی اور قصداً خاندان کے نمونے پر وضع کیگئی تھی اور خاندان کا نمونہ ظاہر ہے کہ پہلے سے موجود تھا۔ یعنی خاندان ایک مذہبی مجمع ہوتا تھا جو اسلیئے منظم کیا گیا تھا کہ اپنے باپ دادا کی پرستش کیا کرے۔ باپ دادا کی روحیں انسان کیلیئے سب سے پہلے عبادت کے لائق سمجھی گئی تھیں بلکہ ہمیشہ کیلیئے (نعوذ باللہ) وہی معبود تھیں۔ مگر کولانژے کے یہ تمام قیاسات تحقیق کی کسوٹی پر کھرے نہ نکلے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا نظر آیا کہ شہری ریاست بھی جسطرح تخم سے درخت پیدا ہوتا ہے ایک قدرتی نمو و بالیدگی کا نتیجہ تھی۔ اور اس نتیجے کے پیدا ہونے تک جسقدر مدارج و مرحلے پیش آئے وہ متعدد اور طرح طرح کے تھے مگر ہر صورت میں سیاسی ترقی کی طرف مائل اور اسکے مظہر تھے۔ متعدد جدا جدا ریاستوں کا پیدا ہونا یونان کے لیئے ایک قدرتی امر تھا۔ کیونکہ ملک کے طبیعی حالات اس صورت کو آسانی سے قبول کرتے تھے۔ لیکن ان طبیعی حالات یا جغرافی کوائف پر غور کرنیسے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ یہ ریاستیں شہروں کی صورت کیوں رکھتی تھیں (یعنی آزاد ریاستوں کے قائم ہونیکی وجہ شہر کسطرح ہو جاتے تھے) اس نکتے کو صحیح طور پر معلوم کرنے کیلیئے ہمکو اپنا مشاہدہ صرف یونان کی حالت پر محدود نہ رکھنا چاہیئے کیونکہ تمام ملکوں میں یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ سیاست و آزادی۔ تعلیم و تمدن جہاں کہیں ہیں انکی ابتدا کسی شہر ہی سے ہوئی ہے۔ اور شہروں ہی نے تہذیب و سیاسی ترقی میں ہمیشہ انسان کی رہنمائی کی ہے۔ بابل قدیم کے

شہروں سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوا گو انہیں صحرائے عرب و شام کے بدوی قبائل کا نہایت
(۸) قدیم زمانے سے غلبہ رہا۔ فینیشیا والوں کی عالمگیر تجارت اور بے مثل صنعت و حرفت کا سلسلہ جس نے دنیا میں سب سے پہلے شروع کیا وہ بھی یہ ہی صور و صیدا کی مثل آزاد و یا خنیا شہر تھے۔ رومانی قانون اور فن حکومت کا وطن بھی ایک شہر یعنی رومۃ الکبریٰ ہی تھا اور جس وقت اطالیہ نے دوبارہ دنیا کو ترقی کا راستہ دکھایا تو یہ ملک بھی متعدد شہری ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا۔ جرمنی کے چند شہروں یعنی ہانس ٹاونز اور فلانڈرز کے آزاد قصبات اور انگلستان اور فرانس کے چارٹر یافتہ شہروں نے سیاسی آزادی یا سیاسی حقوق متوسطی یورپ کے باقی مقامات سے کہیں پہلے حاصل کر لیئے تھے۔ فی الواقع جہاں کہیں شہروں یا انکی بیرونی ماتحت ریاستوں نے آزادی کی تعلیم نہیں دی تو وہاں دیگر اسباب نے یہی نتائج پیدا کیئے۔ مثلاً مصر میں دریائے نیل کی طغیانی کے انتظام و بند و بست نے اور اسلامی اور عیسوی یورپ میں رومانی شہنشاہی کی مثال اور پیروی نے آزادی کی تعلیم ایسی ہی دی جیسے شہری ریاستوں نے دی تھی۔ شہروں میں ایک بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ ملکر کوئی کام کرنیمیں وہ بہت آسانی پیدا کر دیتے ہیں اور ہر قسم کے خیالات و افکار انہیں جلد شائع ہوتے ہیں۔ شہر کی دیواریں و فصیلیں اور اگر موجود ہوئے تو اسکے سربستہ کوچے اور محلّے انسان کی جان و مال و حقوق کی حفاظت کرتے ہیں۔ انہی سے مخلوق خدا کی آوازیں صدائے واحد بنکر اٹھتی ہیں۔ ۱۸۰۸ء میں جب انگلستان اور سوات زرلینڈ کی آزادی کو شاعر ورڈزورتھ نے خطرے میں دیکھا تو اپنی ایک نظم میں لکھا کہ۔

> "اسوقت دو صدائیں بلند ہیں۔ ایک سمندر (انگلستان) کی طرف سے اور دوسری
> پہاڑوں (سوت زرلینڈ) کی طرف سے ہر ایک صدا سخت و مہیب ہے۔ گر اے
> حریّت تو نے ہر زمانے اور عصر میں انہی صداؤں سے ایک لطف اٹھایا ہے اور یہ ہی تیری
> دلپسند راگنیاں رہی ہیں"

تاریخ بتا رہی ہے کہ روما۔ اسکندریہ۔ قسطنطنیہ۔ فلارنس۔ پیرس۔ کے شہروںنیں خلق کی زبان کا یہی نقارہ ایسا ایسا کریہ الصوت ہو کر گرجا ہے کہ بڑے بڑے شاہان جبار اسکو سنکر کانپ اوٹھے ہیں اور جب موت کا خوف کسی طرح دور ہوا تو اسی صدائے مہیب نے انکی مطلق العنانی پر قیدیں لگا دیں۔

ہمکو یہاں شہری ریاستوں کی ابتدا سے بحث نہیں ہے۔ بلکہ محض اُنکے خواص تحقیق (9)
کرنے ہیں تاکہ وہ اسباب دریافت ہوجاویں جو اونکو کسی شہنشاہی کی ترکیب و تحت میں
آنے سے متنفر رکھتے تھے۔ پس اس تحقیقات کیلیئے ہم کو اُن صدہا شہری ریاستوں کی
خلاصہ کیفیت ذہن نشین کرنی ہوگی جو ولادت مسیح سے تقریبًا چھ سو برس پہلے سے یونان
کے ترقی یافتہ حصوں میں جابجا کثرت سے موجود تھیں۔ اگر ریاست کو ایک جسم جاندار قرار دیا
جاوے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اُسکا سر اور دماغ تو شہر کی چار دیواری ہوتا تھا اور باقی جوارح
گویا شہر پناہ کے باہر اردگرد کی زمینیں۔ کھیت و کھلیان باغات و چراگاہ ہوتے تھے
یہ زمینیں شہر والوں کی جائداد ہوتی تھیں۔ اور وہ ہی انمیں کھیتی کرتے تھے۔ بہت سے
شہر ایسے ہوتے تھے جنمیں کاشتکار بستے تھے۔ ان میں بعض کم اور بعض بڑی حیثیت
کے زمیندار بھی ہوتے تھے۔ بعض محض مزدوری پیشہ ہوتے تھے۔ مگر اس اعتبار سے
کہ یہ سب ایک ہی کام اور پیشہ رکھتے تھے وہ برابری کے درجے پر ایک دوسرے سے ملسکتے
تھے اور مارچ کے مہینے سے نومبر کے مہینے تک یعنی جسوقت سے بہار کے موسم میں سبزہ
جمتا ہے اور درختوں میں پتے نکلتے ہیں اور کھیت تیار ہوکر کاٹے جاتے ہیں اور انگور کی
شاخوں سے خوشے اور زیتون کے درختوں سے پھل چنے جاتے ہیں یہانتک کہ پھر کھیتوں
میں بیج ڈالنے اور نئی پود لگانے کا وقت آتا ہے زراعتی زندگی کی موج لوگوں کو ہر روز
سورج نکلتے ہی شہر سے کھیتوں پر اور سورج ڈوبتے ہی کھیتوں سے شہر میں لایا
لیجایا کرتی تھی۔

یونان میں بہت کم شہر ایسے تھے جنکے علاقوں کی زمین سمندر تک پھیلی ہو۔
اس قرب کیوجہ سے سمندر سے بھی روزی کے بہت سے سامان لوگوں کو میسر رہتے
تھے۔ ماہی گیری کا پیشہ تو ہمیشہ سے ہوتا ہی تھا اسکے علاوہ اور بہت سے کام بھی
سمندر سے متعلق جاری تھے۔ بحری تجارت ایسے ملک سے جسکے کنارے سمندر
موجود ہو کبھی بند نہیں ہوا کرتی۔ یونان میں اس تجارت کو خاص طور پہ فروغ ہوا۔ (10)
کیونکہ سمندر نے تمام ملک میں ہر طرف اپنا گذر کرکے صدہا جزیرے اور ٹاپو۔ خلیجیں
اور کھاڑیاں بنا رکھی تھیں۔ چنانچہ چھٹی صدی قبل مسیح کی ابتدا سے دیکھنے میں آتا ہے
کہ جہاں کسی شہری ریاست کو عروج ہوا فورًا اس سے چند میل کے فاصلے پہ سمندر کے کنارے

ایک دوسرا شہر اسی ریاست سے متعلق آباد ہو گیا ۔ جسطرح پرانے شہر کا رنگ زمینداروں
اور کھیتی کرنے والوں کا سا ہوتا تھا اسیطرح نئے شہر والوں کی طبیعت ملاحوں اور تاجروں
کی سی ہوتی تھی ۔ زمیندار اکثر تجارت پیشہ بھی ہوجاتے تھے ۔ ادنیٰ درجے کے دہقانی اکثر
اپنے گھروں کے پاس چھوٹے چھوٹے کارخانے بنا لیتے تھے جو پرانے شہر میں تو اکثر کھلیان
کی صورت رکھتے تھے مگر اور جگہ انہیں ہاتھ کا کوئی کام بنایا جاتا تھا ۔ تاجروں اور ملاحوں کی
کی بھی آرزو ہوتی تھی کہ کچھ کمائی کر کے جسطرح ہو کوئی کھیت یا کھلیان یا باغ مول لے لیں ۔
پس اس زمانے میں شہری مشغلوں اور زراعتی کاموں میں بہت قریب کا تعلق پیدا ہو گیا
تھا ۔ جسوقت ساتویں صدی قبل مسیح میں بحر متوسط اور اسود کے ساحلوں پر یونانی آباد
ہوگئے تو بعض یونانی شہر مثل ملیتیوس ۔ ساموس ۔ کورنتھ ۔ ایجانیا ۔ کالکیس ۔
ایریتریا کے اس زمانے میں ایسے نظر آنے لگے جنکو موجودہ معنوں میں شہر کہا جاسکتا
ہے ۔ یعنی ان میں تجارت و حرفت کے کاروبار کی کثرت تھی ۔ اور جو لوگ زراعت
پیشہ ان شہروں سے علاقہ رکھتے تھے انکو بھی تجارت و حرفت میں تاجروں اور پیشہ وروں
کی طرح نفع اٹھانے کا موقع حاصل تھا ۔ کیونکہ سب کا تعلق ایک ہی شہر سے تھا ۔
بیرونجات اور شہر میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اسقدر تھا کہ شہروں کے مشاغل میں (۱۱)
نیرنگی اور تکلف زیادہ تھا اور بیرونجات میں سادگی بڑھی ہوئی تھی ۔

اسوقت امریکہ میں شہری اور دیہاتی زندگی میں بڑا فرق ہے ۔ شہروں میں
معاشرت کے اعتبار سے طرح طرح کے جلسوں محفلوں اور مجلسوں کی بہار رہتی ہے ۔
تماشا خانے ہوتے ہیں ۔ رات دن کسی نہ کسی بات پر گرمجوشی رہتی ہے ۔ اچھی اور
بری دونوں باتوں کیلیئے ترغیب کے سامان موجود ہوتے ہیں ۔ لباس اور وضع میں
ذراسی بدنمائی بھی گوارا نہیں کی جاتی ۔ مگر دیہات کی حالت یہ ہے کہ وہاں لوگوں
کی زندگی شبانہ روز ایک ہی طرح سے گذرتی ہے ۔ روپے کی ہوس دامنگیر رہتی ہے ۔
دوکانداری کو نامردی کا پیشہ سمجھتے ہیں ۔ پابند مذہب پرہیزگار و محتاط ہوتے ہیں مگر
آسانی سے اسکے آرزومند ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح گھر سے باہر قدم نکلے اور دنیا اور
دنیا کی نیرنگیوں کو تماشا کریں ۔ مگر ان دونوں زندگیوں کا فرق جو امریکہ میں موجب
پریشانی ہے یونان قدیم میں کم از کم جمہور کے اس حصے سے جسکو حکومت کے متعلق

رائے دینے کے اختیارات ملے ہوئے تھے قطعی معدوم تھا۔
کوئی شہر اتنا بڑا نہ تھا کہ جہیں کھڑے ہوکر باہر کے گاؤں نہ دکھائی دیتے ہوں۔ حکیم سقراط اور اسکے شاگرد اکثر ایتھنز کے شور وغل سے بچنے کیلئے محض چند منٹ میں ٹہلتے ہوئے شہر کے باہر باغوں کی چھاؤں اور ٹھنڈک میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ یونان میں وہ شہر غالباً بہت ہی بڑے سمجھے جاتے تھے جنمیں زیتون کے درخت اور انگور کی بیلوں کا گذر اسطرح نہو جسطرح آجکل یونان کے گاؤں اور قصبوں میں یہ ہی دو نوں چیزیں، نگتروں اور لیموؤں کے درختوں کے ساتھ بکثرت نظر آتی ہیں۔ ایتھنز باوجود دار الحکومت تھا مگر سادگی کا یہ حال تھا کہ علی الصباح مرغ کی آواز سونے والوں کیلئے بیداری کا گجر ہوتی تھی۔ غالباً اسی سادگی کی قدر دانی تھی جو امریکہ میں شہر بوسٹن کے ایک صاحب نے اس مضمون کی تجویز پیش کی کہ عجائب خانوں میں صحرائی جانوروں سے پہلے گھریلو اور پالو جانوروں کو رکھنا چاہیئے۔ ایک فرانسیسی نے لکھا ہے کہ یونان کے مشہور شاعر اریسٹوفنیز کے کلام سے کھیتوں اور کھلیانوں کی بو آتی ہے۔ (۱۲)
مگر یہی شہر ایتھنز وہ تھا جسکی نسبت پلوٹارک لکھتا ہے کہ فقط اشیاء سازی اور تعمیر کے کاریگروں میں بڑھئی۔ ڈھلیئے۔ ٹھٹیرے۔ سنگتراش۔ رنگ ریز۔ لکڑی پر سونے اور ہاتھی دانت کا کام کرنے والے۔ مصور۔ نقاش۔ منبت گر و گل کار۔ سوداگروں کے گماشتے۔ ملاح اور جہازوں کے رہبر۔ گاڑیاں بنانے والے۔ جوئے میں بیلوں کے نکالنے والے۔ رسیاں بٹنے والے۔ جلاہے۔ موچی۔ سڑک کوٹنے اور کانوں میں کام کرنیوالے یہ سب ایتھنز کے شہر ہی میں رہتے تھے۔ اور یہ ہی وہ ایتھنز تھا جسمیں ایک ایتھنز ہی مصنف لکھتا ہے کہ بحری سلطنت رکھنے کیوجہ سے صقلیہ۔ ایطالیہ۔ قبرس۔ مصر۔ لائیڈیا۔ پونٹس اور پلوپونےسس اور اور ملکوں کی پیداوار اور دستکاری کی چیزیں بکثرت آتی تھیں۔ جس صورت میں کہ خاص ایتھنز میں جو یونان کا سب سے بڑا شہر تھا کاشتکار اور تاجر اور اہل حرفہ ایک ہی جگہ رہتے تھے تو اقریطش کے ۴۳ اور یوبیا کے ۱۰ اور سیوس کے ۴ شہروں میں شہریوں اور دیہاتیوں کا بالکل شیر و شکر ہو جانا بھی قطعی ممکن ہوا ہوگا۔ سیوس کا جزیرہ صرف دس میل عرض میں اور ۱۴ میل طول میں تھا۔ جس صورت میں معاشرت کی یہ کیفیت ہو

پھر ایک ریاست کے تمام باشندے ایسے مل جل کر رہتے ہوگئے جسکا اندازہ آجکل کے تجربے سے باہر ہے۔ گو کہا یہ جاتا ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی عنقریب یہ ہی حالت پیدا ہونے والی ہے مگر امریکہ میں تو ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ دیہات میں شہریت پیدا ہوسکے امریکہ کی نسبت حال کا ایک مضمون نگار لکھتا ہے کہ شہری زندگی کے لئے بھی کاشتکاری ایک ضروری مشغلہ قرار پانا چاہیئے۔ اور تمام صنعت و حرفت کے کارخانے اور (۱۳)
بڑے بڑے ساہوکار جنھوں نے تجارت یا حرفت میں اپنا روپیہ لگا رکھا ہے اور کارخانوں کے منتظم اور کاریگر سب کیلئے یہ قاعدہ بن جاوے کہ وہ غلہ اور میوہ پیدا کرنے کا کام بھی اختیار کریں تاکہ اس طریقے سے کارخانوں کے مفلس مزدوروں کو موقع ملے کہ وہ شہر سے گاؤں اور گاؤں سے شہر میں آمد و رفت رکھ سکیں۔ اور اسطرح ایک وقت ایسا آجاوے کہ شہری اور دیہاتی کا فرق بالکل نہ رہے۔

اس مضمون نگار کے خیالات جنمیں امریکہ کی آیندہ زراعت کا نقشہ دکھایا گیا ہے آیا واقعی درست ہیں یا غلط اسکی نسبت ہم یہاں بحث نہیں کر سکتے۔ صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ یونان کی قدیم حالت وہ ہی تھی جسکا یہ امریکائی اسوقت امریکہ میں آرزومند ہے۔ اس قدیم زمانے میں (گو تاجر، دستکار و کاشتکار سب اپنا اپنا پیشہ کرتے تھے مگر) سب کی زندگی بالکل شہری تھی اور اسکا نتیجہ یہ تھا کہ ایک شہری ریاست کے کل باشندے مثل ایک کنبے کے آدمیوں کے تصور کئے جاسکتے تھے بلکہ در اصل ایسے ہی تصور کئے جاتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا تمام شہر والے حقیقت میں ایک ہی مورث کی اولاد سے تھے۔ شرفائے قوم تو اس کا جواب نفی میں دیتے تھے کیونکہ وہ ان مخصوص دیوتاؤں یا نصف دیوتاؤں اور نصف انسانوں کے تصور میں رہتے تھے جنکی اولاد سے وہ اپنے تئیں مانتے تھے لیکن باوجود اس انکار کے اگر وہ ایتھنز کے رہنے والے ہوتے تو انکو اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑتا کہ دیگر اہل شہر کی مثل وہ بھی زیوس اور اپولو کی اولاد سے ہیں جنمیں زیوس گھر کا اور اپولو آبائی ملک کا مالک مانا جاتا تھا۔ اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ وہ سب ایون اور ایتھینا کی ایک چہوردہ لڑکی کی نسل سے ہیں۔ یونان کے دیوتا اور دیبیاں یونان والوں کے ماں باپ اصلی معنی میں تھے۔ یوں تو

حیوانات کی ہر نوع اپنی نوع کے سب سے پہلے جوڑے سے پیدا ہوئی ہے مگر یونان کے لوگ اپنے سب سے پہلے مورث کی تلاش میں الٹے قدم چلکر ایسے قدیم زمانے میں جا پہنچ جاتے تھے جو یا تو شبہ دیوتاؤں اور سورماؤں کا زمانہ سمجھا جاتا تھا اور جہاں سے اونکے نزدیک آفرینش عالم کی ابتدا ہوتی تھی۔ چونکہ ہر شہر اپنے مخصوص دیوتا رکھتا تھا اسلیئے تمام شہر والے انہی کی اولاد سے سمجھے جاتے تھے اور اسلیئے گویا کل شہروالوں میں ایک صلبی رشتہ ہوتا تھا۔ (۱۴)

یہ امر کہ یونان کی ایک شہری ریاست کے تمام لوگ اپنے تئیں ایک ہی خاندان کا سمجھتے تھے اسبات سے اور ظاہر ہوتا تھا کہ شہر کا دیوان عام سب لوگوں کے مل بیٹھنے کی جگہ ہوتا تھا۔ اور یہ کہ باشندگان شہر کی تقسیم برادریوں میں کی جاتی تھی۔ اور نفع رسانی خلائق کیلیئے جسقدر انکی انجمنیں یا جماعتیں تھیں انھوں نے اسبات کو تسلیم کر رکھا تھا کہ انکے مورث ایک ہی تھے اور یہ مورث یا تو پورے دیوتا تھے یا نصف دیوتا اور نصف انسان تھے۔ ۵۰۸ ق م میں جس وقت کلائیس تھنیز نے نیابت وانتخاب کے اختیارات دینے کی غرض سے یونانیوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا تو اسبات کی ضرورت ہوئی کہ ہر ایسے گروہ کا کوئی مورث اعلیٰ بھی قائم کیا جاوے۔ چنانچہ اسکے لیئے پرنے سس کی کاہنہ سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے علم غیب کی مدد سے ایسے مورثوں کا نام بتائے۔ خلاصہ یہ کہ صحت نسب کا خیال تمام لوگوں میں بے حد قوی تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ اسی خیال کی وجہ سے پیریکلیز نے سنہ ۴۵۱ ق م میں یہ قاعدہ جاری کیا کہ ایتھنز کا شہری وہی شخص مانا جائیگا جسکے ماں باپ دونوں ایتھنزی ہوں اور ان دونوں کی وہ اولاد جائز ہو۔ یونان کے ہر شہر میں پشتہا پشت سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ یونان کے کل باشندے یک جدی ہیں۔ اور یہ خیال اسقدر قوی تھا کہ آجکل کے قواعد علم الانسان کے مطابق چہرے کے نقشے اور رنگ کو دیکھکر جو نسلی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں وہ سب ان پرانے خیالات کے سامنے گرد ہو جاتے۔ کسی شہر کی نسبی یا سیاسی شخصیت کو مٹانا قتل انسان کے برابر ناروا سمجھا جاتا تھا۔

یونانیوں کو جگہ کی محبت بھی بہت ہوتی تھی۔ اسکا اندازہ کرنے کے لیئے

ان عقائد کو دریافت کرنیکی ضرورت ہوتی ہے جو یونانیوں میں اپنے مُردوں کی عاقبت کی نسبت رائج تھے۔ پرانی دنیا میں جسطرح آجکل جاپان کا حال ہے یہ خیال ہر جگہ پھیلا ہوا تھا کہ بزرگانِ متوفی کی روحیں پس ماندگانِ زندہ کی خدمت کی محتاج رہتی ہیں جبتک میّت کے عزیز و اقارب کھانے پینے کی چیزیں قبر پر لاکر نہ رکھ جاویں یا روپیہ پیسہ یا ایسی (15 چیزیں جو روپے پیسے سے مول لیجاتی ہیں مردے کیساتھ دفن نہ کردیں یا قبر پر جہاں سب مٹی ڈالکر چلے جاتے ہیں کوئی چادر نہ چڑھائی جاوے اسوقت تک وہ پیارے عزیز جو دنیا سے چل بسے ہیں دوسری دنیا میں زندہ نہونگے اور اگر زندہ ہوئے بھی تو ہر چیز کی محتاجی و بائی زندگی کو دوبھر کردیگی۔ ٹائی بیریوس گریکس نے جسوقت تقسیم اراضی کے متعلق رومانیوں کے سامنے تقریر کی تو اسکے یہ الفاظ سب طرف گونج اٹھے تھے کہ "صحرا کے درندوں اور ہوا کے پرندوں کیلئے جگہ ہے کہ وہ چھپکر بیٹھیں۔ ایک کیلئے غار ہیں اور دوسرے کیلئے آشیانے۔ مگر جو لوگ ایطالیہ کیلئے لڑتے اور جانیں دیتے ہیں انکے لیئے کوئی جگہ نہیں۔ فقط ہوا اور روشنی ہے کہ ان نعمتوں سے جہانتک بن پڑے سیر ہو لیں۔ ہمارے فوجی افسر لڑائی کے وقت سپاہیوں کو بڑھاوے دیتے ہیں کہ ہاں اس زمین کیلئے لڑو جسمیں تمھارے باپ دادا دفن ہیں یا انکے مندر اور استھان موجود ہیں۔ لیکن یہ بڑھاوے دھوکے کی ٹٹیاں ہیں۔ آج ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرف بھی اشارہ کرکے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں ہمارے باپ دادا کے مندر و استھان تھے۔ یا کسی جگہ کا نشان دیکر نہیں بتا سکتا کہ یہ ہمارے بزرگوں کا ڈھیر ہے۔ پس بزرگوں کی خاک اور نشانیوں کیلئے تم نہیں لڑتے بلکہ دوسروں کی دولت اور عیش کیلئے اپنی جانیں گنواتے ہو۔ کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ تم تمام دنیا کے مالک ہو مگر دنیا تو بڑی چیز ہے ایک مٹی کا ڈھیلا بھی تو ایسا نہیں جسکو تم اپنا کہہ سکو۔" پرانے وقتوں کا مورخ پلوٹارک گو اسکی تحریر آجکل کی سی معلوم ہو مگر اسمیں ایک درد ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی تمدن قدیم کا شیدائی ہے جسکے بیان کیلئے قلم اٹھایا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ جنگ سلامس کے بعد ایتھنز والے سوچتے تھے کہ فتح تو بیشک ہوئی مگر بڑے نقصان کے ساتھ ہوئی اور نقصان یہ ہوا کہ باپ دادا کی چھتریاں اور مندر

غیروں کے ہاتھ میں چھوڑنے پڑے۔ ایتھنز میں ایک قانون تھا کہ جو شخص ایسی زمین کی خبر نہ رکھیگا جہاں اسکے مُردے دفن ہیں تو وہ مجسٹریٹی کا عہدہ پانے سے محروم سمجھا جائیگا۔ پس ہر ایک یونانی شہر کے باشندے اپنے باپ دادا کی زمین کو خاص طور پر متبرک مانتے تھے۔ خود اسکو چھوڑ کر کہیں چلے جاویں مگر دشمن کے ہاتھ میں اسکو چھوڑنا کسی طرح درست نہ جانتے تھے۔ اگر کسی خاندان میں صرف ایک
متنفس رہ گیا ہے تو اینیاس کی مثل اس سے بھی توقع کیجاتی تھی کہ جہاں کہیں (۱۶)
جائے گھر کے دیوتاؤں اور مورتیوں کو اپنے ساتھ ساتھ لیتا جائے۔ قصہ مشہور ہے کہ جب رومیولس وطن سے اٹھا کہ روما کا شہر بسائے تو اس کے ہمراہی وطن کی مٹی ساتھ لیتے گئے اور جہاں نیا شہر آباد کیا وہاں ایک گڑھا کھود کر اس مٹی کو گڑھے میں ڈالدیا۔ غالباً اسی قصے کی بنیاد پر رومانیوں نے زمانۂ مابعد میں اسی طریقے کو اپنا ایک رواج بنالیا۔ یہ طریقہ کسی شدید جذبۂ محبت کا نتیجہ نہ تھا جیسا کہ اسکاٹ لینڈ کی ایک لڑکی کا قصہ مشہور ہے کہ جب وطن چھوڑ کر امریکہ جانے لگی تو کچھ اسباب ساتھ نہ لیا۔ فقط ماں کی قبر سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر سفر کیلئے تیار ہوگئی۔ بلکہ یہ طریقہ اس پر اثر خیال کا نتیجہ تھا جو حال میں جنرل نوگی سے ظاہر ہوا کہ جب تلک اپنے بزرگوں کی ارواح کی آسائش کیلئے خاطر خواہ بندوبست نہ کرلیا خودکشی نہ کی۔ غرض اسطور پر نئی بستیاں بسانے والے اپنے بزرگان متوفی کو بھی اپنے ساتھ نئی جگہ بسا لیتے تھے۔ اور اسطرح یونانیوں اور رومانیوں کیلئے خاص وجہ تھی کہ مقام کے اعتبار سے بھی ان میں عصبیت اور قومیت کا جوش موجزن رہے۔ اور جس طرح عبرانی عیسائی ارض مقدس میں آباد تھے کہ جہاں خود بستے تھے وہیں انکے دین کے شاہد بھی اپنے اپنے مزاروں میں آسودہ تھے اسیطرح یونانی بھی جہاں خود آباد ہوتے تھے وہیں انکے بزرگوں کی مٹی بھی موجود ہوتی تھی۔

اس مضمون میں جہانتک معاشیات سے بحث تھی وہ تو یہاں ختم ہوئی۔ یعنی کسی ایک مقام پر ملکر قبضہ وسکونت رکھنے سے جو کچھ اثر ایک شہری ریاست کے لوگوں پر اسکے نفع وسلامتی یا انداز طبیعت پیدا کرنے کیلئے ہوسکتا تھا

اسکی کیفیت پہلے بیان کردی ۔ اور ان معتقدات کو بھی بیان کر دیا جو ایک شہری ریاست کے لوگوں میں اپنے نسب کی حقیقت اور ابتدا کی نسبت اور مرنے کے بعد عاقبت کے بارے میں تھے اور ان ہی معتقدات میں اس چیز کو بھی دکھا دیا جسنے شہری ریاستوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھا ۔ مگر ابھی ہمکو شہروں کے ان قواعد و قوانین اور اصول سیاسیت سے بحث کرنی ہے جنھوں نے یونانی قوم کو اپنے مرکز سے باہر کی طرف مائل کیا ۔

یونان میں ہر شہر کے قوانین و رواج جدا جدا ہوتے تھے ۔ یہ رواج و قوانین جیسے کہ ہمارے ملکوں کا حال ہے محض خشک و بے لطف تجردات عقلی ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ فی الحقیقت ایک حقیقی و عملی بلکہ قریب قریب زندہ و ذاتی قوت ہوتے تھے جو اپنے ماننے والوں کو ایک مقررہ سانچے میں ڈھالتے رہتے تھے۔ (۱۷)
ہر ایک شہر کے باشندوں میں ایک عام مشابہت ایسی ہی ہوتی تھی جیسے کہ ایک ہی خاندان کے لوگوں میں نظر آئے ۔ اور مشابہت کیوجہ یہ ہوتی تھی کہ ہر ایک شہر کی معاشرت اور سیاسی طریقوں نے سب لوگوں پر ایک ہی سا نقش پیدا کیا تھا یہی سبب تھا کہ ہر شہر کی خصوصیات دوسرے شہر سے جدا ہوتی تھیں اور یہ خصوصیات ایسی واضح ہوتی تھیں کہ انکی تعریف و تحدید صرف اسیطرح ممکن نہ ہوتی تھی کہ اسکے تاریخی حالات بیان کر دیئے جاویں بلکہ انکے طبعی اور عقلی اوصاف اور وہ چیزیں جن سے انکے قلب کو جنبش ہوتی تھی دوسروں سے ایسی متفرق تھیں کہ ان کی بناپر انکی تعریف علٰحدہ علٰحدہ لکھنی آسان ہوجاتی تھی ۔ اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ یونان کے اہل قلم جہاں اپنے مشاہیر کی سیرت لکھتے تھے وہاں اپنے شہروں کی سوانحعمری بھی لکھ ڈالتے تھے ۔ جسکی تقلید ہم سے بھی ابھی تک نہیں ہوئی ہے ۔ حکمائے یونان غور کرتے تھے کہ موسم اور موسمی ہوائیں ۔ مرجہ کاروبار ۔ سمندر اور ارتفاع آفتاب کے اعتبار سے شہروں کے موقع اور کیفیت اور ان شہروں کے لوگوں کا غیر ملک والوں سے ارتباط اور ایسے ہی اور وسائل شہروں کے خصائل و عادات پر کیا اثر ڈالتے ہیں ۔ اس قسم کی تحقیقات کے علاوہ شہروں کی ترکیب سیاسی میں جو خلل یا امراض پیدا ہوتے ہیں انکا علاج بھی

تجویز کرتے تھے ۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو نہایت بے تکلفی سے بہت ہی قلیل و کمزور واقعات کی بنا پر کسی قوم کے ملّی امراض کی تشخیص میں مصروف ہو کر قوموں کے حسن و قبح کی فہرست بندی کرنے بیٹھ جاتے ہیں مگر ان لوگوں کو سوائے الفاظ کی بھرتی کے اور کچھ نہیں آتا ۔

شہر اور قوم ان دونوں کو شامل کر کے جو ایک مفہوم ہم میں سے ایسے لوگوں کے ذہن میں آجکل موجود ہے جو شہر سے باہر دیہات میں رہتے ہیں اس سے کہیں زیادہ مفہوم صرف شہر کا یونانیوں کے ذہن میں تھا ۔ ہر ایک شہر اس شہر کے رہنے والوں کیلئے خصوصًا اور تمام قوم کیلئے عمومًا باعث فخر ہوتا تھا جو سیاسی مسائل ان شہروں کو حل کرنے پڑتے تھے وہ صرف ایسے ہی نہ ہوتے تھے جنہیں آجکل کے شہری مشکل سے دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں ۔ پولیس ۔ تعلیم ۔ تعمیرات عزل و نصب کے معاملات ۔ تفریق نسل کی بنیاد پر آپس کی خصومتیں ۔ فرقوں کے اختلافات ۔ معاملات مذہب میں ایک فریق کی یہ کوشش کہ دوسرے پر غالب رہے ۔ ہمسایہ شہروں کے ساتھ تجارت و سیاسیات میں حریفانہ سرگرمی ۔ تمدن و تعلیم میں دوسروں پر فضیلت حاصل کرنیکا شوق ۔ یہ سب وہ کشمکشیں ہیں جو (18)
تمام شہروں میں ہر زمانہ اور ملک میں رہی ہیں ۔ لیکن سیاسیات میں اعلیٰ درجہ کی متانت و گراں پائیگی حقیقت میں یونانیوں ہی کا حصّہ تھی ۔ ہر شہر کو اپنا ایک خاص طریقۂ عمل باہر کی ریاستوں سے رکھنا پڑتا تھا ۔ اپنی فوج کی ترتیب و تقسیم خود کرنی ہوتی تھی ۔ مذہب کے متعلق مندر اور مکانات بنوانے پڑتے تھے ۔ دیوتاؤں کی تعظیم اور شہرت کیلئے تہوار اور کھیل تماشوں کے جلسے کرنے پڑتے تھے مشاعرے ہوتے تھے جن میں پُر درد افسانے ڈراما کی صورت میں سنائے جاتے تھے ۔ پھر یہ تھا کہ بحر متوسط کے اردگرد کی دنیا بساط شطرنج کیطرح ہر وقت سامنے بچھی رہتی تھی ۔ ہر مہرے کی حرکت سب کیلئے کچھ نہ کچھ معنی رکھتی تھی کسی دن کوئی ریاست یہ تصفیہ کرتی تھی کہ ہمسایہ ریاست سے جس سرحدی زمین پر مدت سے جھگڑا چلا آتا ہے اسپر قبضہ کر لیا جاوے ۔ کسی دن یہ فیصلہ ہوتا تھا کہ دشمن کے کسی لشکر جرار سے مقابلہ کیلئے ریاستوں میں اتحاد پیدا کیا جاوے ۔

کسی موقع پر جمہور سے رائے پوچھی جاتی تھی کہ ایک نئے دیوتا یا دیبی کی پرستش اختیار کیجاوے یا نہیں۔ یہ بھی ایک بڑا معرکہ ہوتا تھا گویا ایک نیا معبود عبادت کیلئے نامزد کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مسائل پر غور کرنا شہر والوں کیلئے کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ ایسے ہی معاملات انکے باپ دادا بھی اپنے دفتروں میں فیصل کیا کرتے تھے۔ پرانے زمانے میں جو بڑے بڑے کام اپنی قوم کے بزرگوں نے کئے تھے انکی یادگاریں پیتل اور سنگ مرمر کی بنا بنا کر نصب کرتے تھے۔ اور ہر سال کوئی نہ کوئی تہوار کرکے ان بزرگوں کو یاد کیا جاتا تھا۔ غرض قصص و واقعات نے مل جلکر بڑی ہمت افزا حکایات پیدا کر دی تھیں جنہیں گذری ہوئی نسلوں کی بڑی بڑی امیدیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے خیالات شامل تھے۔ اہل سلف کی باتوں کو ان ہی حکایات میں سنکر موجودہ لوگ بھی ہر خطرے و مشکل کو بڑے صبر و استقلال سے جھیلتے تھے۔ کسی کی مشہور نصیحت ہے کہ "اپنی زمین کا عشق دل میں رکھو۔ اور یہ عشق وہ ہو جسکو افسانۂ ماضی سے بڑی دور کی منزل طے کرکے حاصل کیا ہو"۔ مگر عہد قدیم میں یونان کے شہروں کو اس نصیحت کی ضرورت نہ تھی۔ اگر کچھ کمی تھی تو یہ تھی کہ جس زمین سے انکو عشق تھا اسکا اطلاق کل ملک یونان پر نہ تھا بلکہ ہر ایک کو اپنے اپنے شہر کی زمین سے الفت تھی۔

موجودہ ممالک یورپ کا قومی تعصب تو پھر بھی غیر کی مداخلت کارروادار ہوتا ہے مگر یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی کسی قسم کی مداخلت گوارا نہ کرسکتی تھیں اور یہی وہ ریاستیں تھیں جنسے اسپارٹا اور ایتھنز کو شہنشاہی قائم کرنے میں واسطہ پڑا۔ (۱۹)

اگر آپ یونان کے اس فضول نقشے سے جسمیں قوموں کی تقسیم دکھا کر ہر ایک قوم کی سکونت بتائی ہے قطع نظر کرکے محض ایسے نقشے پر غور کرینگے جسمیں صرف ریاستوں کے نام اور انکی حدود دکھائی گئی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسپارٹا اور ایتھنز کیلئے ایسے وقت کا آنا جس میں وہ سب پر فائق ہو جائیں شروع ہی سے ظاہر تھا۔ یعنی اگر کوئی اور چیز نہیں تو محض ان دونوں ریاستوں کی وسعت اور انکے عمدہ وسائل ایسے تھے جنسے انکا ایک دن ترقی کرکے سب سے بڑھ جانا ضروری تھا۔ اسپارٹا اور ایتھنز خود شہری ریاستیں تھیں مگر طاقت میں کسی سے کم نہ تھیں اور اسی بل پر کسی بات کو اس سے بڑھکر موجب ذلت نہ سمجھتی تھیں کہ کوئی غیر ریاست

یا غیر قوم ان پر حکومت کرے۔ پس جب خود انکی یہ حالت تھی تو پھر وہ شہنشاہی کا منصوبہ کیونکر باندھ سکتی تھیں جبیں دوسری ریاستوں پر حکومت کرنا ضروریات سے تھا۔ انکے برخود نمی پسندی بر دیگراں ہم مپسند کا مضمون تھا۔ پھر یہ حکومت اقوام غیر پر چلانے کیلئے ہی نہ تھی بلکہ اسمیں خاص اپنے ہمقوم یونانیوں سے واسطہ ہوتا تھا اور ایسی صورت میں وہ اپنے مقصد کو پہنچنے کیلئے یہ اصول کہ ادنیٰ قومیں ہمیشہ ایک سیاسی رہنما کی محتاج رہا کرتی ہیں پیش نہ کر سکتے تھے۔

اسپارٹا کی وسعت عملداری کا اندازہ کرنے میں ہم نے اہل اسپارٹا کی انفرادی زمینوں کو شامل نہیں کیا۔ ہے جن میں انکے ملازم یا ھیلٹ قوم کے لوگ انکے نام سے کھیتی کرتے تھے بلکہ وہ کم قیمت وسیع قطعات بھی شامل کر لیے ہیں جن کے لوگ پیریسی قوم کے تھے۔ کیونکہ پریسیوں کے گاؤں اور قصبات حقیقت میں اسپارٹا والوں کے انتظامی حلقوں (میونیسپلٹیون) میں آجاتے تھے۔ ان تمام قطعات کی پیداوار و آمدنی سے اسپارٹا نے پیلوپونے سس کے لوگوں کو متحد کرکے ان پر (۲۰)
ایک شواسی برس (۵۵۰ - ۳۷۰ ق م) تک سرداری کی اور اسطرح پیلوپونیسیوں کی متحدہ طاقت سے ۴۰۵ ق م میں ایتھنز کی شہنشاہی کو غارت کرکے اپنی سرداری و سرگروہی کے حلقۂ اثر کو ایسی وسعت دی کہ تمام یونان اسمیں آگیا۔ اور اسکے بعد اسپارٹا کا پیلوپونیسی لیگ (مشارکت) تمام یونان کے عام اتحاد کی جان ہوگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس لیگ میں اسپارٹا کو کیا درجہ حاصل تھا۔

اس لیگ میں اسپارٹا کے قانونی حقوق تمام تر ایک معاہدۂ مشارکت پر مبنی تھے جو اسنے ہر ایک شہر سے جو اس مشارکت (لیگ) میں شامل تھا کر لیا تھا۔ لیکن اسمیں شبہ نہیں کہ اکثر صورتوں میں پہلے تو اس قسم کا معاہدہ اسپارٹا نے فریق ثانی سے بجبر لکھوا لیا اور پھر پیلوپونیسی اور دیگر حلیف ریاستہائے یونان کے اندرونی معاملات میں ایسی دست اندازی کی جسکی اجازت عہدنامہ کی شرائط میں موجود نہ تھی۔ گو اسپارٹا کا یہ طریقہ کیسا ہی مذموم معلوم ہو لیکن جسوقت تک اس دست اندازی کی اصلی غرض پوری ہوتی رہی اسپارٹا کا کوئی قصور باضابطہ طور پر ثابت نہو سکتا تھا۔ اصلی غرض اس دست اندازی کی یہ تھی کہ شروع میں تو

غیر آئینی حکومت (ٹیرینی) کا اور بعد کو عمومیت (ڈیموکریسی) کا مقابلہ کرکے ان حلیف ریاستوں میں ایک حکومت شرفا، (اریسٹوکریسی) جاری کیجاوے۔ اور جاری کرنے کے بعد اسکو قائم بھی رکھا جاوے۔ چونکہ شرفا، کی تعداد ہمیشہ قلیل ہوتی تھی اسلیئے انکو اپنی حفاظت کیلیئے اسپارٹا سے دست اندازی کی درخواست کرنی پڑتی تھی۔ پس جب کسی حلیف ریاست میں یہ شرفا، نظم حکومت پر قادر نہ رہتے تو صرف اسی حالت میں اسپارٹا کی دست اندازی کو یہ حلیف ریاست ایسا فعل نہ سمجھ سکتی تھی جو ایک دوست کا ہونا چاہیئے۔ جسوقت لاریسا کی شہری ریاست سے یونانی مشارکت (ہیلینی لیگ) میں شریک ہونے کی تحریک کیگئی تو ایک یونانی مضمون
نگار نے یہ الفاظ لکھے "شاید کوئی شخص بدلائل یہ اعتراض پیش کرے کہ اسپارٹا (۲۱)
تو ہر جگہ ایک حکومت عدیدی (اولیگارکی) قائم کر دیتا ہے۔ اسکا یہ اعتراض بالکل درست ہوگا۔ لیکن یہ عدیدی حکومت وہ ہے جسکو ہم نے مدتوں بڑی آرزو و کیساتھ طلب کیا تھا۔ اور اگر کبھی وہ نصیب بھی ہوئی تھی تو تھوڑے دن کے بعد جاتی رہی تھی۔ یوں تو اسوقت بھی ہم میں اسی قسم کی حکومت موجود ہے۔ لیکن ذرا اوسکا مقابلہ اوس طرز عدیدی سے کیجیئے جسکو اسپارٹا پسند کرتا ہے۔ اسپارٹا کی عملداری میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا شہر بھی ایسا ہے جسمیں آبادی کا تہائی حصہ سیاسی معاملات میں حصہ نہ رکھتا ہو۔ رہا باقی دو تہائی حصہ تو یہ کوئی اسپارٹا والوں کا قصور نہیں ہے بلکہ اس دو تہائی حصۂ آبادی کی کم نصیبی ہے کہ اسکے پاس نہ ہتیار ہیں اور نہ سیاسی مناصب پر کام کرنیکی قابلیت جسکی وجہ سے وہ ملکی معاملات میں رائے دینے کے حق سے محروم ہے۔ لیکن سیاسیات سے اس دو تہائی حصے کو علحدگی اسوقت تک ہے جب تک کہ وہ سیاسی ناقابلیت رکھتا ہے۔ اب خود اپنی حالت سے مقابلہ کرکے غور کیجیئے۔ میرا تو یہ یقین ہے کہ اگر ہم اپنے دیوتاؤں سے بھی کوئی خاص طرز حکومت مانگینگے تو اس سے بہتر طرز کے خواستگار نہیں ہوسکتے جو اسپارٹا نے اپنی حلیف ریاستوں کیلیئے تجویز و پسند کیا ہے"۔ اعتدال پسند لوگ جو اس مضمون نگار کے ہم خیال تھے حلیف شہروں میں اسپارٹا کی فوجوں کو جو اُس نے شہروں میں مقیم کر دی تھیں حکومت میں مخل نہ سمجھتے تھے۔ لاریسا میں خود حکام وقت

اس قسم کی فوجوں کو اسپارٹا سے طلب کیا تھا۔ ان فوجوں کے سردار جنکے سر کے بال لمبے ہوتے تھے با اختیار خود کوئی حکم نہ دیتے تھے بلکہ حکام مقامی سے حکم لیکر اُسکی تعمیل کرتے تھے۔ اُنکی موجودگی سے حکومت کی ترکیب میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ نہ کوئی قانون ٹوٹتا تھا اور نہ ریاست کے مال پر کسی کا غاصبانہ قبضہ ہوتا تھا لیکن آبادی کا وہ دو تہائی حصّہ جو معاملات نظم ونسق میں رائے دینے سے محروم رکھا گیا تھا ان باتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر قانون بین الاقوام کا یہ اصول نہایت درست ہے کہ جب ایک ریاست کو دوسری ریاست سے گفتگو کرنی ہوتی ہے تو وہ اپنا مخاطب جمہور کے اس با اختیار حصّہ کو بناتی ہے جسکے ہاتھ میں نظم حکومت ہوتا ہے نہ کہ اُس حصّہ کو جو اس نظم حکومت کا مخالف ہو۔ مگر یونان کی جو کچھ حالت اسوقت تھی اسمیں ایسے (۲۲) طرز حکومت سے جسمیں جمہور کا ایک تہائی حصّہ با حکومت ہو اور دو تہائی حصّہ اختیارات حکومت سے محروم ہو یہ خراب نتیجہ نکلتا تھا کہ ایسی ریاست میں ہمیشہ خانہ جنگی رہتی تھی۔ لاریسا کا مضمون نگار جسکی عبارت اوپر نقل ہو چکی ہے ایک جگہ لکھتا ہے کہ "آفات ارضی میں لڑائی سے بدتر کوئی آفت نہیں۔ اور دنیا کی نعمتوں میں امن سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ مگر خانہ جنگی (ستاسیس) لڑائی کی سب سے بدتر شکل ہے۔ تکلیف ونقصان کے لحاظ سے خانہ جنگی کو باہر کی لڑائی سے وہی نسبت ہے جو لڑائی کو امن سے۔" خانہ جنگی کی اشتعالک اکثر ایتھنز کی طرف سے ہوتی تھی۔ ایتھنز بحری طاقت میں ایسا ہی لاجواب تھا۔ جیسا اسپارٹا بری طاقت میں اور ہمیشہ جمہور کے اس دو تہائی حصّے کی مدد کیلیئے اپنا ہاتھ بڑھائے رکھتا تھا جسکو اسپارٹا دبانا چاہتا تھا۔ علاوہ اسکے ایتھنز بھی ایک سیاسی اصول کا موجد ومدعی تھا۔ یہ اصول کل عموم کی سیاست مساویہ کا تھا۔ یعنی ایک ریاست کے کل لوگوں کو حکومت میں برابر کا شریک رہنا چاہیئے۔ پس جب کبھی ایتھنز کو موقع ملا کہ اس اصول کے ماننے والوں کو کسی ریاست کی حکومت دیدے یا ایسے عموم کو جو اسی اصول پر کسی ریاست میں حکومت کرتا ہے اپنے قابو میں لے آئے تو پھر ایسی ریاست میں ایتھنز کی دست اندازی ضابطہ کی رو سے بالکل جائز تھی یا کم از کم جائز تصور کیجا سکتی تھی مگر ذمہ دار ہر صورت میں وہی عموم رہتا تھا جو حکومت کا انتظام کرتا تھا نہ کہ ایتھنز۔

جسوقت قومی سرداری کیلیے اسپارٹا اور اتھنز میں دو مرتبہ تصادم شروع ہوا تھیں فریقین
نے پانچویں صدی قبل مسیح کا آخری تہائی حصہ گنوا دیا تو لڑائی کی شکل یہ ہوگئی کہ دونوں فریقوں
کی ہر ایک حلیف ریاست میں یہ تماشہ جنگی ہونے لگی۔ ہر ریاست میں ایک تہائی اور دو تہائی
عموم کے سردار آپسمیں دست و گریباں ہوگئے۔ مورخ تھیوسی ڈائڈیز اپنی کتاب جنگ
پیلوپونیس کی تاریخ میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ "یہ دونوں فریق بظاہر بڑے بڑے ناموں (۲۳)
سے مشہور ہوتے تھے۔ ان میں ایک تو اسکا قائل تھا کہ کل عموم کو نظم حکومت میں مساوی
اختیارات ہونے چاہئیں۔ دوسرا فریق اسکا قائل تھا کہ حکومت شرفاء (اریسٹوکریسی)
حکومت کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ لڑائی بظاہر عموم کی فائدہ رسانی کی نیت سے
کیجاتی تھی۔ لیکن یہ نیت فقط دکھانے کی ہوتی تھی ایک فریق دوسرے فریق کو مغلوب
کرنیکی کوشش میں نہایت سخت جرائم کا مرتکب ہوتا تھا۔ اور ان جرائم سے کہیں زیادہ
غارت کن وہ حرکتیں ہوتی تھیں جو انتقام کشی میں کیجاتی تھیں۔ انتقام لینے میں انتہا سے
گذر جاتے تھے اور کسی فریق کو بھی خیال نہ تھا کہ آخر شدائد کی بھی ایک حد ہوتی ہے جسکے
آگے انصاف اور مخلوق خدا کی ضرورتیں جور و جفا کا ہاتھ روک دیتی ہیں۔ لیکن دونوں
فریقوں کی یہ حالت ہو جاتی تھی کہ جسوقت جس سے جو کچھ بن پڑا اسی کو قانون سمجھ لیا۔
اور فریقانہ جوش کی حالت بیقراری میں سکون پیدا کرنے کیلئے یا تو اپنے دشمنوں کو
ایسی سزائیں دیں جنسے انصاف کا خون ہوا۔ یا کل اختیارات اپنے دست ناروا
میں لیکر جو چاہا سو کیا۔ کسی فریق کو اپنے دین و ایمان کا مطلق خیال نہ رہا تھا۔ کوئی
حیلہ جس سے کیسا ہی کوئی بڑا مقصد پورا ہوتا ہو موجب تعریف و تحسین سمجھا جاتا تھا
شہروں میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو کسی فریق کا ساتھ نہ دیتے تھے مگر وہ دونوں
کے مورد عتاب رہتے تھے۔ یا تو انکی کنارہ کشی اور علیحدگی پر انسے خصومت رکھی
جاتی تھی یا اسپر حسد کیا جاتا تھا کہ اور تو سب غارت ہوگئے یہ کیسے زندہ بچ گئے۔ پس یہ
سمجھئے کہ ان گھر کی لڑائیوں نے یونان میں ہر قسم کی بداعمالی و زیاں کاری پیدا
کردی تھی۔"

اسپارٹا نے اپنی حکومت میں تعلیم و تربیت کا محض ایک مقصد رکھا تھا۔
یعنی کسی ایک پیشہ میں اعلیٰ درجے کی تربیت سب کو ملے۔ اسکا بہترین نتیجہ یہ نکلا کہ

اسپارٹا میں ایسے عالم و فاضل پیدا نہیں ہوئے جو حکومت کے رازہائے سربستہ کو ایسا بے نقاب کر جاتے کہ آنیوالی نسلوں پر اسکے تمام عیوب و نقائص بالکل روشن ہو جاتے پس جسطرح مورخ تھیوسی ڈائڈیز نے ایتھنز کا پردہ فاش کیا اسپارٹا کے حق میں کوئی ایسا گھر کا بھیدی پیدا نہیں ہوا۔ یہاں موقع ہے کہ حکومت ایتھنز کی نیت و ایمان پر جس زمانے میں کہ اسکو سب سے زیادہ عروج تھا غور کیا جاوے۔ تھیوسی ڈائڈیز کے بیان سے ظاہر ہے کہ کلیون (Cleon) اور اور لوگ جنھوں نے انصاف کا پہلو اختیار کرنے میں بہت ہی سختی سے کام لیا تھا اس پہلو کو بچا کر کہ ایتھنز کی شہنشاہی قانونا جائز تھی یا ناجائز اس امر کے ظاہر کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ یہ شہنشاہی ایک غیر آئینی حکومت تھی جسکے لیئے کوئی اخلاقی وجہ موجود نہ تھی۔ اور غیرت قومی کا (۲۴)
تقاضہ یہی تھا کہ اسکو قطعی فنا کر دے۔ سنہ ۴۲۲ ق م میں کلیون نے ایک موقع پر ایتھنز کے لوگوں سے کہا کہ "ہماری شہنشاہی ایک شخصی حکومت ہے اور وہ ایسی ریاستوں پر چلائی جاتی ہے جو اسکو قبول کرنے پر راضی نہیں۔ اگر یہ ریاستیں تمھاری حکم برداری کرتی ہیں تو یہ حکم برداری اسبات کا معاوضہ نہیں ہے کہ تم نے اپنا نقصان اٹھا کر انکے نفع کیلیئے کوئی کام کیا ہے۔ بلکہ انکی اطاعت کیوجہ محض یہ ہے کہ تم خواہی نہ خواہی انکے آقا و مالک بن بیٹھے ہو۔ انکو تم سے ہرگز کسی قسم کی موانست نہیں ہے۔ اور تم بھی صرف اپنی طاقت کے بھروسے پر ان پر حکومت کرتے ہو۔

جن ریاستوں نے اسپارٹا یا ایتھنز سے اتحاد و محالفہ کیا تھا ان میں ایک ریاست بھی ایسی نہ تھی جو اسپارٹا یا ایتھنز کی ماتحتی کو اپنے حق میں ایک بلا نہ سمجھتی ہو۔ گو کم درجے کی بلا سہی۔ کیونکہ سب سے بڑی بلا گھر میں دشمنی کا رہنا سمجھا جاتا تھا۔ بہرکیف جس غیر آئینی حکومت کیطرف تھیوسی ڈائڈیز نے اشارہ کیا ہے وہ ان ریاستوں کی مرضی سے قائم نہیں ہوئی تھی جن پر حکومت چلائی جاتی تھی۔ ایتھنز کی حلیف ریاستیں خاص شرائط کیساتھ اور خاص مقصد کیلیئے جو ان شرائط میں مذکور تھا محالفہ میں شریک ہوئی تھیں۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ سلطنت ایران کے حملوں سے پناہ ملے۔ لیکن ان شرائط کی تحریر میں ایک بڑی فروگذاشت ان ریاستوں سے ہوئی تھی اور وہ یہ تھی کہ کوئی شرط جس سے معلوم ہو کہ یہ محالفہ کس مدت کیلیئے کیا گیا ہے

بیان نہ تھی۔ اس بنا پر ایتھنز نے ان ریاستوں کے اس حق کو کہ وہ محالفہ سے علیحدہ ہوسکتی ہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جسوقت بعض حلیف ریاستوں نے باوجود شرائط کی اس خامی کے علیحدگی چاہی تو ایتھنز کو محالفہ قائم رکھنے کیلیئے ایک جائز حیلہ اس معاملہ میں جبر و زبردستی کا مل گیا۔ اور ایسی ریاستوں کی مدد سے جو محالفہ پر قائم رہی تھیں اور ان جنگی جہازوں کے بل پر جو ہر وقت لڑائی کیلیئے تیار رکھے جاتے تھے اور جنکا بیڑہ ایتھنز نے تمام حلیف ریاستوں کے چندہ سے تیار کرایا تھا ان ریاستوں سے جو علیحدگی چاہتی تھیں ایسی شرائط لکھوالیں جو ایک فاتح اپنے مفتوح سے زبردستی
لکھوالیتا ہے۔ غرض اس طریقے پر ایک نیا عہد نامہ تیار ہوا جسمیں آئندہ کے لیئے (۲۵)
وہی پابندیاں تھیں جو سابق کے شرائط نامے میں رہ چکی تھیں۔ اگر بہ نظر وسیع دیکھا جاوے تو کہہ سکتے ہیں کہ یونان قدیمہ کی شہری ریاستوں پر شہنشاہی قائم کرنا قانوناً غیر ممکن تھا۔ کیونکہ جس چیز کو آجکل کے یا سابق کے لوگ واقعات پر نظر کرکے شہنشاہی کہتے تھے وہ در اصل عہد ناموں اور شرائط ناموں کا ایک پشتارہ ہوتا تھا۔ اس شہنشاہی کی وضع و ساخت ہی ظاہر کرتی تھی کہ اسمیں محض ایک ہی ریاست کے مالک اور حاکم سے نہیں بلکہ بہت سی ریاستوں کے حاکموں اور مالکوں سے معاملہ اور واسطہ پڑیگا۔ بہرکیف اس شہنشاہی کی ترکیب کا اصل سبب یا پہلا تخم ایک شہری ہوتا تھا جسکو ایک سیاسی جسم مفرد کہنا زیبا ہوگا۔ اگر زیادہ احتیاط کی نظر سے دیکھا جائے تو ایتھنز اور اسپارٹا کی حکومت دوسری ریاستوں پر درحقیقت کوئی شہنشاہی نہ تھی بلکہ محض ایک قسم کی پیشوائی و سرگروہی تھی۔ اور اسکو بھی حالات وقت کی ضرورتوں نے پیدا کیا تھا۔ اور یہ ضروریات بھی معمولی و مستقل نہ تھیں بلکہ غیر معمولی اور عارضی تھیں۔

لیکن تجربہ سے ثابت ہوگیا تھا کہ جن حالات میں شہنشاہی کا قائم کرنا ایک سیاسی ضرورت سمجھا گیا ہو وہ حالات دنیا میں شاذ نہیں ہوا کرتے بلکہ ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ۴۰۳ ق م میں جب ایتھنز کی قوت ٹوٹ گئی اور تھسالیہ سے مقدونیہ والوں اور آئی اونیا سے ایران والوں نے حملے شروع کئے تو ان حملوں سے جان بچانے کیلیئے یونان کو بھی لڑنا ضروری ہوا۔ اور اس ہنگامہ میں اسپارٹا نے اسبات کو جائز سمجھ لیا کہ دوسری ریاستوں پر جو درجہ سرداری و سرگروہی (ہیجی مونی) کا اسکو

حاصل ہو چکا ہے اسکو قائم رکھنے کیلئے تلوار سے کام لے۔ لیکن جب ۳۸۶ ق م میں
دولتِ ایران سے صلح ہو گئی جو "شاہی صلح" یا "انتل سیداس کی صلح" کے نام سے
مشہور ہے تو پھر یہ صورت ممکن نہ رہی کہ کسی قومی غرضِ عام کو حیلہ بنایا جاتا اور ایک ریاست
دوسری ریاستوں کی سرگروہ بنکر رفتہ رفتہ ان پر ایک شخصی حکومت قائم کر لیتی۔ بہر کیف
اسپارٹا کو جو درجہ سرگروہی (ہیجی مونی) کا حاصل ہو چکا تھا اسکو چھوڑتے بن نہ پڑا
اور اب اسکو قائم رکھنا اس بنا پر ضروری بتایا گیا کہ ریاستہائے حلیف اپنی اپنی حکومت
میں آزاد رہیں اور کوئی انکو اپنا ماتحت بنا کر ان پر شہنشاہی قائم نہ کر سکے۔ اس مقصد کے
حاصل کرنے کیلئے یہاں تک نوبت پہنچی کہ کبھی اسپارٹا نے اور کبھی تھیبس نے جب اُن کی
سرگروہی کا وقت آیا سرگروہی برقرار رکھنے کیلئے اور کسی سے بھی نہیں خاص دولت
ایران سے مدد لی۔ اگر حقیقت میں اس بات کے روکنے کیلئے کہ شہنشاہی قائم ہو
(۲۶) ایک دوسری شہنشاہی کی مدد اور اسکے ساتھ قومی کم ظرفی ہی کی ضرورت تھی تو یہ
حالت نہایت ہی زبون وخراب تھی۔ اور اس خرابی نے ثابت کر دیا تھا کہ ایک ریاست
کا دوسری ریاستوں پر سرگروہ بننے کا طریقہ سخت مہمل ولغو تھا۔ چنانچہ یونان کے
مصلحانِ قوم اور مدبرانِ سیاست نے اس خامی کو جلد محسوس کر لیا۔

قوم کے بڑے لوگوں نے اس خرابی کی اصلاح کرنی چاہی۔ چنانچہ آگے
کے ایک باب میں ہم بیان کرینگے کہ حکیم افلاطون وارسطاطالیس نے اس بارے
میں کیسی سرگرم کوششیں کیں۔ یہ دونوں حکیم تعلیم کی قوت اور عمدہ قوانین وضع
کرنے کے مفید اثروں کے اس درجہ قائل تھے کہ سوائے ان دو چیزوں کے
اور کوئی بات انکی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ انھوں نے اپنا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ کسطرح
شہری ریاستوں کے لوگوں کو ہر وقت کی جفاکشی ومحنت سے راحت وآرام کیطرف
اور ہر وقت کی جنگ وجدال سے صلح وآشتی کی طرف متوجہ کریں۔ زر وزمین کی
حرص انکے دل سے بالکل نکال دیں۔ اور آبادی کی تعداد میں بھی جو قدرتی زیادتی
ہو رہی ہے اور جو شہنشاہی قائم کرنیکی سب سے بڑی محرک ہے اسکو بھی روک دیں۔
بعض مدبران سلطنت نے بھی ان حکیموں کے خیال کی پیروی کی۔ مگر ان میں سے ایسے
بھی نکلے کہ انھوں نے تمدن کی ترقی وحفاظت کیلئے ریاستوں کے اتحاد اور یونانیوں کے

افراط سے بڑھنے کو ایک ضروری چیز سمجھ کر یا تو آئی سوقراطیس کی طرح پر اپنی وضع کی قومی سرگروہی کو اسطرح مستحکم کرکے تجویز کیا کہ تمام لوگوں کی مرضی سے وہ قائم کیجاوے یا ان چند شکلوں میں سے جو تمام ریاستوں کو متحد کرکے ایک ملکی سلطنت (بڑی نوریل اسٹیٹ) قائم کرنیکی پیدا کی گئی تھیں کسی ایک شکل کو اختیار کرنا پسند کیا۔ لیکن انسان کی ترقی کا پاس ولحاظ مجبور کرتا ہے کہ ہم اس موقع پر کسیقدر غائر نظر سے ان تحریکوں کو دیکھیں جن میں ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔

۳۷۱ ق م میں تھیبس کی ریاست نے جو علاقۂ بیوشیا میں واقع تھی لکترا کے مقام پر اسپارٹا پر فتح پائی۔ اور اس فتح سے وہ کل یونان کی پیشوا اور سرگردہ بن گئی یہ سرگروہی (ہیجی مونی) پرانی طرز کی تھی جسکا دو مرتبہ پہلے بھی تجربہ ہوچکا تھا کہ وہ مستقل طور پر چلنے کے قابل نہیں[1]۔ اسکے علاوہ جو رتبہ تھیبس کو خاص بیوشیا میں ۳۷۰ ق م (۲۷)
سے پہلے حاصل ہوچکا تھا وہ صاف بتا رہا تھا کہ آگے چلکر کل یونان میں کیا صورت پیدا ہونے والی ہے۔ تھیبس کو جسوقت بیوشیا میں بڑا رتبہ حاصل ہوا تو بیوشیا کے کل علاقہ کو جسمیں دس شہر تھے چھ ضلعوں میں تقسیم کیا گیا اور ان چھ ضلعوں میں گیارہ انتخابی قسمتیں قائم کی گئیں۔ تھیبس کے ضلع میں چار۔ اور کومی نوس اور تھس پی کے ضلعوں میں دو دو۔ اور باقی تین اضلاع میں ایک ایک انتخابی قسمت قائم ہوئی۔ ان دس شہروں سے چھ چھوٹے جھیل والے شہروں میں صرف دو انتخابی قسمتیں اس غرض سے رکھی گئیں کہ گو یہ شہر نقصان میں رہیں مگر تھیبس کا فائدہ ہاتھ سے نہ جائے۔ کیونکہ ان گیارہ انتخابی قسمتوں میں سے فی قسمت ایک بیوتارک یعنی عامل نامزد ہوتا تھا اور اسطرح جملہ گیارہ بیوتارک سے بیوشی لیگ کی انتظامی جماعت بنتی تھی۔ اسطرح گیارہ قسمتوں سے فی قسمت ۶۰ مشیر پیش ہوکر ۶۶۰ مشیروں سے بیوشیا کی مجلس

[1] یہی صورت دوسری ایتھنزی شہنشاہی کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ جس اتحاد سے یہ شہنشاہی پیدا ہوئی تھی وہ اتحاد اس حالت کے ختم ہونے کے بعد جاری رہنے کی کوئی وجہ نہ رکھتا تھا جو اسکے وقوع کا باعث ہوئی تھی یعنی اسپارٹا کی غیر آئینی حکومت۔ پس یہ اتحاد کم سے کم اپنی ترکیب وساخت کے اعتبار سے ایک عارضی اتحاد تھا نہ کہ مستقل۔

(سائنود) قائم ہوتی تھی۔ اسیطرح لیگ کے ججوں کی تعداد پوری کرنے میں ہر ایک قسمت اپنا اپنا حصّہ ادا کرتی تھی۔ پس اسطرح تھیبس گویا بوشیا کا پروشا بن گیا۔ اس سیاسی رعایت کے اعتبار سے کہ گیارہ میں سے چار انتخابی قسمتیں تھیبس کو ملی تھیں بلکہ کی مجموعی مالگذاری بھی گیارہ حصوں میں سے چار حصّے اسکو ملی تھی۔ مگر اسی نسبت سے اسکی ذمہ داریاں بھی زیادہ تھیں یعنی بوشیا کی کل فوج اور محصولات کا چار گیارھواں حصّہ اسکو مہیا کرنا پڑتا تھا۔ اس طریقے سے لیگ کی ذمہ داریاں اور حقوق ملک کے مختلف حصوں کی آبادی اور آمدنی کے حساب سے تمام شہروں پر حصّہ رسدی عائد و تقسیم کئے گئے تھے۔ اس طریقے میں انصاف ضرور تھا گو اس سے شہری ریاستوں کی وقعت کم ہوگئی۔ کیونکہ ایسے فیصلوں میں بھی جن میں ان ریاستوں کا بہت کم حصّہ ہوتا تھا وہ پورے طور پر ذمہ دار سمجھی جاتی تھیں۔ مگر ان ریاستوں کے لوگ ایک (۲۸)
ہی قومی گروہ (ایتھنوس) سے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے اسلیئے اس اتحادی انتظام سے وہ مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ لیگ کے زمانۂ قیام میں تھیبس کو مجبور کیا گیا کہ وہ جھیل والے شہروں پر قابو رکھنے کیلیئے ارکومی نوسس اور تھسپی کی ریاستوں سے کشمکش رکھے۔ اس کشمکش میں تھیبس برابر کامیاب رہا بلکہ اسقدر کامیاب ہوا کہ ۳۷۹ ق م میں اسپارٹا نے جسوقت "شاہی صلحنامہ" کی تعمیل شروع کی تو تھیبس کا زور توڑنے کیلیئے بوشیا کے لیگ کو فنا کردیا۔ ۳۸۶ ق م تا ۳۷۱ ق م میں تھیبس نے پھر بوشیا کی ریاستوں میں لیگ قائم کرنیکی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی چنانچہ جب ایپامی ننداس کا زمانہ آیا تو بوشیا بجائے ایک لیگ کے محض ایک شہری ریاست مثل اٹیکا کی ریاست کے رہ گیا تھا۔

بوشیا کی لیگ کو گو تھیبس کی بالادستی سے اندرخانہ بہت کچھ نقصان گوارا کرنا پڑتا تھا لیکن باہر اسکی اقبالمندی کا شہرہ ہر طرف تھا۔ اسکے سیاسی دستور و طریقے ایسے کارآمد تھے کہ ان میں سے بعض کو ایتھنز نے ۴۱۱ ق م کے سیاسی انقلاب میں اختیار کرلیا اور ان میں سے بعض طریقے جسوقت بوشیا میں متروک ہوگئے تو آرکیڈیا میں انکو جاری کیا گیا۔ اسکے علاوہ یہ بھی ایک بڑا تاریخی تعلق ہے جسکو اوولف ولیم نے پرانے کتبوں کو پڑھکر بڑی محنت سے تحقیق کیا ہے کہ ۳۳۸ ق م میں کیرونیا کی فتح کے بعد بادشاہ مقدونیہ فیلقوس نے بوشی لیگ کا پورا چربا

شہروری تبدیلیوں کے ساتھ اُس نظام میں اُتار لیا جسکا پابند اُسنے کل یونان کو کیا تھا کیونکہ
اگر ہم فیلقوس کی مجلس "حفاظت عامہ" کے ارکان کو بیوشیا کے گیارہ بیوتارک کے مقابلے میں
اور کورنتھ کی مجلس (سائنود) کو بیوشیا کے ۶۶۰ شہروں والی مجلس (سائنود) کے مقابلے
میں اور فیلقوس کے ان اضلاع کو جو اسپارٹا چھوڑ کر اور مقدونیہ شامل کر کے اتحادی اغراض
(۲۹) کیلیئے کل یونان میں قائم کئے گئے تھے بیوشیا کے چھ اضلاع کے مقابلے میں دیکھیں تو
ثابت ہوگا کہ فیلقوس نے یونانیوں کیلیئے جو انتظام کیا تھا وہ بیوشیا کے سیاسی نظام
کے تمام جزئیات کا چربا تھا اور صرف سیاست کے صیغے ہی میں یہ تقلید نہیں کی تھی بلکہ
فوجی نظام بھی جس سے اُسنے بیوشیا کو فتح کیا تھا بیوشیا ہی کی ایجاد سے تھا فیلقوس
لڑکپن اور جوانی میں مدتوں تھیبس میں بطور ضمانت کے مقید رہا تھا پس اس کے
نظم و نسق سے جو آئندہ اس سے عمل میں آیا ثابت ہوتا ہے کہ بیوشیا میں رہ کر اس نے
اپنی عمر ضائع نہیں کی تھی ۔

بیوشی لیگ اور فیلقوس کے یونانی لیگ کی خصوصیات سے سب سے بڑی
چیز انکی مجلس سائنود تھی ۔ ان دونوں لیگوں میں یہ مجلس قطعاً ایک نیابتی جماعت تھی ۔
بیوشیا کی مجلس میں اسکے ارکان ۔ لیگ کی حدود ارضی سے اس طرح لیئے جاتے تھے
کہ جو ریاستیں بڑی تھیں وہ کئی کئی نائب اور جو چھوٹی تھیں وہ کئی کئی ملکر ایک نائب مجلس
کو بھیجتی تھیں ۔ مگر یونانی لیگ میں مقدونیہ کے قرب و جوار کی ریاستوں کو اور ایسی
ریاستوں کو جو اتحاد میں شریک تھیں نیابت کی غرض سے ایک فرد مانکر آبادی کے
حساب سے نائب بھیجنے کا اختیار دیا گیا تھا ۔ اس طریقے سے ظاہر ہے کہ بجز
مقدونیہ کے جو سب سے بڑی ریاست تھی تمام ریاستیں سب سے بڑی ریاست
کی زیردست ہوگئیں اور بہت سی شہری ریاستیں ان اضلاع کی ماتحتی میں آگئیں جو
اتحاد کی غرض سے قائم ہوئے تھے اور جن سے ان ریاستوں کو متعلق کر دیا گیا
تھا ۔ اس صورت میں شہروں کی آزادی کو نقصان پہنچا ۔ اور اس نقصان کا یہ
معاوضہ کہ جسقدر مشمولہ شہروں کی آزادی انکے ہاتھوں سے نکلتی جاتی تھی اسیقدر
آزادی ہیلینی لیگ کی مجلس کو ملتی جاتی تھی انکے اصلی نقصان کے مقابلے میں کافی نہ تھا ۔
ہیلینی لیگ کی مجلس کے اجلاس کورنتھ میں ہوتے تھے ۔ اس قومی لیگ سے جو قومی صدا

اٹھتی تھی وہ اُس صدا سے کمزور ہوتی تھی جو بیوشیا میں اسکے گروہی لیگ سے اٹھتی
تھی شہری ریاستوں کے ہاتھ سے آزادی کا نکلنا انکے حق میں ایک مصیبت تھا نہ کہ
برکت۔ ۳۳۸ ق م کے بعد شہری ریاستیں آپس میں جنگ وجدال اور انقلاب
پیدا کرنیکے پرلطف مشغلوں سے محروم ہوگئیں۔ اب انکو یہ آزادی نہ تھی کہ علانیہ
فیلقوس کی دشمن بنیں۔ اب وہ مجبور اور پابند تھیں کہ مجلس میں حق نیابت رکھنے کی
وجہ سے جو تعداد سواروں یا زرہ پوشوں یا ہلکے ہتیار رکھنے والے سپاہیوں اور
بحری فوجیوں کی از روئے حساب انکے نام چڑھ گئی ہے لیگ کی ضرورت کے وقت
پیش کرتے رہیں اور وقت معین کے بعد جتنے دنوں تک یہ سامان موقع پر نہ پہنچے (۳۰)
تو فی یوم ایک کثیر رقم جرمانہ کی ادا کریں۔ اس لیگ نے اپنی مجلس کا انتظام اسپر
ختم کیا کہ فیلقوس بادشاہ مقدونیہ کو خشکی وتری دونوں میں اپنا سرگروہ (ہیجی مون)
تسلیم کرلیا۔ اور اپنے ہی اراکین میں سے انتظام کیلئے چند لوگوں کو منتخب کرکے
ایک انجمن حفاظتِ عموم کی غرض سے قائم کی۔ اس انجمن کے اجلاس پدنا کے
مقام پر ہوتے تھے۔ ریاستہائے متحدہ نے اس انجمن کو اس خیال سے غنیمت
سمجھا کہ غالبًا وہ انکے فائدہ کا خیال رکھیگی۔ لیکن اس لیگ میں جو سب سے ناگوار
چیز جسکی مثل بیوشیا میں کوئی چیز نہ تھی لیگ کا ہیجی مون یعنی سرگروہ تھا۔ شہری ریاستیں
جو حریت محض کو اپنا اعلیٰ ترین مقصد سمجھتی تھیں انکو کسی مجلسِ لیگ کی ماتحتی ناگوار تھی
پھر ایسے لیگ کی ماتحتی جو بالکل ہی ایک سرگروہ (ہیجی مون) کی ماتحتی میں ہو اور یہ
سرگروہ بھی سوائے مقدونیہ کے بادشاہ وقت کے دوسرا آدمی نہو ہرگز قابل برداشت
نہ ہوسکتی تھی۔ فیلقوس کی سرگروہی یہ گو اوپر بہت تنگ لپٹی ہوئی تھی لیکن پھر بھی
وہ ایک سرگروہی (ہیجی مون) ہی تھی۔ اور اس نہج سے وہ خلاف قانون اور ناقابل
تسلیم تھی۔[۱]

ایتھنز نے بھی شہنشاہی رکھنے کے زمانے میں ایک نمایاں ترقی

۱۔ اس ہیجی مونی (سرگروہی) کو کسی قدر کم قابل اعتراض صورت میں انٹی گونس دوسن نے پھر زندہ کیا۔ دیکھئے
اس باب کا حاشیہ والا صفحہ ۴۲ اور باب سوم۔

اس باب میں کی ہتی کہ قانونی طریقے سے ایک وسیع پیمانہ پر شہری ریاستوں میں اتحاد پیدا
کیا جاوے ۔ ایتھنز نے اسوقت بہت سی نوآبادیاں (کلیروکی) قائم کی تھیں۔ اگرچہ
ان میں ہر ایک نوآبادی بذات خود ایک شہری ریاست کی حیثیت رکھتی تھی لیکن ایتھنز کے
جو لوگ اِن نوآبادیوں میں آباد ہوئے انکے شہری حقوق جو ایتھنز میں وہ رکھتے تھے
بدستور قائم رکھے گئے ۔ اور اب ایتھنز میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ایک شہری ریاست
کے حقوق (پولیٹی) دوسرے شہر کے باشندوں کو کیوں نہ دئیے جاویں ۔ اس
خیال کے موجد جہاں اور لوگ تھے ان میں شاعر ارسٹو فینز ایتھنز کا مشہور کمیڈی نویس (۳۱)
بھی تھا ۔ یہ شاعر ایک جگہ لکھتا ہے "فرض کرو کہ ہمارا شہر اون کا ایک ڈھیر ہے اور جو
شہری ریاستیں اِس سے اتحاد رکھتی ہیں وہ بھی اون کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں ہیں ۔
اب ہمارا کام یہ ہے کہ کل اون کو سمیٹ کر اس سے ایک بڑا لنبا چوڑا کمبل تیار کریں
جسکو اوڑھکر ہمارا خداوند جمہور جاڑے پالے سے بچ جاوے ۔" لیکن اس تجویز
کیلئے زمانہ مساعدنہ تھا ۔ ایتھنز کے لوگ مغرور تھے اور انکی طبیعت اسکو گوارا
نہ کرسکتی تھی کہ جن حقوق کو انھوں نے اسقدر کوشش سے خاص اپنی ذات کے لئے
حاصل کیا ہے ان میں غیروں کو بھی شریک کیا جاوے ۔ پھر یہ کہ اولاً تو ان حقوق میں
غیروں کی شرکت سے وہ پہلا سا لطف نہ رہیگا دوسرے یہ کہ جب ریاستہائے غیر کے
لوگ بھی ایتھنز کے شہری متصور کئے جائینگے تو ان ریاستوں کی حیثیت اور نام میں
جنکے وہ اصلی شہری ہیں فرق آئیگا اور یہ ایسا نقصان ہوگا جسکی تلافی ایتھنز کے شہری
حقوق حاصل کرنے سے نہو سکیگی ۔ صرف ایک مثال البتہ ایسی نظر آتی ہے جسمیں
ایتھنز نے غیروں کو فی الواقع اپنے شہری حقوق عطا کئے ۔ یعنی جسوقت پیلو پونیس
کی لڑائی میں ایتھنز والوں کی حالت بہت نازک ہوگئی تو اسوقت ریاست سیموس
کے لوگوں کو یہ حقوق انھوں نے دے دئیے ۔ بلکہ یہ کہنا چاہئیے کہ سیموس والوں
نے ایتھنز کا ساتھ دیکر ان حقوق کو خود حاصل کیا ۔ اور ان حقوق کی پوری قدر
کرنا بھی انہی کا حصہ تھا کیونکہ ایتھنز سے اتحاد کرکے انھوں نے قصد کرلیا تھا کہ
جس حال میں ہونگے کبھی ایتھنز کا ساتھ نہ چھوڑینگے چاہے اسمیں اپنی ہستی ہی
کیوں نہ مٹ جاوے ۔

ایک دوسرا طریقہ جسمیں زیادہ حوصلہ مندی کی ضرورت نہ تھی اور جسکے ذریعے
سے شہری ریاستوں میں ایک مستقل اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کیگئی آئی سوپولیٹی (باہمی تبادلۂ
حقوق شہری) تھا۔ (یعنی اگر ایک شہر نے اپنے شہری حقوق دوسرے شہر والوں
کو دئے ہیں تو یہ دوسرا شہر بھی پہلے شہر والوں کو اپنے شہری حقوق عطا کرے)
خاص صورتوں میں اس عطیہ کی شکل محض یہ ہوتی تھی کہ اگر کسی شہر کے باشندوں نے
دوسرے شہر میں سکونت اختیار کر لی ہے یا اکثر آمد و رفت رکھی ہے تو اس دوسرے
شہر نے انکو اپنے کل شہری حقوق بجز حق نیابت کے عطا کر دیئے ہیں۔ ایسی محدود صورت
میں یہ عطیہ اس سے زیادہ نہ تھا کہ دو شہروں کے لوگوں کو وہ رعایتیں حاصل ہو جاویں
جن سے ایک شہر سے دوسرے شہر میں تجارت کی گرم بازاری ہو سکے مگر اس شرط
کے ساتھ کہ ایک شہر والے کو دوسرے شہر والے کے ایسے حقوق سے جو اسکو خاص
اپنے شہر کے نظم و نسق میں حاصل ہیں کوئی تعلق نہو۔ مگر اس شکل سے کوئی بڑا سیاسی نتیجہ (۳۲)
پیدا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ہر ایک شہر اپنے سیاسی انتظام کے متعلق جملہ اختیارات
اپنے ہی شہر والوں کے ہاتھ میں رکھنے چاہتا تھا۔ اور اس حالت میں غیر ممکن
تھا کہ ریاست سازی میں ترقی کا کوئی قدم آگے بڑھ سکتا۔ یہ کام رومانیوں کیلیے
اٹھا تھا کہ وہ عطائے حقوق شہری (پولیٹی) کو ایک حیرت انگیز درجے تک نتیجہ
خیز اس طریقے سے بنا دیں کہ رومانی حقوق شہری کو قانوناً عمل میں لانا ترک
وطن کرنیکے بعد روما میں سکونت اختیار کرنے پر منحصر نہ رہے۔

قریب قریب یہی نتیجہ یونانیوں نے سِم پولیٹی یعنی شہریت مشترکہ سے
پیدا کیا تھا۔ اس قسم کی شہریت یونان کی چند قوموں کو اسوقت سے حاصل تھی جبکہ
وہ تمدن کی ابتدائی حالت میں تھیں۔ مثلاً اکایا اور ایٹولیا کی قومیں تھیں جنکے
شہر یا قصبات کبھی اس رتبے کو نہ پہنچے تھے کہ دوسروں پر انکو حصر نہ کرنا پڑا ہو
یا وہ بذاتِ خود ایک با اختیار فردِ سیاسی بن گئے ہوں۔ پس ان شہروں یا
قصبات کے باشندے یا تو ایکیم کے اکائی ہوتے تھے یا ان برائے نام دس
شہروں میں سے کسی شہر کے باشندے ہوتے تھے جن سے اکایا کی قوم یا لیگ
بنی تھی۔ اسطرح ایٹولیا والوں کے قصبات میں وہاں کے باشندوں کو دوگونہ

شہریت حاصل تھی۔ اس طریقۂ اتحاد کا جزو اعظم یہ تھا کہ ہر ایک شہر کو لیگ کے عہدہ دار
منتخب کرتے اور لیگ کے جملہ معاملات میں رائے دینے کیلئے مساوی الدرجہ اختیارات
حاصل تھے۔ شہروں کی آزادی سلامت رکھنے کیلئے یہ طریقہ ایسا محفوظ ثابت ہوا کہ تیسری
صدی قبل مسیح کے آخری نصف میں کثرت سے پلوپونیسس کے ایسے شہروں نے
جو اکائیا کی قدیم حدود سے باہر تھے اپنے شہری حقوق کے علاوہ اکائیٹی لیگ کے
حقوق حاصل کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو ایک مرتبہ اختیار کرنے کے بعد پھر ترک
نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور یونان متوسط میں ایٹولیا والوں نے اپنی ہمسایہ قوموں
کو بزور یا بصلح دوگونہ حقوق شہری دینے شروع کر دیئے۔ مگر ایتھنز اور اسپارٹا
نے ہر صورت میں اس طریقے سے علحدہ رہنے پر اصرار کیا۔ ایتھنز نے اس
(۳۴) بنا پر کہ اسکی آزادی کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری تمام قوموں نے لے رکھی تھی۔ اور
اسپارٹا نے اس بنا پر علحدہ رہنا چاہا کہ اسکو اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔ باقی ریاستوں
نے کسی معین یا غیر معین مدت وقت کیلئے نہیں بلکہ ہمیشہ کیلئے اپنے جملہ معاملات
خارجہ کو ایک بین اقوامی مجلس کے سپرد کر دیا۔ اور ہر شہری ریاست نے
مستقل طور پر اس بین اقوامی مجلس کو اپنے اور باقی دنیا کے درمیان حاجب
بنا دیا اور اسطرح امور خارجہ کی ذمہ داری دوسرے کے سپرد کر کے اس کے
خطروں سے اپنی جان بچالی۔

اس طریقے سے ریاست کی وہ صورت پیدا ہوئی جو مورخوں اور
مصنفوں کی متفقہ رائے میں سب سے مکمل صورت تھی جو عصر قدیم کی تاریخ نے
پیش کی۔ شہری ریاستوں اور شہنشاہی میں جو اختلاف کا جوش صدیوں سے چلا آتا
تھا اسکو لیگ سازی کے عمدہ طریقے وضع کر کے تقریبًا رفع کر دیا۔

اکایا اور ایٹولیا کے لیگوں میں خرابیاں بھی تھیں جسکو ان کے مدبروں
نے رفع نہیں کیا۔ ارسطا طالیس کا قول یہ تھا کہ "مساوات وہیں درست ہے
جہاں اسکا عمل دو مساوی شخصوں پر ہوتا ہو"۔ ریاستوں کے باہمی معاملات کے
تصفیے کیلئے جو مجلس مقرر تھی اسمیں ہر شہر کو دوسرے شہر کے برابر حق رائے دینے
کا تھا۔ مگر یہ شہر دولت اور آبادی کے لحاظ سے مساوی نہ تھے۔ اس مجلس کی

مثال بالکل ہیگ کی کانگرس کی سی تھی جہیں یورپ کی ہر ایک قوم کو خواہ وہ دولت اور آبادی کے اعتبار سے دوسروں سے کیسا ہی فرق رکھتی ہو ایک ہی ووٹ دینے کا حق ہے۔

اکایا اور ایتولیا والے اپنے نائبین قوم کو اختیارات کے دینے میں جس درجہ کے قریب پہنچ گئے تھے زمانۂ قدیم کی کسی اور حکومت عمومی میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ اکایا والے ہر سال ایک مجلس واضعان قانون کی مقرر کرتے تھے جس میں ہر شہر کے باشندوں میں سے کچھ لوگ شریک کئے جاتے تھے۔ ایتولیا والے بھی ہر سال ایک مجلس اپنے نائبوں کی مقرر کرتے تھے اور ان نائبوں کی تعداد ہر ایک شہر سے جو ایتولیا کے لیگ میں شریک تھا اسکے رقبے کی نسبت سے معیّن کیجاتی تھی۔ علاوہ ان طریقوں کے جس چیز سے اکایا اور ایتولیا والوں نے حکومت عدیدی (اولیگارکی) کی طرف سے جس سے یونانیوں کو بالطبع نفرت تھی اپنی بے اعتباری ظاہر کی وہ یہ تھی کہ جسقدر مشکل معاملات پیش آتے تھے اُن کو تصفیہ کیلئے ایک ایسی مجلس کے سامنے پیش کرتے تھے جہیں تمام قوم جمع ہو۔

مگر اس انتظام میں ایسے لوگوں کیلئے اپنے جائز حقوق کو پہنچنے کا کوئی (۳۴) طریقہ نہیں دریافت کیا گیا تھا جو بعدِ مسافت یا ناداری وقت کی وجہ سے اُن مجلسوں میں شرکت سے قاصر رہتے ہوں۔

بہرکیف اس قسم کے نقائص وہ نہ تھے جنھوں نے ہیلاس (تمام یونان) کو ایک اتحاد میں شرکت کیلئے اتفاق کرنے سے روکا ہو۔ بلکہ یونان کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ فن سیاست خواہ اپنا کیسا ہی کمال دکھاتا مگر تمام ملک کو متفق کرکے ایک تن واحد بنا دینا اب اسکی قدرت میں نہ تھا۔ اینٹی گونس دوسن (۲۲۹-۲۲۱ ق م) نے جسکا نام کیلی کرتی داس۔ ایگی سیلاس۔ الفکراتیس۔ فوکیون جیسے دانشمندوں کے نام کے ساتھ گھر گھر لیا جاتا تھا اس امر میں بڑی دریادلی اور پوری لیاقت سے کوشش کی کہ جدید طریقۂ اتحاد میں وہ پرانا طریقہ اتحاد کا شامل کردیا جاوے جسکے بموجب قوم کے نائبوں کی ایک مجلس کورنتھ میں اجلاس کیا کرتی تھی اور بادشاہ مقدونیہ اسکا سرگروہ (ہیجی مون) ہوا کرتا تھا۔ لیکن

اس طریقے کی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ گو اسکے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن ہیلاس یعنی کل یونان اسکو قبول نہ کرسکا اور اسلیئے وہ بے اثر رہا۔ اب یونان میں حالات نے ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ اُسکی اصلاح یونانی قوم کی قدرت میں نہ رہی تھی۔ یہ حالات کیا تھے۔ شاید مثال سے کسی قدر سمجھ میں آجاویں۔ پس ذرا تصور سے کام لیکر فرض کیجئے کہ یورپ کی موجودہ قومیں متواتر ترک وطن اور معاشی کشمکش سے منتشر و کمزور ہوگئی ہیں اور اپنے کارخانے (۳۵) اور تجارت کے کاروبار یورپ سے اُٹھا کر مشرق کے ملکوں میں لے گئی ہیں اور وہاں یورپین لوگوں کی نگرانی میں ان دھندوں کو چلا رہی ہیں اور اس مصروفیت میں وطن کے سیاسی و فوجی معاملات کا اہتمام کسی یورپین پارلیمنٹ کے سپرد نہیں کرتیں بلکہ لیٹن اور ٹیوٹونک مجالس کے سپرد کرتی ہیں جو ہمیشہ جنگ و جدال پر آمادہ رہتی ہیں۔ اور یہ اہتمام و انتظام اس غرض سے کرتی ہیں کہ سلطنت روس کی طرف سے جو خطرہ ہے وہ رفع ہوجاوے۔ لیکن اس حالت میں دفعتہً امریکہ توپ و تفنگ سے گرجتا اور برستا پہنچ جاتا ہے کہ کسی کو بچالے اور کسی کو غارت کردے۔ پس اگر یہ صورت خیال میں آسکتی ہے تو یونان کی حالت کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُسوقت اسکو کس قسم کی دشواریاں پیش تھیں۔

یہاں یہ بیان کرنا کہ رومانی حکومت عمومیہ نے یونان کو مقدونیہ سے کیونکر آزاد کیا اور مشرق کی یونانی بادشاہیوں کو اپنے حکم اور ارادہ کا کسطرح پابند کیا اور کسطرح رنگ برنگ کے ٹکڑے جوڑ کر ایک عالمگیر رومانی شہنشاہی قائم کی اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ یہاں صرف اسقدر کہنا کافی ہوگا کہ رومانیوں نے بعض ریاستوں کو تو اپنے حقوق شہریت یعنی پالیٹی دیکر اُن ریاستوں کی علٰحدہ ہستی کو فنا کردیا اور بعض کو آئی سو پالیٹی یا تبادلہ حقوق شہری اور اسکے ساتھ مقامی رعایتیں دیکر جو یونان میں ابتک سم پالٹی یعنی شہریت مشترکہ کی وجہ سے چلی آتی تھیں شہر روما کی ایک بڑی میونی سپلٹی (حلقۂ انتظام بلدیت) بناکر اور اُس کے وارڈ قائم کرکے تمام ایطالیہ کو اُسکے حدود اختیارات میں شامل کیا۔ بعض ریاستوں سے (جو سوسائی یعنی ایطالیہ کی حلیف تھیں) پہلے ہی ایسے عہدنامے ہوچکے تھے

جنسے انحراف ممکن نہ تھا اور اسلیئے مجبوری تھی کہ انکو اپنا حلقۂ انتظام بلدیت جدا قائم کرنے کا اختیار دیا جاوے۔ باقی ریاستوں سے (جو "دوست" یا "دوست و حلیف" کہلائی جاتی تھیں اور جنکے علاقوں سے بعد کو رومانی صوبہ جات قائم ہوئے) یا تو بطور خود ایک مفاہمہ کر لیا یا عارضی معاہدے کر لیئے اور اس حالت کو اتنی مدت قائم رکھا کہ رومانی فرمانرواؤں کو دیوتا ماننے کی عادت طبیعت کا ایک خاصہ ہوجائے اور یہی طریقہ وہ تھا جس سے یونانیوں نے سیاست مطلق (ایب سولیوٹزم) کو جواز قانونی بخشا تھا۔

اس عجیب و غریب طریقے کے متعلق کہ فرمانروا کو دیوتا مانا جاتا تھا چند باتیں بیان کر کے میں اس مضمون کو ختم کیئے دیتا ہوں جسمیں ایک نظر ان تدابیر پہ ڈالی گئی ہے (۳۶) جو یونانیوں نے اس غرض سے پیدا کی تھیں کہ پہلے تو شہنشاہیت کو ایک تاریک مسئلہ بنا دیں۔ پھر اُس سے گریز کرتے رہیں اور آخر کار اُسکو صحیح مانکر اختیار کر لیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یونانیوں کا وہ طریقہ کیا تھا جس سے حکومت شخصیہ (دسپوٹزم) کو وہ قانوناً جائز کر دیتے تھے۔ یہ طریقہ سوائے اسکے کچھ نہ تھا کہ اسکندر اعظم نے ریاست سازی کی اغراض کیلیئے اپنے معلم ارسطاطالیس کے ایک خیال پر جو اُس حکیم نے اپنی کتاب "سیاسیات" میں لکھا تھا مناسب طور پر عمل کیا۔ چنانچہ اسکندر کے اسی عمل کے مطابق یونانیوں نے اپنا وہ طریقہ پیدا کر لیا جسکے بموجب وہ شخصی حکومت کو قانوناً جائز بنا دیتے تھے۔ ارسطاطالیس کا یہ خیال ایسا تھا جسپر عمل کرنے سے شہروں اور صوبوں کو متفق کر کے ایک ایسا تن واحد بنایا جا سکتا تھا جس کے جسم کی پھر کوئی تحلیل ممکن نہو اور اسکے ساتھ ہی ایک جانب حاکم کی برتری قائم ہو اور ہر کام میں اُسکا ہاتھ کھلا رہے اور دوسری جانب ریاستہائے ماتحت کی عزت و توقیر بھی برقرار رہے جس کے بغیر اُنکی حالت سیاسی اعتبار سے ناقابل برداشت ہو سکتی تھی۔ فرمانروا کو دیوتا بنا دینے سے بہت سی غیر ممکن باتیں ممکن ہو گئیں۔ چنانچہ وہ اختلاف جو شہری ریاستوں اور شہنشاہیت میں تھا قطعاً رفع ہو گیا بلکہ اس اختلاف کی جگہ حاکم و محکوم کے لیئے دو مناسب خدمتیں پیدا ہو گئیں ایک یہ کہ حاکم محکوم پر حکومت کرے اور دوسرے یہ کہ محکوم حاکم کی اطاعت کرے۔

دوہزار برس سے دنیا کے بڑے بڑے نظامہائے حکومت اسکندر اعظم کے
ممنون احسان چلے آتے ہیں۔ اسکندر کے وقت سے لیکر قیصر ولیم ثانی کے زمانے تک انکا
ایک ایسا سلسلہ چلا آتا ہے جو کہیں نہیں ٹوٹتا۔ جسوقت تک دنیا کے پاس دیوتاؤں کی
کثرت رہی اور وہ انہیں کسی دیوتا کی فوق العادت خوبیوں کی قائل نہوئی۔ اسوقت تک دیوتاؤں کی تعداد
میں ایک زندہ بادشاہ کو شامل کر دینا کسی مذہبی قباحت کا موجب نہوا لیکن جب ایسے
مذاہب کو زوال ہوا جن میں کثرت سے معبود مانے جاتے تھے تو جس قاعدے سے زندہ
بادشاہ دیوتاؤں کے زمرہ میں شامل کئے جاتے تھے اسمیں کسیقدر تبدیلی پیدا کرنی
ضرور ہوئی۔ قسطنطین شہنشاہ روما کے زمانے میں جن بادشاہوں کو دیوتا مانا گیا انکا
انجام بھی وہی ہوا جو بت پرستوں کے دیوتاؤں کا ہوا تھا۔ گو تھوڑا سا فرق رہا یعنی
بت پرستوں کے دیوتا یا تو شیطان و عفریت ہوگئے یا اولیائے مسیحی کے قالب میں ڈھال لیئے گئے اور دنیا (۳۷)
کے تاجداروں کی نسبت خیال ہوا کہ خدائے قادر نے منصب شاہی کیلئے انکو خاص طور پر منظور
فرمایا ہے۔ اکثر صورتوں میں تو ان بادشاہوں کے بزرگ ہی انکے سر پر تاج رکھ گئے
تھے اور انکے مذہب کے خدام اور کلیسا کے بطریقوں نے ان پر عطریات ملے تھے
یعنی خدا کا حکم پاکر وہ حکومت کی کرسی پر بیٹھتے تھے۔ اور صرف اپنے ہی خدا کے سامنے
وہ اپنے افعال نیک و بد کے ذمہ دار تھے۔ مگر دنیا کے ان حصوں میں جہاں مذہب
کو زیادہ قوت نہ تھی جیسے کہ موجودہ پروشیا ہے وہاں بادشاہوں نے خود اپنے ہاتھ
سے اپنے سر پر تاج رکھ لیئے۔ یہ حالات آخری زمانے میں پیدا ہوئے لیکن وہ
کسطرح پیدا ہوئے ان سے ہم کو اس کتاب میں بحث نہیں ہے۔ بہرکیف میں اس کتاب
کے تیسرے اور چھٹے باب میں اس بات کو دکھانے کی کوشش کرونگا کہ اسکندر اعظم
کی عالمگیر شہنشاہی کے زمانے میں فرمانرواؤں کو دیوتا بنانے کا جو طریقہ نکلا تھا اسمیں
کیونکر ترقی ہوئی اور مصر کے بطلیموسیوں اور شام کے سلوقی بادشاہوں کی شہنشاہیوں
میں اس طریقے سے کیا کام نکالا گیا۔

دوسرا باب

ایتھنز کا ایک شہنشاہی عمومیہ بنجانا (۳۸)

نظم حکومت کی کوئی شکل یا کسی اصول سیاست کا اعتقاد ایسا نہیں ہے جو ایک ریاست کو شہنشاہیت (امپیریل ازم) سے بچا سکے۔ ہمارے ملک امریکہ ہی کو دیکھیے کہ آج دنیا کی طاقتوں میں کوئی طاقت ایسی نہیں جسنے اُسکے مثل عموم کی جہاں بانی و حکمرانی کو اپنا نصب العین بنایا ہو۔ جس نے اپنے قصر حکومت کی بنیاد بالکل اس یقین پر رکھی ہو کہ انسان سب آپسمیں برابر ہیں۔ جسنے پیدائش و نسل۔ تعلیم و مذہب۔ دولت اور پیشہ کے فرق کو کچھ نہ سمجھا ہو یا ہمیشہ یہ ہی قصد رکھا ہو کہ اس فرق کو کچھ نہ سمجھا جاوے۔ مگر یہ اعلیٰ ترین نمونہ جمہوری حکومت کا بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے اور بغیر اسکے کہ ہم کچھ محسوس کرسکے ہوں ایک شہنشاہی بن گیا۔ موسیو بوشی لیکارک نے اپنی کتاب تاریخ روما میں اس مضمون کو بڑی ممتاز جگہ دی ہے گو اس مضمون کا ابھی تک بحث طلب ہونا خود مصنف کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ رومانیوں نے باوجودیکہ انکا مقتضائے طبیعت نہ تھا پھر بھی دنیا کو مسخر کرلیا انگریزی عروج کے ذکر میں بعض لوگ جناب مسیح کا یہ قول نقل کرکے کہ "مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہی زمین کے وارث ہونگے" خبر نکالتے ہیں کہ یہاں "حلیم" سے مراد انگریز ہیں۔ مگر ہماری وہ قوت احساس جس سے سچائی پرکھی جاتی ہے اس خیال سے مطمئن نہیں ہوتی بلکہ پروفیسر سلی کا یہ خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ "ایک مدت مدید کی حالت بے خبری میں کہ قوم کی طبیعت اسطرف سے بالکل غیر حاضر تھی ایک شہنشاہی پیدا ہوگئی" بہرکیف اتنا ضرور ہے کہ وہی دایہ جسنے آئین آزادی کو اپنی گودوں کھلایا تھا نادانستہ لاکھوں اور کروروں مخلوق کی ملکہ بن گئی۔

(۳۹) دنیا میں کوئی قوم جسنے اس خیال کو کہ تمام شہری آپس میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں ایک زندہ شئے بناکر دکھا دیا ہو سوائے ایتھنز والوں کے دوسری نہ تھی۔ اور میرے علم میں تو کوئی ریاست جسنے انتظام حکومت کا مطلقاً عموم کے قبضے میں رہنا ایک امر یقینی بنادیا ہو ایسی ذہانت و قابلیت سے قائم نہیں ہوئی جیسے کہ ایتھنزیوں نے اپنی ریاست قائم کی۔

مگر باوجود اسکے ایتھنز کے لوگ بڑے جوش و شغف سے شہنشاہیت (امپیریل ازم) کے حامی ہوگئے اور اُنھوں نے اُن چند ضروری نتائج کو جو شہنشاہیت سے منطقی طور پر منتج ہوتے تھے مان لیا یعنی یہ کہ حکومت عمومی (ڈیموکریسی) کو گو بنی نوع انسان کے حق میں مفید سمجھا لیکن اسمیں مطلق شبہ نہیں کیا کہ ایتھنز کے لوگوں نے اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر کے یونانی و غیر یونانی دونوں پر حکومت کرنیکا استحقاق پیدا کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ اس مساوات سیاسی میں جو ایتھنز کے شہریوں میں رہنی چاہیئے تھی اور اُس مساوات میں جو کل ابنائے آدم میں رہنی چاہیئے بہت احتیاط سے فرق کرنے لگے۔

ایتھنزیوں کی حکومت عمومی کی بنیاد تھمسٹاکلیس نے ڈالی تھی۔ ایتھنز کے اس نامور شخص کی صورت اُس غبارِ زر افشاں سے جو ہیرودوتس نے جنگ ایران کے واقعات کے گرد پیدا کر دیا ہے بہت ہی عجیب و مہیب نظر آتی ہے مگر مورخ تھیوسی دائیدیز باوجود سخت عیب گیر و نکتہ چیں ہونے کے تھمسٹاکلیس کی دور اندیشی کی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ معاملات کے اندازہ کرنے میں کہ آگے چلکر وہ کیا شکل اختیار کرینگے اُسکی رائے کبھی خطا نہ کرتی تھی۔ اس عالی دماغ نے ایتھنز کیلیئے ریاست ہائے غیر سے تعلقات رکھنے کا ایسا طریقۂ عمل قائم کیا جس سے شہنشاہیت حاصل کرنے کے لیئے بہتر سے بہتر آرزوئیں پوری ہوتی ہیں۔ اسکی ہدایت تھی کہ ایتھنز کو اپنے جنگی جہازوں کا بیڑا جسکو پندرہ برس کی کوشش میں اُسنے ایتھنزیوں سے تیار کرایا تھا حملہ کی غرض سے کام میں لانا چاہیئے۔ اور ایتھنز کی شہرپناہ کو جسے باوجود اسپارٹا کی مغویانہ مخالفت کے اُسنے ایتھنز کے لوگوں سے متواتر تاکید و اصرار کے بعد تعمیر کرایا تھا غنیم سے محفوظ رہنے اور اپنے طاقتور حریفوں پر فوجکشی کے وقت صدر مقام بنانے کیلیئے استعمال کرنا چاہیئے اُسکا قول تھا کہ یونان میں عمومیت کی موج اِسوقت تیز ہے۔ اُس کی مدد سے اُن تمام ریاستوں کو جو ویلوسی لیگ میں شریک ہوئی ہیں متفق رکھنا ضروری ہے۔ اور اسپارٹا نے یونان کے معاملات میں حکومتہائے شرفا کی مدد سے جن کا پیرائے گل ہونے کیسے ہے جو سرگروہی حاصل کر رکھی ہے اُسکو اندر ہی اندر کھوکھلا کر کے آخر الامر قطعاً نیست و نابود کر دینا ضروری ہے۔ ایتھنز کا فرض ہے کہ دولت ایران (۴۰
سے مفید شرائط پر صلح کر کے اسطرف سے بیفکر ہو جاوے اور پھر اسپارٹا کی قوت کو

توڑنے میں مصروف ہو۔ اور یونان متحدہ کی مجموعی طاقت سے ایتھنز کی حکومت قائم کرنے کیلئے تمام دنیا پر ہاتھ مارے۔

مشکل سے یقین آتا ہے کہ ایسا شخص جو محض پیش نظر واقعات پر یک لخت عمل کرنے کا عادی ہو وہ زمانۂ مستقبل کیلئے بھی ایسے زبردست منصوبے سوچ سکتا تھا لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ تھمس طاکلیس کے زمانے میں یونانیوں نے ایرانیوں سے لڑکر اُن کو شکست دینے میں بڑا کمال دکھایا تھا۔ اس موقع پر ایرانی فوج کی تعداد ہیرو دوتس نے ۵۲۸۳۲۲ لکھی ہے جس میں باورچنیں۔ کسبیاں۔ زنانے۔ باربرداری کے جانور۔ مویشی اور کتے شامل نہ تھے۔ لیکن اسبارسے میں ایک جرمن ماہر حرب سے اطلاع ملتی ہے کہ اگر یہ تعداد فی الواقع صحیح تھی تو سمجھنا چاہیئے کہ ایرانی لشکر کا عقب ابھی سارڈیس کے شہر سے نکلا بھی نہ ہوگا کہ اُسکے قراول نے تھرموپولی پر لڑائی شروع کردی ہوگی۔ جسکا نتیجہ اُسکے حق میں شکست ہوا۔ ہیرودوتس کے بیان میں گو مبالغہ معلوم ہو مگر یونانیوں کو ایسا ہی یقین تھا اور جسطرح کسی بات کو یونانی یقین کرتے تھے ہیرودوتس اُسکو اُسی طرح لکھدیتا تھا۔ بہرکیف یونانیوں نے آپس میں اتفاق کرکے ایران کی اُس شدید طاقت کو جس سے مراد ایشیا کی مجموعی قوت تھی توڑ دیا۔ اور ایک صاف لڑائی جیتکر اُن فاتحوں کے فاتح بن گئے جو تمام قوموں کو سرنگوں کرچکے تھے۔ اب دنیا یونانیوں کی ہوچکی تھی۔ صرف قبضے کا سوال باقی تھا۔

(۱۴) اب تھمس طاکلیس کو قوم کی اس خودداری و حوصلہ مندی سے کام لینا تھا جو اُسوقت اپنے پورے زور پر تھی۔ کیمون کی فتوحات سے جو ایرانیوں پر ہوئی تھیں یونانیوں کی طاقت میں ترقی ہوئی تھی۔ اُسی زمانے میں قوم ہیلیٹ کی بغاوت نے اسپارٹا کی کمزوری کو جو آخرکار اُسکے قطعی زوال کا باعث ہوئی طشت از بام کردیا تھا۔ یہانتک کہ ۴۶۱ق م میں ایتھنز میں پیریکلیس پسر زینتھی پس کا زمانہ آیا۔ شروع کے پندرہ سال میں یعنی ۴۶۱ سے ۴۴۶ ق م تک اس اولوالعزم ماہر سیاست کے ذمہ یہ کام رہا کہ یونان و ایران کے جملہ بحری و بری محاربات میں قومی طاقت کی موج کو اپنے حسن تدبیر سے ٹھیک راستہ پر ڈالتا رہے۔ اور پھر پندرہ برس تک یعنی ۴۴۶ سے ۴۳۱ ق م تک اُن بڑے بڑے کاموں میں مصروف ہو جو زمانۂ امن وسلامتی سے

مخصوص ہوتے ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ خود انسان کے قصد و ارادے سے بڑھکر کوئی چیز اُس سے محنت وجفاکشی سے کام لینے والی نہیں ہے۔ اس محنت وکوشش کے زمانے میں کسی صاحب تدبر کے کہنے سے نہیں بلکہ خود ایتھنزیوں کی طبیعت اپنے قوائے عملی سے کام لینے پر آمادہ ہوئی۔ مگر اس واقعے سے پیرکلیس جس تعریف کا مستحق ہے اُسمیں فرق نہیں آتا۔ یونان کی اقبالمندی کا زمانہ درحقیقت ایتھنز کی اقبالمندی کا زمانہ تھا جسکے پیدا کرنے میں بہت سی چیزیں معاون ومددگار ہوئیں۔ اُن میں علاوہ قومی زندگی کی جفاکشی کے جسکی طرف اوپر اشارہ ہوا سب سے بڑھکر چیز یہ تھی کہ قوم کے بڑے بڑے لوگوں کو باقی قوم سے ایسے حالات میں ملنے جلنے کی بیجا سہولت تھی جنہیں قوم کو اپنی قدرتی قابلیتوں سے زیادہ کام لینے کا موقع حاصل ہو۔ یہ ترکیب جسیں بڑے بڑے موجد اور واضعان تدبیر اور کثرت سے اُن کے خیالات سے متاثر ہونے والے لوگ باہم شیر وشکر رہیں ایتھنز کے دستور وآئین عمومی نے پیدا کی تھی۔ لیکن قوم اور ہر فرد قوم کی دولتمندی کیلیئے جسکے بغیر ایتھنز کی عمومی حکومت چل نہیں سکتی تھی اور خیال کی وسعت وحوصلہ مندی کیلیئے جو صرف ایسے کاموں سے پیدا ہو سکتی تھی جنمیں عزیمت واہمیت موجود ہو ایتھنز کو ایک شہنشاہی قائم وحاصل کرنی شاید لازمی ہوگئی۔ (۴۲)

پیرکلیس کے زمانے میں ایتھنز ڈیڑھ لاکھ آبادی کا شہر تھا۔ ایتھنزیوں کے علاقۂ ایٹیکا کی آبادی بھی تقریبًا اسیقدر تھی۔ اس مجموعی تعداد یعنی تین لاکھ باشندوں میں ایک تہائی غلام یا نوکر تھے اور ایک چھٹا حصہ غیر ملکی۔ ایسے لوگ جنکو حکومت کے معاملات میں رائے دینے کا حق تھا کل آبادی کا نصف حصہ تھے جن میں سے پچاس ہزار مرد ایسی عمر کے تھے جو ازروئے قواعد فوجی خدمات پر مامور ہو سکتے تھے۔

ایتھنزیوں کی شہنشاہی میں پانچ ولایتیں تھیں۔ یعنی ولایت تھریسیا۔ ولایت ہلیس پونٹ۔ ولایت انسولا۔ ولایت اے اونیا۔ ولایت کاریا۔ ان سب کی مجموعی آبادی قریب ۲۰ لاکھ کے تھی۔ اور یہ کل خطہ ایک مجموعہ جزیروں اور جزیرہ نماؤں اور سمندر کی متعدد شاخوں کا تھا۔ اسکی انتہائی سرحدوں میں ایتھنز کے شہر سے دوسو ڈھائی سو میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ اس شہنشاہی کے بحری راستے اُن

خلیجوں اور بحیروں میں سے گذرے تھے جن سے مراد مجمع الجزائر ایجین کا علاقہ ہوتا ہے معمولی حالات میں اُن بحری راستوں میں سب سے بڑی مسافت کا راستہ آٹھ دن کے مسلسل جہازی سفر سے طے ہوجاتا تھا۔ اسکے خلاف خشکی کے راستے زیادہ طولانی نہ تھے چنانچہ اگر ایتھنز کو خشکی میں کسی دور کی ماتحت ریاست کیلیئے مہم روانہ کرنی ہوتی تھی تو وہ ایک دن کے سفر میں وہاں پہنچ جاتی تھی۔ سمندر پر بغیر قابو پائے شہنشاہی کا خیال تک ممکن نہ تھا۔ سمندر کو چھوڑ کر باقی ملک کے چار سو چھوٹے چھوٹے حصے تھے جن میں ایک ہزار شہر تھے۔ اور ان ہی ایک ہزار شہروں سے ارسٹوفینز شاعر کے قول کے مطابق ایتھنز کے لوگ خراج وصول کرتے تھے۔

(۴۳) لیکن ایتھنز اپنی شہنشاہی کی حدود سے بہت متجاوز مقامات پر بھی بحری جہات اور سیاسی و تجارتی معاملات میں دخل رکھتے تھے۔ اس حلقۂ اثر میں جزیرہ صقلیہ۔ مصر فینشیا اور بحر اسود کے بلاد شامل تھے جو ایتھنز کے بندرگاہ پائے ریوس سے چھ سو میل سے زیادہ کا فاصلہ رکھتے تھے۔ اور اُن ملکوں اور جزیروں تک پہنچنے میں ایک ماہ سے کچھ کم وقت جہازی سفر میں صرف کرنا پڑتا تھا۔ غرض دنیا کا وہ حصہ جسکو تمام سیاسی اور فوجی معاملات میں اہل ایتھنز کی بحری طاقت کا بہت احتیاط سے خیال رکھنا پڑتا تھا یعنی وہ حصہ جسپر پیرکلیس کے زمانے میں ایتھنز مسلط رہنے کی کوشش کرتا تھا تقریباً ۲ کرور کی آبادی رکھتا تھا۔

پس اگر ایتھنز کے جمہور با اختیار اور اُسکی ماتحت رعایا اور غیر ملکیوں کی تعداد اور شہنشاہی کی انتہائی حدود سے باہر جس قدر وقت بحری سفر میں یا حکم احکام پہنچانے میں صرف ہوتا تھا اُسکا مقابلہ موجودہ انگلستان کی اُنہی چیزوں سے کیا جاوے تو کہہ سکتے ہیں کہ ایتھنز کی شہنشاہی کو اُسوقت کی دنیا سے وہی نسبت تھی جو انگلستان کی شہنشاہی کو آجکل کی دنیا سے ہے۔

اسپارٹا میں جو شہری ہوتا تھا اُسکی قبر پر صرف اُسکا نام کندہ کر دیتے تھے۔ سوائے نام کے اور کچھ حال جس سے اُسکی زندگی کی کیفیت معلوم ہو نہیں لکھتے تھے۔ اور اسکی چنداں ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ جسطرح ایک آدمی کی زندگی بسر ہوتی تھی اسی طرح سب کی زندگی بسر ہوتی تھی اور اس حالت سے سب واقف تھے۔ البتہ اگر

کوئی آدمی لڑائی میں مارا جاتا تھا تو اُسکے نام کے آگے اِن پولیبو لکھدیتے تھے۔ یعنی "لڑائی میں" (مارا گیا) اور یہی اُسکی زندگی کی مختصر تعریف ہوتی تھی۔

مگر ایتھنز میں جو لوگ کسی لڑائی میں کام آتے تھے اُنکے لاشے ایک خاص گورستان میں جو ایتھنز کے دروازۂ دیپالیون کے قریب تھا دفن کئے جاتے تھے اور پھر لڑائی کے بعد ایسے لوگوں کی یادگاریں جو ایک سال کے اندر اپنی جانیں وطن پر نثار کر چکے ہوتے تھے ایک رسم ادا کی جاتی تھی۔ اس رسم کے موقع پر کوئی ایسا شخص جسکی عزت قوم کی نظروں میں سب سے زیادہ ہوتی تھی تمام قوم کی طرف سے وطن کے اُن مقتولوں (۴۴) کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ جنگ پیلوپونیسی کا پہلا سال جب ختم ہوا تو یہ خدمت پیرکلیس کے سپرد ہوئی۔ پیرکلیس نے اس موقع پر اُس طریقے کو بدل دیا جو پہلے سے چلا آتا تھا۔ اور مقتولوں کی تعریف میں طوالت کرنیکی جگہ ایک نہایت فصیح تقریر میں اس امر کی تفسیر کی کہ ایتھنز کیوں اس بات کا مستحق ہے کہ اُسکے لوگ اُسکی خیرخواہی میں اپنی جان تک عزیز نہ رکھیں۔ تھیوسی ڈائڈیز نے خاص پیرکلیس کی زبان سے اس تقریر کو سنا تھا اور اُسکے کئی برس بعد اُسنے اس تقریر کو جہانتک حافظے نے کام دیا لکھا۔ اور اسطرح لکھی ہوئی تقریر آجتک تقریر تعزیت کے نام سے دنیا میں مشہور چلی آتی ہے۔

ایتھنز کی قدیم شان و شوکت کی نسبت جو قصے اور افسانے مشہور تھے اُنپر پیرکلیس نے زیادہ گفتگو نہیں کی۔ مخلوق کے ساتھ ایتھنز کی فیاضیاں۔ غلہ کا تقسیم کرنا۔ شائستہ زندگی کی ضروریات کا مہیّا کرنا۔ اُسکی شعر و شاعری کے چرچے غرض وہ تمام باتیں جنکا ذکر بہت ہی فخر سے کیا جاتا تھا پیرکلیس کے نزدیک کچھ معنی نہ رکھتی تھیں۔ اُسکی رائے تھی کہ قدیم زمانہ میں ایتھنز کے اسلاف نے دو باتیں سب سے بڑی کی تھیں۔ ایک یہ کہ اُنھوں نے اپنے ملک کو کامیابی کے ساتھ دشمنوں سے محفوظ رکھا تھا۔ دوسرے یہ کہ ایک آزاد و با اختیار ریاست اپنے پسماندگان کے لیئے چھوڑی تھی۔ چنانچہ اُسنے اپنی تقریر میں کہا کہ "اگر زمانۂ بعید کے اسلاف کی یہ دونوں باتیں تعریف کی مستحق ہیں تو اُن سے بڑھکر زمانۂ قریب کے اسلاف یعنی ہمارے باپ دادا تعریف کے مستحق ہیں۔ کیونکہ جو کچھ ترکہ اُنھوں نے اپنے بزرگوں سے پایا تھا اُسکو وہ بڑھاتے رہے۔ اور بڑی کوشش و سعی سے ایک آزاد ریاست

اپنے فرزندوں کیلیئے یعنی ہمارے لیئے چھوڑ گئے۔ اور ہم جو آج یہاں موجود ہیں اور جن میں اکثر اپنی عمر کا بہترین حصہ بسر کر رہے ہیں یہی لوگ خاصکر وہ ہیں جنھوں نے ترقی کے کام کیئے ہیں اور ہمارے شہر کو اپنی فیاضی سے ہر طرح کی چیزیں بخشی ہیں۔ اور یہ چیزیں اتنی ہیں کہ لڑائی اور امن دونوں زمانوں میں اپنے شہر کو کسی کا محتاج نہیں رکھتیں۔ محاربات کا حال جن سے ہم نے اپنی سلطنت پیدا کی ہے یا اُس ہمت وشجاعت کا حال جس سے ہمارے بزرگوں نے خاص یونانیوں یا غیر یونانیوں کے سیلاب کو روکا تھا میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ قصے طولانی ہیں اور سب لوگ اُنسے واقف ہیں لیکن (۴۵)
...... میں یہ بات ضرور بتانی چاہتا ہوں کہ کام کرنے کے وہ کون سے طریقے تھے جن سے ہم کو زور واقتدار نصیب ہوا۔ اور کن آئین ودستور سے اور کسطرح کے طرز معاشرت سے ہماری شہنشاہی فی الواقع ایک بڑی شہنشاہی ہوگئی۔"

میں چاہتا ہوں کہ پیرک لیس کے اُن الفاظ کو آپ میری کتاب کے دوسرے باب کی پیشانی سمجھیں۔ پیرک لیس نے جن حالات کی نسبت صرف اتنا کہکر چھوڑ دیا تھا کہ ایتھنز کے لوگ اُن سے بخوبی واقف ہیں اگر اُن حالات کو بھی وہ بیان کر دیتا یعنی ایسے اصول معاشرت وسیاسیات کی شرح بھی اپنی تقریر میں کر دیتا جن پر عمل کرنے سے ایتھنز کے لوگوں نے اپنی اعلیٰ ترین امیدوں اور آرزووں کو حاصل کیا تو میرے لیئے صرف اُسکی عبارت کا نقل کر دینا کافی ہوتا۔ یعنی تمام تقریر کو از اول تا آخر اپنی کتاب میں درج کر کے سمجھ لیتا کہ میں اپنے فرض سے ادا ہوگیا۔

لیکن اب تقریر کو محض نقل کر دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ میرے لیئے یہ مناسب ہوجاتا ہے کہ پیرک لیس کے الفاظ کو متن کے طور پر نقل کر کے ایتھنزی اصول سیاست کی شرح کروں لیکن مجھکو یہاں اسقدر کہنے کی اجازت دیجاوے کہ اگر ایتھنز کے متعلق ہماری تمام واقفیت کا حصر پیرک لیس کی تقریر تعزیت ہی پر ہوتا یا اگر پانچویں صدی قبل مسیح میں جو حالت یونان کی تھی اُسکے اندازہ کرنے کیلیئے یہی تقریر تنہا ذریعہ ہوتی تو بھی یہی نتیجہ نکالنا پڑتا کہ انسان کے حق میں یہ زمانہ حقیقت میں بے مثل تھا۔ لیکن حسن اتفاق سے اس تقریر کے علاوہ اور چیزیں بھی زمانے کے نیش ونسیان سے بچکر ابھی تک باقی ہیں۔ مثلاً پارتھی نون کی عظیم الشان عمارت۔

بت تراشی کے نمونے جن میں بت تراشوں نے اپنی ہنرمندی دکھائی تھی۔ شاعران باکمال
اسکائیلس اور سوفکلیز کا پر درد کلام۔ ہیرودوٹس کی تاریخ جسکا لطف کبھی نہ گھٹیگا ابھی
تک دنیا میں موجود ہیں۔ انسان کے تصورات عالیہ کی اصل بھی ایک حد تک ہمیشہ
مادی حقیقت پر مبنی ہوتی ہے اور تصور کو مادی حقیقت سے کم سے کم وہ ہی
(۴۶) نسبت ہے جو ایک مکمل دائرے کو ایک ٹوٹے ہوئے قوس سے۔ خود افلاطون کا
خیال تھا کہ ایک اعلیٰ ترین تخیل کیلئے پیشتر اس سے کہ قلب پر روشنی کی طرح وقتاً فوقتاً
اُسکی جھلک محسوس ہو اسبات کی ضرورت ہوتی ہے کہ طبیعت اشیاء مادی کے مشاہدہ
وادراک سے قوت پا چکی ہو۔ پس جو اعلیٰ مضامین پیرکلیس نے اپنی تقریر میں بیان
کئے ہیں اگر اُنکی تائید میں اُسکے زمانے کی ایسی ہی اعلیٰ درجے کی یادگاریں آج موجود
نہ بھی ہوتیں تو بھی ایتھنز کی عمومی حکومت کی خوبیاں سمجھنے میں محض اس تقریر سے
پوری مدد مل سکتی تھی۔ یہ نتیجہ جیسا کہ میں ثابت کرنیکی امید رکھتا ہوں نہ صرف
ایک منطقی دلیل پر بلکہ بہت دقیق تحقیقات کی پختہ شہادت پر مبنی ہے۔

پیرکلیس نے اپنی تقریر میں کہا "یہ سچ ہے کہ ہماری حیثیت ایک حکومت
عمومی (ڈیموکریسی) کی ہے کیونکہ سلطنت کا انتظام چند لوگوں کے سپرد نہیں بلکہ بہت
لوگوں کے سپرد ہے۔ ہمارا قانون سب لوگوں میں اُنکے خانگی نزاعات کے متعلق برابر
درجے کا انصاف کرتا ہے لیکن خاص قابلیت کے لوگوں کے حقوق بھی ملحوظ رہتے
ہیں۔ اور جب کوئی شہری خاص لیاقت کسی چیز میں دکھاتا ہے تو اسکو سرکاری
ملازمت دیجاتی ہے اور یہ ملازمت کسی رعایت کیوجہ سے نہیں دیجاتی بلکہ محض اسکی
لیاقت کا صلہ ہوتی ہے۔ اسی طرح مفلسی بھی کسی کے حق میں حارج نہیں ہوتی۔
کوئی شخص کیسا ہی حالت گمنامی میں ہو لیکن اگر اُس میں کوئی خاص لیاقت ہے تو
ملک کو فائدہ پہنچانے کا موقع اسکو حاصل ہوتا ہے۔ ہم اپنی عمومی زندگی میں باہمی
اجنبیت نہیں رکھتے۔ اور نہ خانگی زندگی و تعلقات میں ایک دوسرے سے بدگمان
ہوتے ہیں۔ اور اگر ہمارا ہمسایہ جو کچھ اُسکے جی میں آتا ہے وہ ہی کرتا ہے تو ہم
اسپر غصہ نہیں کرتے۔ ہم اُسکو پیشانی پر بل ڈالکر نہیں دیکھتے۔ گو یہ بل بے ضرر
ہوتے ہیں لیکن طبیعت کو بے لطف ضرور کرتے ہیں۔ پس جسطرح خانگی رسم و ملاقات میں

ہم پر کوئی روک ٹوک نہیں اُسیطرح ہمارے قومی کاموں میں بزرگوں کا پاس وادب
ملحوظ رہتا ہے ۔ حاکموں کی عزت اور قانون کی پابندی ہمکو ناروا باتیں کرنے سے (۴۷)
روکتی ہے اور ایسے قوانین کی پابندی کا جو آفت رسیدہ لوگوں کی حفاظت کیلیئے
ہوں یا جو قوانین کبھی ضبط تحریر میں نہ آئے ہوں اور جنکے خلاف عمل کرنیوالے
کو سب لوگ دل میں بالعموم برا سمجھیں ہم خاص طور پر لحاظ کرتے ہیں ...... دولت کو
ہم اپنی تعلی اور نمود کیلیئے کام میں نہیں لاتے ۔ بلکہ ایسی جگہ کام میں لاتے ہیں جہاں اُسکا
صرف کرنا واقعی مفید ہوتا ہے ۔ اپنی مفلسی کا اقرار کرنا ہم میں کوئی بے عزتی کی
بات نہیں سمجھی جاتی بلکہ اصل بے عزتی اسمیں سمجھی جاتی ہے کہ مفلسی سے بچنے کے لیئے
کچھ نہ کیا جاوے ۔ ایتھنز کا کوئی شہری اس وجہ سے کہ اُسکو اپنے گھر کے کام
بھی دیکھنے ہوتے ہیں ریاست کے کاموں سے غافل نہیں ہوتا ۔ اور ہم میں وہ لوگ
بھی جو کسی پیشے یا کام میں مصروف رہتے ہیں سیاسیات کو کافی طور پر سمجھتے ہیں ۔
یہ ہم ہی ہیں کہ جو شخص معاملات جمہور میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو اُسکو بے ضرر نہیں بلکہ
بیکار سمجھتے ہیں گو ہم میں حکمت عملی کے موجد بہت کم ہوں مگر اُسکو صحیح طور پر پرکھنا
ہم سب جانتے ہیں ۔ ہماری رائے میں عمل کیلیئے بحث و مباحثہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں
لیکن ایسی باتوں سے لاعلم رہنا جو عمل سے پہلے بحث و مباحثہ سے معلوم ہوا کرتی ہیں
سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے ۔ کیونکہ ہم میں ایک خاص قابلیت عمل سے پہلے فکر
کرنے اور پھر عمل کرنیکی ہے ...... اور ہم اس بات کو بھی نہیں بھولے کہ محنت و مشقت
کے بعد خستگی و ماندگی رفع کرنے کیلیئے تفریح کے بہت سے سامان مہیا کریں ۔ ہمارے
ہاں بارہ مہینے اپنے اپنے وقت پر کھیل تماشے اور تہوار ہوتے رہتے ہیں ۔ گھر میں
ہمارا طرز معاشرت نفیس و پاکیزہ ہے ۔ اور جو خوشی رات دن ہم کو اپنے گھر کی چیزوں
سے حاصل ہوتی رہتی ہے وہ ہمارے دلوں سے افسردگی دور کر دیتی ہے ۔ چونکہ
ہمارے شہر کو شہرت و بزرگی حاصل ہو چکی ہے اسلیئے کل روئے زمین کی پیداوار
اسمیں کھچی چلی آتی ہے ۔ اسلیئے ہم دوسرے ملکوں کے بنائے ہوئے سامان سے
بھی اُسیطرح لطف اٹھاتے ہیں جیسے اپنے ملک کی چیزوں سے ...... خوبصورتی پر (۴۸)
ہم جان دیتے ہیں ۔ لیکن ہمارے مذاق میں سادگی ہے ۔ ہم اپنے مذاق میں

ایک حسن پیدا کرتے ہیں لیکن مردانگی کو ہاتھ سے نہیں دیتے ...... خلاصہ یہ کہ ہمارا شہر ایتھنز تمام ہیلاس (یونان) کا تعلیم و تربیت گاہ ہے۔ اور ہر ایتھنزی کی طبیعت میں یہ مادہ موجود ہے کہ وہ مختلف قسم کے کاموں میں مختلف قسم کی قابلیتوں کے ساتھ نہایت حسن لیاقت سے مصروف ہو۔ اس خیال کو کوئی فضول یا طرفداری کی بات نہ سمجھا جاوے۔ بلکہ یہ خیال بالکل درست اور ایک صحیح واقعہ ہے۔ اور اسکے اظہار کی تصدیق اس اعلیٰ درجے اور مرتبے سے ہوتی ہے جو ان قابلیتوں کی وجہ سے ایتھنز کی ریاست کو حاصل ہوئے ہیں......... اور یہ نہیں ہے کہ اس خیال کی تصدیق کیلیئے ہمارے پاس شہادت موجود نہیں۔ ہمارے پاس اپنی قوت وسطوت کی وہ عظیم الشان یادگاریں موجود ہیں جو ہمکو اور ہمارے کاموں کو موجودہ اور آیندہ نسلوں میں عجائبات روزگار سے بتائینگی۔ ہمکو شاعر ہومر کی تعریفوں کی ضرورت نہیں اور نہ ہم کسی اور مدح خواں کی تعریف وثنا کے محتاج ہیں جس کا کلام تھوڑی دیر کے لیئے سب کو خوش کر دے مگر واقعات کا اظہار اس طرح ہو کہ وہ حقیقت کی روشنی میں نہ ٹھہر سکیں۔ کیونکہ ہم نے تمام بحر و بر کو مجبور کر دیا ہے کہ ہماری شجاعت کیلیئے ایک راستہ کھلا رکھے۔ اور ہر جگہ ہم نے اپنی دوستی یا دشمنی کی نہ مٹنے والی یادگاریں قائم کر دی ہیں"۔

فخر و نازش کے یہ بڑے بڑے دعوے تھے جو ایتھنز کے اس نامور مدبّر کو تھے۔ فنون کے متعلق بجز اس کمال کا ذکر کرنے کے جو شہنشاہی کی یادگاروں سے ظاہر تھا ایک لفظ نہیں کہا۔ موسیقی اور ڈراما کی طرف صرف جسمانی ورزشوں کے تذکرے میں اشارہ کیا۔ وہ بھی اس سلسلے میں کہ رنج و محنت کے بعد یہ چیزیں لوگوں کے لیئے ایک ذریعہ راحت و تفریح کا ہیں۔ تقریر کرنے والے کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ وہ حکومت عمومی (ڈیموکریسی) کے متعلق کوئی معذرت پیش کرتا وہ تو شہنشاہی پر فخر و ناز کرتا تھا۔ افلاطون نے پیرکلیس پر اعتراض کیا تھا کہ اسنے بجائے انصاف و حق پرستی کے ایتھنز کے شہر کو سوداگروں اور دکانداروں (۴۹) جہازوں اور جہازی کارخانوں اور ایسی ہی دیگر لغویات سے بھر دیا ہے۔ افلاطون جو پیرکلیس کی موت کے ایک سال بعد پیدا ہوا تھا اور جسنے ایتھنزیوں کی آیندہ

ایک پشت کے اعلیٰ تخیلات کا پہلے ہی سے ایک ہیولےٰ قائم کرکے اسکو ظاہر بھی کر دیا تھا اگر پیرک لیس کا ہم زمانہ ہوتا اور ایلی سی ام میں پیرک لیس کو افلاطون سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو وہ اس حکیم کے اعتراضات کو حقارت کی نظر سے دیکھکر آنکی طرف ذرا بھی توجہ نکرتا۔

اب میں پیرک لیس کی تقریر تعزیت کو پیش نظر رکھکر اس موقع پر اُن اصولوں اور دستوروں کو بتانا چاہتا ہوں جنکی وجہ سے عہد پیرک لیس کی حکومت عمومیہ (ڈیموکریسی) اور شہنشاہیت کے اصول واقعات کی صورت میں تبدیل کر دیئے گئے۔

ایتھنز میں کامل اختیارات حکومت دو جماعتوں کے ہاتھ میں تھے۔ ایک اکلیسیا یعنی مجلس عموم اور دوسرے ہیلیا یعنی جمہور کی عدالتہائے قانونی۔ ہیلیا اپنے اہل جیوری سے متوقع رہتی تھی کہ وہ اچھی حالت کے شہری ہوں۔ لیکن ہر سال وہ شہریوں کی ایک خاص تیار کردہ فہرست سے جس میں ۶۰۰۰ آدمیوں کے نام درج ہوتے تھے حسب ضرورت ایک تعداد اہل جیوری کی مقرر کرتی تھی۔ اسیطرح ۵۰۰۰۰ شہریوں میں سے جو اکلیسیا میں بیٹھ سکتے تھے ۶۰۰۰ شہریوں کی حاضری سے اگر کورم کی ضرورت ہو تو کورم بن سکتا تھا۔ بالعموم اس سے بھی کم تعداد میں لوگ جلسوں میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اکلیسیا کے اجلاس یا تو شہر میں ہوتے تھے یا بندرگاہ پر اسلیئے زیادہ تر شہر کے لوگ جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اکلیسیا کے مقررہ اجلاس ایک ماہ میں چار مرتبہ ہوتے تھے۔ لیکن انکے علاوہ بھی یہ اجلاس سپہ سالاروں (جرنیلوں) اور کونسل کی خواہش پر مقرر کیئے جا سکتے تھے۔ سال میں ہر ایک دن کے لیئے ایسی تاریخیں چھوڑ کر جن میں کوئی تہوار ہو یا اکلیسیا کے اجلاس کے لیئے پہلے سے کوئی تاریخ مقرر کر دیگئی ہو ہر عدالت کو اہل جیوری کی ایک فہرست دیجاتی تھی ان فہرستوں میں اہل جیوری کی تعداد مختلف ہوتی تھی یعنی ۴۰۱ سے لیکر ۱۰۰۱ تک اہل (۵۰) جیوری کے نام اسمیں درج ہوتے تھے۔ بالعموم کم مقدور یا بڈھے آدمی جو زیادہ محنت کے قابل نہ ہوتے تھے فی یوم ۲ اوبل[1] کے معاوضے پر چھ ہزار اہل جیوری والی فہرست میں اپنا نام لکھوانے پر تیار ہو جاتے تھے۔

ہیلیا اور اکلیسیا کے درمیان وہ ہی کام تقسیم تھے جو آجکل کسی سلطنت میں ایک پارلیمنٹ کو کرنے پڑتے ہیں۔ وضع قوانین کا کام انہی دو جماعتوں کے مشترکہ

[1] ۲ اوبل ڈیڑھ پیسے کے برابر تھا جسکو آجکل ۲ر کے برابر قیمت میں سمجھنا چاہیئے۔

عمل سے ممکن تھا۔ انتظامی صیغے کے فرامین جنکے ذریعے سے اکلیسیا عموم کے معاملات کا فیصلہ کرتی تھی اور جو عدالتی قوانین سے محض ضابطے کا فرق رکھتے تھے ایسے ہوتے تھے کہ اُنکی تعمیل لوگوں کی تحریک پر ملتوی ہو سکتی تھی۔ اگر ہیلیا نے اُن فرامین کا آئینی طریقے پر درست ہونا یا افادۂ عام کی غرض سے اُنکا اجرا ضروری قرار دیا تو پھر یہ فرامین قطعی تصور کیئے جاتے تھے جو لوگ قانونی عدالتوں میں جیوری بنکر بیٹھتے تھے وہ شہر کے اُنہی لوگوں سے ہوتے تھے جو اکلیسیا میں رائے دینے کیلیئے بیٹھتے تھے لیکن فصلِ مقدمات یا انتظامی فرامین پر غور کرنے کیلیئے اُنکا جمع ہونا محض بحث و اتفاق پر منحصر تھا۔ یعنی اُن کاموں کیلیئے قرعہ کے ذریعے سے اُنکا انتخاب ہوتا تھا۔ یہ نہ تھا کہ مقدمات یا انتظامی معاملات میں اُنکے ذاتی تعلق کا لحاظ کرکے اُنکو جمع کیا جاتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھیئے کہ اکلیسیا میں جسطرح لوگ پہلے سے فریق بندی کرکے بیٹھتے تھے ہیلیا میں ایسا نہ ہوتا تھا۔ یہ امر کہ اہلِ جیوری کسی مقدمے کے تصفیے کیلیئے قرعہ کے ذریعے سے منتخب کیئے جاتے تھے اور جس مقدمہ یا معاملہ کا اُنکو فیصلہ کرنا ہوتا تھا اسکی نسبت پہلے سے وہ کوئی رائے نہ رکھتے تھے اور اُنکے فیصلوں میں بہت تعویق ہوتی تھی ایک طور پر سب مفید باتیں تھیں۔ یعنی کسی معاملہ میں اتفاقیہ کثرت رائے ہو جانے سے جو خطرات ایک حکومت کو پیش آسکتے ہیں اُن سے ایتھنز کی حکومت محفوظ تھی۔ کیونکہ یہ اتفاقیہ کثرت رائے کہنے کو تو کثرت رائے ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ کل قوم میں سے بہت ہی چند لوگوں کی رائے ہوتی ہے۔ ایتھنز میں اس قسم کی کوئی بات نہ تھی کہ محض ایک ووٹ کی زیادتی سے بحث طلب معاملات کا قطعی تصفیہ ہو جاوے۔

ہیلیا کو ایک اور معاملے میں اختیار کامل حاصل تھا۔ یعنی عاملوں (مجسٹریٹوں) اور ارکین اکلیسیا کی نگرانی کا اختیار تھا کہ اُنکا طریق عمل قانون کے مطابق ہے یا نہیں اور یہ کہ اُنھوں نے زمانۂ ملازمت میں ایمانداری سے کام کیا ہے یا نہیں۔ انتظامی صیغوں میں جسقدر لوگ ملازم ہوتے تھے وہ اپنے کاموں کے جوابدہ ایتھنزیوں کی مجلس عام (اکلیسیا) کے سامنے ہوتے تھے جنکا ہر ایک رکن حلف لیکر مجلس میں شامل کیا جاتا تھا۔ اکلیسیا کو یہ حق بھی تھا کہ جن حکام کو (۵۱)

اختیارات تمیزی دیئے گئے تھے اگر انھوں نے ایسے اختیارات کو بُری طرح استعمال کیا ہے تو ان پر الزام عائد کرے اور انکو ملازمت سے برطرف کر دے ۔
ہیلیا کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ شہریوں کے باہمی مقدمات اور ایسے مقدمات جنمیں ایک فریق مقدمہ سلطنت ہو فیصلہ کیا کرے ۔ آگے چلکر ہمکو معلوم ہوگا کہ اس عدالت کے اختیارات اس درجے وسیع تھے کہ اسکو اینھنز کی تمام محکوم ریاستوں پر سیاسی اختیارات بھی حاصل ہو گئے تھے ۔
اگر اکلیسیا ایک قوت متحرکہ تھی تو ہیلیا اس قوت کی روکنے والی تھی۔ اینھنزیوں کا مقصد یہ تھا کہ معاملات سیاست کے متعلق جسقدر فیصلے صادر ہوں اُن پر پہلے اکلیسیا میں پوری بحث ہو چکی ہو ۔ بہرکیف یہ ظاہر تھا کہ جس مجلس میں پانچ ہزار سے لیکر پچاس ہزار تک آدمی ہوں وہ ہر ایک معاملہ کو جو اسکے سامنے پیش ہوگا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا فیصلہ کرنے میں بہت ہی عرصہ لگائیگی اور یہ التوا سخت نقصان کا موجب ہو سکتا تھا ۔ یا اگر اکلیسیا نے صرف اہم معاملات کو اپنے غور کیلیئے رکھا اور یہ معاملات اسکے سامنے بغیر اسکے کہ پہلے سے واقعات کی جانچ و ترتیب کر دی جائے پیش ہوئے تو بھی انکے فیصلہ میں بہت عرصہ ہو سکتا تھا ۔ آجکل کی عمومی حکومتوں میں جو خرابیاں ہوتی ہیں وہ زیادہ تر اسیوجہ سے ہوتی ہیں کہ جن لوگوں کا کام کسی معاملہ کو پہلے خود چھان بین کر کے عموم کی رائے کیلیئے پیش کرنے کا ہے وہ غاصب بنکر بہت سے اختیارات خود اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں ۔ اینھنز کو بھی اس خطرہ کا تدارک کرنا پڑا تھا ۔ چنانچہ اینھنز میں عمومیت کے سب سے پہلے قاعدہ کلائس تھینز نے عمومیت کیلیئے ایک عجیب و غریب مشورہ دینے والی جماعت پیدا کی جسکا کام یہ تھا کہ ہمیشہ اہم معاملات پر پہلے سے غور و فکر کر کے ان کو عموم کے فیصلہ کیلیئے پیش کرے ۔ یہ جماعت پانچسو مشیروں کی کونسل تھی ۔
یہ پانچسو آدمیوں کی کونسل ہر سال مقرر کیجاتی تھی ۔ اور ایک چھوٹے پیمانے پر بالکل مجلس عموم (اکلیسیا) کا نمونہ ہوتی تھی ۔ اور اسی مجلس عموم کی مدد کے لیئے وہ قائم کیجاتی تھی ۔ اٹیکا کے علاقہ میں سو یا سو سے کچھ زائد شہر اور حلقے تھے ۔ ان میں ہر شہر اور حلقے سے تیس برس سے کم عمر کے لوگوں کو یا ایسے لوگوں کو

چھوڑ کر جو کونسل میں دو مرتبہ مقرر ہو کر اپنی مدّت ملازمت گزار چکے تھے باقی آبادی
سے قرعہ ڈالکر اس کونسل کیلئے مشیر ایسی تعداد میں منتخب کیئے جاتے تھے جو ہر شہر اور
حلقے میں اُسکی آبادی کے لحاظ سے پہلے ہی سے مقرر ہو چکی ہو۔ اسطرح ہر سال ڈھائی
سو سے پانچسو تک بالکل نئے اور ناتجربہ کار لوگ اس کونسل میں شریک ہو جاتے
تھے۔ وہ بھی کسی خاص لیاقت یا اپنی خواہش سے نہیں بلکہ صرف اتفاق سے۔ کیونکہ
انتخاب قرعہ کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ پس یہ کہنا چاہیئے کہ اٹھارہ برس سے زائد
اور بیس برس سے کم عمر لوگوں کو چھوڑ کر اٹیکا کی کوئی جماعت یا فرقہ یا پیشہ ایسا
نہ تھا جسکا استحضار پورے طور پر کونسل میں نہ ہو جاتا ہو اور چونکہ اکلیسیا میں شریک ہونے
والے بھی یہی لوگ ہوتے تھے اسلیئے بالعموم یہ مان لیا گیا تھا کہ کونسل اور اکلیسیا میں
ہر ایک مسئلہ کو جو پیش ہو وہ ایک ہی نظر سے دیکھینگی۔ کونسل میں اراکین کونسل کے
جو کچھ اختیارات ہوتے تھے وہ تھوڑی مدت کیلئے ہوتے تھے۔ مگر اکلیسیا میں
جو حقوق انکو حاصل تھے وہ مدّت العمر کیلئے تھے۔ ایسی صورت میں اگر کونسل
اپنے ممبروں کے چند روزہ اختیارات کی پرداخت یا حمایت اسطور پر کرتی جس
سے اُنکے دائمی حقوق میں جو اکلیسیا میں انکو حاصل تھے کوئی نقصان آتا تو کونسل
کی طرف سے اپنے ہی ممبروں کے حق میں یہ ایک بدسلوکی ہو جاتی۔ یعنی دوسرے
لفظوں میں یہ مان لیا گیا تھا کہ کونسل جہاں تک اُسکی لیاقت میں ہوگا اکلیسیا کے
سامنے جو کچھ کام رکھیگی اُسکو پہلے خود اچھی طرح سوچ سمجھ لیگی اور کام بھی کافی
مقدار میں پیش کریگی۔ ورنہ ختم سال پر اراکین کونسل کی خبر لینے کو عدالتیں (ہیلیا)
تیار ہو جائینگی۔

اس میں شک نہیں کہ پانچسو مشیروں کی کونسل کا چلانا بہ نسبت پانچ ہزار
مشیروں کی مجلس کے آسان ہوا ہوگا مگر یہ آسانی کچھ زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ کلائس تھینز نے
اس دشواری کو دیکھ لیا تھا اور پانچسو مشیروں کی کونسل کے دس حصّے کر دیئے
تھے۔ ہر حصّے کا نام پرائیٹنی اور ہر پرائیٹنی میں مشیروں کی تعداد پچاس رکھی
(۵۲) تھی۔ یہ پچاس مشیر پوری پانچسو کی کونسل کی جانب سے سال میں ۳۶ دن کام کرتے
تھے۔ کسی پرائیٹنی کی باری کب آئے اسکا فیصلہ وقت آنے سے پہلے قرعہ کے

ذریعے سے بہت جلد کر دیا جاتا تھا۔ جسطرح کونسل اکلیسیا کا ایک چھوٹا نمونہ تھی اسیطرح پرائیٹینی کونسل کا ایک مختصر نمونہ تھی۔ اب جہانتک جلد ممکن ہوتا تھا ان پچاس مشیروں میں سے قرعہ ڈالکر ایک مشیر صدر مجلس مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ صدر صرف ایک دن اور ایک رات کے لیئے صدر ہوتا تھا۔ اور ایک تہائی مشیروں کے ساتھ کونسل کے مکان میں برابر ۲۴ گھنٹوں تک جسکے لیئے وہ صدر مقرر ہوتا تھا حاضر رہتا تھا۔ اس قلیل مدت میں وہ کونسل کی صدارت بھی کرتا تھا اور اگر اکلیسیا کا کوئی اجلاس اس دن ہوا تو اسکا صدر بھی وہ ہی ہوجاتا تھا۔ یہ قاعدہ کلائس تھینز نے اس خیال سے رکھا تھا کہ جب پہلے سے کسی کو علم نہ ہوگا کہ فلاں دن کونسا مشیر صدر نشین ہوگا تو پھر کونسل اور اکلیسیا دونوں کو ان خطروں کا سامنا نہ ہوسکیگا جو سازشوں اور فرقہ بندیوں اور طرح طرح کی چالوں وچالاکیوں سے عموم کی رائے میں رخنہ اندازی کیلیئے پیش آتے رہتے ہیں۔ مگر کلائس تھینز کی یہ غلطی ثابت ہوئی۔ کیونکہ آئندہ زمانہ کی حکومت عمومیہ کو مزید احتیاط کیلیئے ایک نیا طریقہ اختیار کرنا پڑا اور وہ یہ تھا کہ جب کونسل اور اکلیسیا اجلاس کریں تو صدر اپنی خدمت صدارت کو کونسل کی کسی ایسی پرائیٹینی کے ۹ ممبروں کے سپرد کردے جو اسوقت بحیثیت پرائیٹینی کام نہ کرتے ہوں اور جو قرعہ کے ذریعے سے منتخب ہوئے ہوں ان ممبروں میں سے ایک ممبر کو قرعہ ڈالکر اسلیئے منتخب کیا جاتا تھا کہ تحریکیں پیش کرنے اور انکے متعلق جسقدر موافق یا مخالف رائیں حاصل ہوں انکا اعلان کرنے کی عزت وجوابدہی اسکے ذمہ کیجائے۔

غرض کہ اکلیسیا کے سامنے فیصلے کیلیئے وہ ہی تحریکیں پیش ہوسکتی تھیں جن کی ابتدا اسیطرح کی منضبطہ کونسل سے ہوئی ہو۔ اکلیسیا میں ان تحریکوں پر یا تو علیحدہ علیحدہ بحث ہوکر ان کو ترمیم یا منظور یا منسوخ یا واپس کیا جاتا تھا یا دوران بحث میں ایسا حکم دینا بھی ممکن تھا کہ موجودہ تحریک کی جگہ کوئی دوسری تحریک پیش کیجاوے یا اجلاس آئندہ پر کوئی ایسی تحریک پیش کیجاوے جسکو موجودہ معاملہ سے کچھ بھی تعلق نہ ہو۔ (۵۴)

بہرکیف ایتھنز کے لوگوں کا منشاء ہمیشہ یہی رہا کہ اکلیسیا تمام ایسے امور پر جن پر وہ غور کرنا چاہے غور کرنے کا اختیار رکھے۔

ریاست کا داخلی انتظام متعدد کمیٹیوں کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ اور ہر کمیٹی میں

بالعموم دس ممبر ہوتے تھے۔ یہ کمیٹیاں اکلیسیا کی ہدایت سے اور کونسل کی نگرانی میں کام کرتی تھیں۔ اور اس صورت میں کونسل کو اکلیسیا کی جانب سے جسکا وہ مختصر نمونہ تھی کمیٹیوں پر اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ ارسطاطالیس نے اپنی کتاب "دستور ایتھنزیان" میں اس قسم کی پچیس کمیٹیوں کا ذکر کرکے انکے فرائض منصب بیان کیئے ہیں اور لکھا ہے کہ تقریباً سات سو مشیر ایسے ہوتے تھے جو ہر سال ریاست کے داخلی انتظام پر مامور ہوتے تھے۔ ہر ایک کمیٹی کے متعلق جسقدر کام تھے انکی صراحت قانون میں کردیگئی تھی۔ ان میں روزمرہ کے معمولی معاملات جو تصفیہ کیلیئے پیش ہوتے شامل تھے۔ یہ تمام کمیٹیاں کونسل کی نگرانی میں اسطرح رہتی تھیں گویا سب کی سب معائنہ کیلیئے اکہری صف باندھے سامنے کھڑی ہیں۔ اگر صورت یہ نہ ہوتی اور کمیٹیاں کئی کئی صفوں میں ایک کے پیچھے ایک اس ترتیب سے ہوتیں کہ پیچھے کی کمیٹی آگے کی کمیٹی کے ماتحت ہوتی تو کونسل کو صرف چند زیادہ اختیار رکھنے والی کمیٹیوں سے واسطہ ہوتا۔ مگر ایسی زیادہ اختیار رکھنے والی کمیٹیوں کو قابو میں رکھنا ناتجربہ کار مشیران کونسل کیلیئے غیر ممکن ہوجاتا۔ علاوہ اسکے جبکہ کونسل کے مشیر اکلیسیا کی جانب سے مختار کار ہوتے تھے اور اکلیسیا کے احکام کی تعمیل بھی ان پر فرض ہوتی تھی اور اس حیثیت سے وہ ہر مہینے عاملوں (مجسٹریٹوں) سے انکی کارگذاری کا مطالبہ بھی کرسکتے تھے تو پھر یہ امر اصول عمومیت کے خلاف
تھا کہ شہر والوں کی ایک جماعت ایک قسم کی حکومتی کام پر مامور ہوکر شہر والوں کی (۵۵)
دوسری جماعت پر جو عارضی طور پر چند روزہ مدت کیلیئے عموم کے متعلق خدمت ادا کررہی ہے بالادستی حاصل رکھے۔ اگرچہ تمام انتظامی کمیٹیاں اسطرح پر ایک ہی سطح پر تھیں اور صرف کونسل کو اپنا منتظم و نگران مانتی تھیں لیکن جو کام ان کے ذمے ہوتے تھے وہ ایک ہی درجہ اور نوعیت کے نہ ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کام خاکروبوں کی داروغائی سے لیکر مذہبی تہوار دائونیسیا کے انتظام و اہتمام تک ہوتے تھے۔

تمام کمیٹیاں ہر سال نئی قائم کیجاتی تھیں۔ کوئی شخص اپنی زندگی میں دو مرتبہ کسی کمیٹی کا ممبر نہیں ہوسکتا تھا۔ جب انکا سال خدمت ختم ہوجاتا تھا تو اسکو اپنے کام کے متعلق پہلے تو ایک کمیٹی کے سامنے جو مطالبہ کی غرض سے خاص طور پر مقرر

ہوتی تھی اور پھر عدالتہائے قانونی کے سامنے نہایت تفصیل سے ذرا ذرا سی بات کا حساب
دینا ہوتا تھا۔ ایتھنز میں سرکاری عہدہ کا ملنا بہت آسان تھا لیکن عزت و آبرو کے ساتھ
اس سے علحدہ ہونا نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ ہر ایک کمیٹی کیلئے قرعہ ڈالکر جسقدر ممبروں کی
ضرورت ہوتی تھی انکو ایسے شہریوں سے مقرر کیا جاتا تھا جنکی عمر تیس برس کی ہو یا اگر اس
سے زیادہ عمر کے ہوں تو وہ پہلے کسی عہدہ پر رہ کر کمیٹی کی ممبری سے محروم نہ ہوگئے ہوں۔
اس طریقے سے اس خیال کو کہ ریاست کے کام کیلئے شہر کے سب رہنے والے ایک ہی سی
لیاقت رکھتے ہیں ایک عملی صورت بخشی گئی تھی۔ اور ہر قسم کے عہدہ پر ہر سال ایک جماعت
ایسے چند لوگوں کی مقرر کردیجاتی تھی جو بالکل نئے اور بالعموم ناتجربہ کار ہوتے تھے۔

ارسطاطالیس نے جہاں حکومتوں کے دستور یا ساخت و وضع کی تعریف بیان کی ہے
وہاں ایک عمدہ حکومت عمومیہ کیلئے یہ ضروری شرط قرار دی ہے کہ اسکے تمام شہر والوں
کو باری باری سے حکومتی عہدے دیئے جاویں۔ اس اصول کے مطابق یہ قیاس ہو سکتا (۵٦)
ہے کہ ایتھنز میں حکومتی عہدوں کی تعداد ایسے شہر والوں کی تعداد سے جو ہر سال
تیس برس کی عمر کو پہنچتے ہونگے تقریبًا مطابقت رکھتی ہوگی۔ لیکن صورت یہ نہ تھی۔ اگر
ہم فرض بھی کرلیں کہ لوگ کونسل میں صرف ایک مرتبہ مشیر ہو سکتے تھے اور مدت العمر میں
صرف ایکمرتبہ مجسٹریٹی کا عہدہ پا سکتے تھے تو پھر ہمکو سات سو شہنشاہی عہدوں میں سے
چند عہدوں کو اپنے اس حساب میں شامل کرنا ہوگا اور انکی نسبت بھی یہ خیال کرنا ہوگا
کہ مدت ملازمت کے بارے میں انکی شرائط بھی وہی تھیں جو داخلی انتظام کے عہدوں کی
تھیں تاکہ تقریبًا تیرہ سو کی مطلوبہ تعداد پوری ہو جاوے۔ لیکن اس قسم کے مفروضات
قدرتی طور پر فرض کرنے کے قابل نہیں اور نہ ان سے کوئی صحیح نتیجہ نکل سکتا ہے۔ لیکن یہ
فرض کرنا قرین عقل ہے کہ ایتھنز کے باشندوں میں سے زیادہ تر لوگوں کو یا بالخصوص ان
لوگوں میں سے سب کو جو اکلیسیا کے جلسوں میں شریک ہوتے رہتے تھے کوئی نہ کوئی دیہی
یا شہری انتظام کا عہدہ کم سے کم جوانی میں ملجاتا ہوگا۔ پھر جب زیادہ عمر ہوتی ہوگی تو کونسل
میں مشیر کی جگہ یا داخلی انتظام میں کوئی عہدہ ملجاتا ہوگا۔ اور جب بڈھے ہوتے ہوں گے تو
چھ ہزار جیوری والوں کی فہرست میں انکا نام درج ہو جاتا ہوگا۔ یہاں اسبات کو یاد رکھنا
چاہیئے کہ کونسل کے پانچ سو مشیروں میں سے تین سو ساٹھ آدمی ایسے ہوتے تھے جو پرائیوٹ

یا کونسل یعنی پچاس یا پانچ سو لوگوں کی مجلس میں صدر نشینی کر چکے ہوتے تھے اور اگر اتفاق ہوا ہوگا تو پانچ ہزار سے لیکر پچاس ہزار آدمیوں کی مجلس یعنی اکلیسیا کی کرسی صدارت پر بھی وہ بیٹھے ہونگے۔ پھر یہ خیال بھی رکھنا چاہیئے کہ مجسٹریٹوں کو صرف اپنے فرائض منصب ہی کا علم نہ رکھنا ہوتا تھا جن میں مقدمات کو ترتیب دیکر جیوری کے سامنے پیش کرتا اور جیوری کی صدر نشینی کرنیکی خدمات شامل تھیں بلکہ اپنے سر رشتہ کا حساب کتاب بھی اسطرح رکھنا پڑتا تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو عدالت کے سامنے اسکو ثابت کر سکیں۔ پھر یہ بھی
(۵۷) یاد رکھنے کی بات ہے کہ جیوری میں مقرر ہونیکی صورت میں مجوّز اور جیوری دونوں حیثیتوں سے انکو ایسے مقدمات میں کام کرنا پڑتا تھا جن میں محض شہر کے لوگ فریق مقدمہ نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض وقت خود شہنشاہی بھی کسی ریاست غیر کے مقابلہ میں فریق ہوتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ صرف لکھنے پڑھنے کا علم جسکا موجود ہونا کلاس تھیٹز کے ہر ایک شہری میں پہلے سے فرض کر لیا گیا تھا وہ پیریکلیس کے زمانے میں زیادہ مدد نہ کر سکتا ہوگا۔ پیریکلیس کے زمانے میں ہر شخص کو آجکل کی ایک پارلیمنٹ کے قواعد کی مثل ضابطے و قانون سے واقفیت رکھنی ضروری ہوتی ہوگی۔ انتظامی معاملات میں اسکو بھی اپنا خیال اسی طرح قائم کرنا پڑتا ہوگا جسطرح ان لوگوں کو قائم کرنا پڑتا تھا جن کے سپرد واقعی حکومت ہوتی ہے۔ ضابطہ اور قانون کا علم بھی اسکو اسقدر رکھنا ضروری ہوتا ہوگا کہ جملہ مسودات قانونی جنکو خود تیار کر کے منظوری کیلئے پیش کرے انکی قانونی صحت کا ذمہ دار ہو سکے۔ اور جسوقت کسی مقدمہ میں مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے حاضر عدالت ہو تو اپنے دعوے یا جواب کو ثابت کر سکے۔ ایتھنز میں یہ بات ضرب المثل تھی کہ "آدمی کی لیاقت کا پتا اُس خدمت اور عہدے سے چل جاتا ہے جو اسکے سپرد کیا جاوے۔" ہمکو یقین ہے کہ ایتھنز کے اکثر لوگ سرکاری عہدوں پر کام کرنے کیلئے پہلے سے تیاری کرتے تھے تاکہ وقت پر وہ نالائق ثابت نہوں۔ کام کے بعد انکو معاملات حکومت میں ایک دقیق نظر پیدا ہو جاتی تھی۔ اس اعتبار سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ ایتھنز میں شہریوں کے اجلاس ایک لحاظ سے تو واقعی ماہرین فن کا مجمع ہوتے تھے۔ اور دوسرے اعتبار سے ان میں انتظام سلطنت کی وہ مہارت جو ایک غیر پیشہ ور میں بہتر سے بہتر ممکن ہو سکتی ہے موجود ہوتی ہوگی جسکا مقابلہ اُس لیاقت اور قابلیت سے

کیا جاسکتا ہے جسکا تذکرہ مسٹر ایچ جی ویلز نے اپنی کتاب میں کیا ہے جسمیں ایک فرضی و خیالی حکومت (یوٹوپیا) کے حالات لکھے گئے ہیں۔

اس نہایت لائق مگر ناتجربہ کار جماعت کیلئے پیرک لیس نے جو کام مقرر کیا تھا وہ یہ تھا کہ غیر معمولی قابلیت کے لوگ جو طرح طرح کے سیاسی مسلک تجویز کریں ان میں سے جو بہتر سے بہتر ہو اسکو وہ اپنا دستور العمل بنائیں۔ اکلیسیا کے پاس جو لوگ کسی فن میں خاص دستگاہ
رکھنے والے تھے ان پر اکلیسیا نے اپنے دروازے بند نہیں کیئے تھے۔ بحری کارخانوں اور اسلحہ (۵۸)
خانوں کی تعمیر و درستی کا اہتمام یا اسی قسم کا کوئی اور کام جسکو کسی خاص فن سے تعلق ہوتا کونسل پر نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ اکلیسیا کو اختیار تھا بلکہ اسکا عمل بھی اسی پر تھا کہ ایسے کام ان لوگوں کے سپرد کرے جنکو ان میں خاص لیاقت و مہارت حاصل ہو۔ اکلیسیا اس وجہ سے اصولی واقع نہیں ہوا تھا کہ کسی مہم میں فوج کی سرداری یا غیر ریاستوں سے امور ملکی میں معاملات طے کرنیکا کام (ڈپلومیسی) جو شخص اتفاق سے وقت پر ملجاتا اسکے سپرد کردیتا۔ بلکہ وہ اپنے افسران سیاسی و فوجی (جرنیلوں) کو خود منتخب کرتا تھا۔ اور اگر ضرورت دیکھتا تو انکی مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد بھی انکا دوبارہ انتخاب کرتا۔ اور انکو خاص اختیارات اکلیسیا کے اجلاس مقرر کرنے کے دیتا۔ اور یہ قاعدہ بھی جاری کرتا کہ سیاسی تحریکیں اولاً ان ہی افسروں کے سامنے پیش ہوں۔ پس اکلیسیا اس امر سے آگاہ تھا کہ ریاستہائے غیر سے معاملات کے تصفیہ کرنے میں جہاں ان ریاستوں کی آمدنی یا اغراض و مقاصد یا خیالات قدیم رسم و رواج سے بحث ہو تو وہاں حقیقت میں یہ کام ایسا دشوار اور نازک ہوجاتا ہے کہ ذرا سی خطا و غلطی سے ناقابل تلافی نقصان پیدا ہوسکتے ہیں اور فی الحقیقت ایسی غلطیاں سابق میں لاعلاج نقصانات کا موجب ہوچکی ہیں۔

غلطی سے بچنے کا سب سے محفوظ طریقہ یہ تھا کہ کسی شخص واحد کو جسکی لیاقت و ذہانت مسلم ہو منتخب کیا جاوے اور سیاسیات میں جو حکمت عملی وہ اختیار کرے سب لوگ سچے دل اور پوری ہمت سے اسکی پابندی کریں۔ پس اکلیسیا حقیقت میں مدبران سلطنت کی مشق و مہارت اور باہمی مقابلے کا ایک دنگل (اگون) تھا۔ ایتھنز کے لوگ مقابلے (کومپیٹیشن) کے بھی بڑے قائل تھے۔ جو لوگ دوسروں سے مقابلہ کرکے اپنی لیاقت دکھانی چاہتے تھے تاکہ فیصلہ کیا جاوے کہ ان میں کون بہتر ہے تو ان کے

اظہار کمال کیلئے مجامع عام میں خاص طور پر بند و بست کیا جاتا تھا تاکہ ہر قسم کے پیشہ اور فن میں کمال پیدا کرنیکی سب کو ترغیب ہو۔ کسقدر قطع کلام ہوتا ہے مگر اینھنز ہی اس مقابلہ کو اسقدر مانتے تھے کہ حال میں ایک قبر کا پتھر زمین سے نکلا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اینھنز کے کمہاروں میں بھی ایک مرتبہ آپس میں مقابلہ ہوا تھا۔ چنانچہ اس پتھر سے ظاہر
(۵۹) ہوتا ہے کہ ایک شخص نے جسکا نام معلوم نہیں ہوسکا بڑی بھاری قسم کھا کر اسبات کا اعلان کیا ہے کہ اٹیکا کے کمہاروں میں اسکی نسبت سب سے بہتر کوزہ گر ہونیکا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اسیطرح غالبًا مصوروں اور بت تراشوں میں مقابلہ ہوتا تھا۔ گھوڑوں کی نسل بڑھانے والوں میں۔ رتھوں اور آدمیوں کی دوڑوں اور ہر قسم کی جسمانی ورزشوں میں ہر عمر کے لوگ مقابلہ کر کے اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ایسے لوگ بھی اپنے فن میں مقابلہ دکھاتے تھے جو گھوڑوں پر سوار ہوکر یا پیدل مشعلیں ہاتھ میں لیکر دوڑتے تھے۔ کونسل کی پرائیٹنی میں یعنی پچاس پچاس ممبروں کی جماعتوں کا بھی جو ایک کے بعد ایک اپنی خدمت پر مامور ہوتی تھیں باہمی مقابلہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سواروں کے دستوں اور پیدل فوجوں میں باہمی مقابلہ ہوتا تھا۔ تہوار جسقدر ہوتے تھے ان میں ہر تہوار پر پانچ طائفے لڑکوں کے اور پانچ طائفے مردوں کے جن میں ہر طائفے میں پچاس پچاس متنفس ہوتے تھے گانے میں مقابلہ کرتے تھے۔ اور اسطرح ایک سال میں ہر تہوار کیلئے پانچسو آدمیوں کو گانے کی تعلیم دیکر اور دس نئے راگ تصنیف کر کے تیاری کرنی پڑتی تھی۔ شاعر ہومر کی نظم پڑھنے والوں میں اور ریطوریقا (خطابت) کے ماہروں میں بھی مقابلہ ہوتا تھا اور تمام مقابلوں سے بڑھکر ٹریجیڈی اور کمیڈی نویس شاعروں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس مقابلہ کیلئے ٹریجیڈی نویس کو سال میں ۱۲ نئے ڈراما تصنیف کرنے پڑتے تھے جنکے تماشے کیلئے ۸۰ اگانے اور ناچنے والوں کی شرکت ضروری تھی۔ کمیڈی نویسوں سے مقابلہ کیلئے ۶ نئے ڈراما اور ۴۴ اگانے اور ناچنے والوں کی شرط تھی۔ آجکل کے مقابلوں میں صرف جسمانی ورزشیں ہوتی ہیں یا اسبات کا مقابلہ کیا جاتا ہے کہ آہن پوش جنگی جہاز کسکے پاس زیادہ ہیں۔ لیکن اینھنز کے لوگوں نے اس مقابلہ کو موسیقی اور باقی تمام فنون میں بھی جاری کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی فن کا ماہر ہو خواہ بت تراش ہو یا مصور یا کسی چیز کا بنانے یا پیدا کرنے والا یا اسکا برتنے اور صرف کرنے والا مگر اسکی طبیعت میں

ایسا صحیح مذاق اُسکے فن میں پیدا کرادیا جاتا تھا جسمیں کہیں کوئی سقم نظر نہ آتا تھا شہنشاہی
کے سو برس کے قیام میں تقریباً دو ہزار ڈراما نہایت شستہ اور پاکیزہ مذاق میں لکھے گئے اور (۶۰)
ایتھنز کے تماشاگاہوں میں دکھائے گئے ۔ اور اسی مدت میں پانچہزار سے لیکر چھ ہزار
تک نئے نئے راگ اور گانے تصنیف ہوکر شائقین کو سنائے گئے ۔ اندازہ کیا گیا ہے
کہ ہر سال دو ہزار سے زیادہ ایتھنز ہی شاعروں کا کلام اور ناٹکوں کی عبارت برزبان
کی جاتی تھی ۔ اور انکے متعلق جو ناچ اور گانے تھے انکی مشق کرائی جاتی تھی ۔ مشق کے
اسقدر عام ہونے سے ظاہر ہے کہ جلسوں میں تماشائیوں میں سے زیادہ تر لوگ ایسے
ہوتے ہونگے جو خود کسی وقت میں نظموں کو برزبان اور ناچ اور گانے کی مشق کرچکے ہونگے
یہ واقعات اس قسم کے ہیں کہ جو طالب علم شعرائے یونان سوفکلیز اور ایرسٹوفانیس کی
تصانیف کو مطالعہ کرتے ہیں انکو چاہیئے کہ وہ ان واقعات کو ہر وقت اپنے ذہن
میں رکھیں ۔

موسیقی یا جسمانی ورزشوں میں اوّل آنے کا صلہ ناموری اور انعام ہوتا تھا ۔
سب سے بڑا مقابلہ اسمیں تھا کہ اکلیسیا میں قوم کی سرداری کسکو ملے ۔ جسطرح یہ مقابلہ
بڑا تھا ویسا ہی اُسکا انعام بھی بڑا تھا ۔ جس شخص کو ایتھنز کے لوگوں نے اسپر اعتماد
کرکے اپنا سردار بنا لیا پھر وہ بادشاہوں سے بھی زیادہ بااختیار ہو جاتا تھا تھیوسیڈائڈیز
لکھتا ہے کہ ”بظاہر ایتھنزیوں کی حکومت عمومی تھی لیکن فی الواقع وہ ایسی حکومت تھی
جسمیں کل نظم حکومت چند لائق سے لائق شہریوں کے اختیار میں ہوتا تھا“ اگر کوئی
شخص ریتھون کی دوڑ میں ہار جاتا تھا تو اسکو آئندہ کسی موقع پر جیتنے کی اُمید ہوسکتی تھی
لیکن سیاسیات کے میدان میں جسکو شکست ہو جاتی تھی پھر اسکی قسمت میں خارج الوطنی
(اوسٹرکزم) کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا ۔ یہ جلاوطنی کسی شخص کی ایسی ہوتی تھی کہ بغیر بے عزتی
یا نقصانِ مال وجائداد کے دس برس کیلیئے اُسکو ملک سے باہر چلا جانا پڑتا تھا ۔ اور
اس طرح اُس شخص کی کارندگی کیلیئے جو اُسکا حریف مقابل ہوتا تھا میدان صاف
ہو جاتا تھا ۔ جلاوطنی کے اس عجیب قاعدہ سے ایتھنزیوں نے دو پشتوں تک اپنی
حکومت کو ان آفات سے بری رکھا جو کونسلوں میں مشیروں کے نزاعات اور کام
میں تاخیر ڈالنوا سے پیدا ہوا کرتی ہیں ۔ یہی جلاوطنی وہ چیز تھی جس نے مسٹاکلیس

(۶۱) کیمون اور پیرک لیس کو بادشاہ بنادیا گو اُن کے سر پر تاج کسی نے نہ رکھا تھا۔ مگر جب ۴۲۹
ق م میں پیرک لیس کا انتقال ہوگیا اور یہ جلا وطنی مطلقاً بے سود ثابت ہونے لگی تو پھر قوم
کے پیشوا جو باہمی نزاع رکھتے تھے کبھی ایتھنز یوں کو ایک طرف گھسیٹ لے جاتے تھے اور کبھی
دوسری طرف۔ حتیٰ کے ایلکی بیاڈیس اور کلیفون کی گمراہ کرنیوالی تدبیروں نے حکومت میں
خرابیاں پیدا کر کے ایتھنز یوں پر یہ الزام ثابت کر دیا کہ ریاستہائے غیر سے تعلقات
رکھنے میں اُنکی عقل سلامت نہیں رہی ہے۔

کسی چیز کو ذہن سے رفع کرنا ایسا دشوار نہیں ہے جیسے کہ ایک غلط خیال کو
جو مدّت سے طبیعت میں خوش اعتقادی کے ساتھ جم گیا ہو۔ یونانیوں کی نسبت یہ خیال
دلوں میں مدّت سے جگہ پاگیا ہے کہ وہ ہر چیز میں کمال کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اُسی میں
یہ خیال بھی مدّت سے شامل ہے کہ اہل ایتھنز کو فنون و ادبیات و حکمت میں تبحّر پیدا
کرنے کیلئے زیادہ تر وقت اسوجہ سے ملتا رہا کہ اُنکے اور جسقدر کام تھے وہ اُن کے
غلام کیا کرتے تھے۔ اور اِن ہی غلاموں کی وجہ سے انکو اتنی فرصت ملی کہ وہ فنِ حکومت
میں کامل دستگاہ پیدا کرلیں۔ لیکن اگر یہ خیال فی الواقع صحیح ہے تو کلیفون کا یہ قول
درست ماننا پڑیگا کہ "رواج غلامی کو اگر اُسکے حقیقی معنوں میں دیکھا جاوے تو دنیا
میں آزاد حکومتوں کی تعمیر کیلئے وہ سب سے مضبوط اور مستحکم زمین تھی۔ اُس خیال میں
سب سے پہلی دروغ بیانی یہ ہے کہ زمانہ اقبالمندی میں اہل ایتھنز جن کا سب سے
بڑا وصف یہ تھا کہ اُن کے قوائے عقلی و جسمانی ہر وقت جنبش میں رہتے تھے ایک تن آسان
اور کاہل وجود قوم سے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو چند لوگ ان میں غلام اور جائداد
تمول کے درجے تک رکھتے تھے وہ بھی اپنے مال و جائداد کا بذاتِ خود انتظام کرتے
تھے۔ غیروں کے بھروسے پر نہ رہتے تھے۔ جو لوگ زراعت پیشہ تھے وہ اپنے
ہاتھ سے کاشتکاری کرتے تھے۔ اور شہر کے لوگوں میں غالباً آبادی کا تہائی حصّہ ایسا
تھا جو اپنی محنت کا پھل دوسروں کے ہاتھ بیچ کر روزی پیدا کرتا تھا۔ اور اسمیں اسوقت
(۶۲) آسانی بھی تھی جبکہ ایتھنز یوں کی شہنشاہی چل رہی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں تجارت
اور ہر قسم کی حرفت کو ایسی تیز رفتاری سے ترقی ہو رہی تھی اور کاریگروں اور مزدوروں
کی مانگ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ مزدوری کو ٹھیک شرح پر رکھنے کیلئے باہر سے

غلاموں کا بھرتی کرنا ضروری ہوگیا تھا اور یونان کے تنگ دست حصّوں سے بھی لوگ محنت و مزدوری کیلئے بکثرت شہر میں آنے لگے تھے۔ ایتھنز میں آکر باہر والوں کی محنت و مزدوری سے وہ ہی کام نکلتا تھا جو آجکل امریکہ میں غیر ملک کے مزدوروں کی درآمد سے نکلتا ہے۔ غرض جب اسطرح کثرت سے غلام اور مزدور باہر سے آنے لگے تو پھر ضرورت ہوئی کہ جو مالی نفع ان سے پہنچتا ہے اسکو برقرار رکھا جاوے۔ اشیاء خوردنی کا سوال بھی رفتہ رفتہ نہایت اہم ہوگیا۔ ایتھنز کے بازاروں میں جسقدر غلّہ فروخت ہوتا تھا اسکا تقریباً نصف حصّہ باہر سے آتا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ وہ کچّا مال آتا تھا جسکی ضرورت ایتھنز کے کاریگروں کو اپنے اپنے کام میں پڑتی تھی۔ ایتھنز کا ایک رئیس ۴۲۰ ق م کے قریب لکھتا ہے کہ "یونانی و غیر یونانی بلاد میں صرف ایتھنز کے لوگوں کو یہ بات نصیب ہے کہ وہ کچّا مال کثرت سے حاصل کریں۔ اسکی صورت یہ ہے کہ کسی ریاست میں اگر جہاز بنانے کی لکڑی اچھی پیدا ہوتی ہے تو اسکو بیچنے کیلئے سوائے ان لوگوں کے ملک کے جو سمندر کے مالک ہوں دوسرا بازار کہاں ملسکتا تھا۔ اسیطرح اگر کسی ریاست میں لوہا یا پیتل یا سن کی رسیاں کثرت سے موجود ہوں تو سوائے سمندر کے مالکوں کے اور کس کے پاس وہ ان چیزوں کو بیچنے کیلئے لیجا سکتی ہے۔ کیونکہ یہی چیزیں وہ تھیں جنسے ایتھنز میں جہاز تیار کیئے جاتے تھے۔ کوئی شہر لوہا اور پیتل کوئی شہر لکڑی کوئی شہر رسیاں اور موم اور ایسی ہی اور چیزیں ایتھنز کو مہیا کرتا تھا۔ اسکے علاوہ ایتھنز نے اپنے حریفوں کو یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر سوائے اٹیکا کے کسی دوسرے ملک کو انھوں نے اس قسم کا مال پہنچایا تو سمندر سے انکو قطعی نکال دیا جائیگا۔

(۶۳) اسمیں شبہ نہیں کہ حکومت نے ایتھنزیوں کے اوقات پر جسقدر قبضہ کر رکھا تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن اتنا زیادہ نہ تھا کہ پیشہ وروں یا کاشتکاروں کو اپنے کام کیلئے کافی وقت میسر نہو۔ اگر ایسے اوقات کا مقابلہ موجودہ حالات سے کیا جاوے تو پھر یہ مضمون بخوبی سمجھ میں آجائیگا۔ اکلیسیا کے اجلاسوں کا اوسط فی ہفتہ ایک سے بھی کم نکلتا تھا۔ اور جو لوگ ان اجلاسوں میں بیٹھ سکتے تھے انکا دسواں حصّہ بھی بالعموم شریک نہوتا تھا۔ پس ان اجلاسوں سے لوگوں کے بنج کے

کام میں جسقدر ہرج ہوتا ہوگا وہ اُس سے زیادہ نہوتا ہوگا جو ہمارے ہاں قانونی تعطیلات
یا ہفتہ کے دن نصف یوم کی تعطیل سے ہوتا ہے۔ مقابلہ کے جلسوں یا مذہبی تہواروں
کی اوسط تعداد فی ہفتہ ایک سے کسیقدر زائد تھی۔ ان میں تماشائیوں کی بالعموم کثرت
ہوتی تھی مگر یہ جسقدر وقت صرف کیا جاتا تھا وہ ہماری اتواروں اور میلوں کے
دنوں کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ مقابلے کیلیئے تیاری میں جو وقت صرف ہوتا ہوگا یعنی
ایسا وقت جسمیں روپیہ پیدا نہیں ہو سکتا تو اُسکو ہمارے زمانے کے ان اوقات کے
برابر سمجھنا چاہیئے جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کی غرض سے صرف کیئے جاتے ہیں۔
اہل ایتھنز کی اعلیٰ جماعتوں میں سے صرف تیسری جماعت کے لوگوں کو ۱۹ سے ۲۰
برس کی عمر میں فوجی تربیت حاصل کرنی ہوتی تھی۔ اتنی ہی عمر میں تمام باشندوں پر
فوجی تربیت کا لازم ہونا جیسا کہ آجکل یورپ میں دستور ہے پیرکلیس کی موت کے
سو برس بعد کا واقعہ ہے۔ مجالس سیاسی میں بحث و مباحثہ اور انتظامی صیغوں کی
ملازمت میں جو وقت شہر کے ہر ایک آدمی کو صرف کرنا پڑتا تھا اُسکی مجموعی تعداد
دو برس کی فرض کیجا سکتی ہے۔ اور اگر اسمیں شہنشاہی خدمات کا زمانہ بھی شامل کردیا
جاوے تو بجائے دو برس کے تین برس سمجھ لینے چاہیئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وقت
کی اس مقدار کا موجودہ زمانے کے حالات سے مقابلہ کیا جاوے تو وہ بہت زیادہ
ہوتی ہے۔ اگر اسی نسبت سے امریکہ کی سلطنت اپنے باشندوں سے کام لے تو
پوسٹ ماسٹروں۔ ڈاکخانہ کے محرروں اور محصول کے جمع کرنے والوں اور ہر قسم کے
تنخواہ دار مزدوروں کو چھوڑ کر بیس یا پچیس لاکھ ملازم حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن
(۶۴) اسطرح مقابلہ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس سے غلط نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایتھنز
کی حکومت کا یہ قاعدہ تھا کہ ایک آدمی کا کام کرنے کیلیئے دس آدمیوں کی کمیٹی مقرر
کیجاتی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ تھا کہ یہ کل آدمی دس حصوں میں نو حصے وقت اپنے نجی کے
کاروبار میں صرف کرنے پر قادر تھے۔ دوران سال میں کونسل اور جیوری کی عدالتیں
جیوری کے برخاست ہونے پر حکومت کو اسبات کا اطمینان دلانے کیلیئے موجود رہتی
تھیں کہ کسی عہدہ دار نے اپنی فرائض عمومی کے انجام دینے میں غفلت نہیں کی۔
یہانتک کہ ساتھ بیٹھنے والوں نے اگر غفلت کرنے کا موقع بھی دیا تو بھی کسی نے غفلت

نہیں کی۔ ایتھنز یوں کا یہ طریقۂ عمل کسی بڑی فضول خرچی کا باعث بھی اسوقت تک نہ تھا جب تک کہ مجسٹریٹوں کو کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ صرف ہرجانہ ملتا تھا جسکی رقم ایک معمولی مزدور کی روزآنہ مزدوری کے برابر ہوتی تھی۔ جیوری میں البتہ زیادہ لوگ بٹھائے جاتے تھے۔ یعنی جہاں ہم صرف ۱۲ آدمیوں کی جیوری مقرر کرتے ہیں وہاں ایتھنز میں چار چار سو بلکہ دو دو ہزار کی جیوری بیٹھتی تھی۔ مگر اسکے ساتھ ایتھنز والوں میں نہ تو بڑی بڑی تنخواہوں کے جج ہوتے تھے اور نہ بھاری بھاری محنتانہ لینے والے وکیل ہوتے تھے۔ انکے عدالتی انتظام میں یہ ساز و سامان مطلق نہ تھا۔ جو لوگ جیوری میں مقرر ہوتے تھے اُن میں ایک آدمی کا حق المحنت بہت ہی قلیل رقم کا ہرجانہ ہوتا تھا جسکا مقابلہ آجکل کے ترقی یافتہ ممالک یورپ میں اُس پنشن کی رقم سے ہوسکتا ہے جو شخص بڑھاپے کی وجہ سے دیجاتی ہے۔

کونسل کے مشیروں یا عدالت کی جیوریوں اور مجسٹریٹوں کو اُنکی خدمت کے معاوضے میں جو رقم بطور ہرجانہ کے ملتی تھی یا تماشا گاہوں اور موسیقی کے جلسوں میں یا استادیون (دوڑ کے مکان) میں شرکت کیلئے جو روپیہ دیا جاتا تھا یہ سب پیرکلیس کی ایجاد سے تھا۔ اس سے اُسکا منشاء یہ نہ تھا کہ تنخواہ دار عہدہ داروں کی ایک جماعت یا مشارکت مال کی کوئی شکل پیدا کرے (جسمیں قوم کی مجموعی دولت اسکے کل افراد میں مساوی تقسیم ہوکر حکومت کی خدمت بلا معاوضہ کیجاوے) پیرکلیس کا منشاء محض سیاسی مساوات کا پیدا کرنا تھا نہ کہ معاشی مساوات کا تاکہ سب لوگ بلا تمیز دولت مند یا عالی مرتبہ ہونیکے ایسے موقعوں پر کام کریں اور ایسی دشواریوں کا مقابلہ کریں جو حکومت عمومی اپنے ساتھ لایا کرتی ہے۔ حکومت عمومی کے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرح جو اُس سے پہلے گذر رہے تھے پیرکلیس بھی یونان کے طبقۂ اعلیٰ سے تھا یعنی نسب اور تربیت دونوں اعتبار سے ذی رتبہ تھا اور اپنے سابقین کی طرح اسکو بھی مطلق شبہ نہ تھا کہ جس تعلیم و تربیت نے اسکے طبقے کو اعلیٰ (۶۵)
درجے پر پہنچایا ہے وہ ہی تعلیم و تربیت عوام کو بھی اونچے درجے پر پہنچا سکتی ہے۔ معمولی پیشہ وروں میں فن حکومت کے متعلق قدیم شرفائے قوم (یوپیٹرد) کی سی عمیق نظر پیدا کرادینی اور اُن میں علم و فضل کے شوق کو ترقی دینی اور اُنکی حرکات

وسکنات میں وہ ہی چستی و خوش ادائی پیدا کر دیتی جو جسمانی ورزشوں سے خود قوم کے شریفوں میں پیدا ہوئی تھی اور اُنکے حافظہ میں ان ہی بلند و پاکیزہ خیالات کو جو شرفاء کے دل و دماغ میں شعراء کے شیریں و خوش نوا کلام سے مانوس رہنے کی وجہ سے حاضر رہتے تھے محفوظ کرا دیتا اور باوجودیکہ وہ محض کاریگر یا پیشہ ور تھے مگر اُن میں اُنکے کام یا پیشہ کے متعلق شوق اور حسن کا صحیح معیار قائم کرا دیتا یہ کل نعمتیں اُن کو بیکار اور تن آسان رکھنے سے کہیں بہتر تھیں ۔ اور یہ سب جتن اسلیئے تھے کہ تمام لوگوں میں ایک ہی سی خوبیاں پیدا کر کے اُنکو ایک بلند خیال اور عالی حوصلہ قوم بنا دیا جائے اور کل قوم نجیبوں اور شریفوں کی قوم ہو جاوے ۔ تعجب کا مقام نہیں کہ ایسے اچھے کام کو ترقی دینے کیلیئے ایتھنز کے بڑے بڑے دولتمند اُسکے تماشاگاہوں اور سرودخانوں ۔ دوڑوں اور ورزشوں کے انتظامات میں مالی اور ذاتی حیثیت سے خود ذمے دار ہو گئے ۔ اسمیں شبہ نہیں کہ اُنکی دولت پر یہ چیزیں ایک بڑا بار تھیں ۔ لیکن جس حالت میں کہ آمدنی اور جائداد پر کوئی محصول نہ تھا تو پھر شخصی فیاضی ایک ضروری فرض اور عاقلانہ حفظ ماتقدم ہو گئی ۔

جب کل قوم شریفوں اور بڑے آدمیوں کی قوم ہو جائے تو پھر وہ ایک پُر تکلف ہستی ہو جاتی ہے ۔ جسکے خرچ و اخراجات کیلیئے کسی نہ کسی کو روپیہ دینا پڑتا ہے ۔ پیرکلیس کا مشہور قول یہ تھا کہ ایتھنز کل یونان کا تعلیم گاہ ہے ۔ اسلیئے یونان کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس تعلیم کیلیئے کچھ جیب سے بھی نکالیں ۔ اُس نے چاہا کہ تمام یونانی ریاستوں کو ایتھنز کا باجگذار حلیف بنا دے ۔ گو اُس کوشش میں اُسکو کامیابی نہیں ہوئی ۔ مگر ایک عمدہ معلم ہونیکی وجہ سے اُسنے یہ قصد مصمم کر لیا (٦٦)
کہ تمام یونانی ریاستیں نہ سہی مگر جو اپنی حفاظت میں آ چکی ہیں اُن پر گرفت کسیطرح ہاتھ سے نہ جائے ۔

اُس کام کیلیئے سمندر پر پوری قدرت رکھنی ضروری تھی ۔ لڑائی میں بحری طاقت رکھنے کیوجہ سے جو بہت سے فائدے ہوتے ہیں منجملہ اُنکے ایک یہ ہے کہ حربی عمل کیلیئے جسقدر رقبے کی ضرورت محسوس ہو اُسکو آسانی سے احاطہ کیا جاسکتا ہے ۔ دوسرے فوجوں کے جمع کرنے اور سامان جنگ کے لانے لیجانے اور خبر رسانی کے کام میں بھی

بہت سہولتیں ہوتی ہیں بحری طاقت کے یہ فوائد شروع شروع میں کلازی وٹزاور کپتان ماہان کا تو کیا ذکر ہے انگریزی صیغہ بحریہ کی بھی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ پیرک لیس کے ایک ہمعصر نے نہایت صاف صاف عبارت میں اُن فوائد کو بیان کیا ہے اور وہ عبارت یہ ہے کہ "کسی ایسی ریاست کے لوگوں کیلیئے جنکی حکومت تمام تر خشکی پر ہو یہ ممکن ہے کہ چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے فوجیں لیکر لڑائی کیلیئے ایک بڑا لشکر تیار کرلیں۔ لیکن ایک بحری ریاست کے لوگوں کیلیئے دوسری شکل ہوتی ہے۔ ایسی ریاست میں بالعموم متعدد مجموعے جزیروں کے شامل ہوتے ہیں۔ (چنانچہ جملہ معترضہ کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اسوقت بھی دنیا ایک بڑے پیمانہ پر مجمع الجزائر ایجین کا نمونہ معلوم ہوتی ہے) مگر ان جزیروں کی حکومتوں میں دشمن کے مقابلہ کیلیئے متحد ہونا غیر ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن میں سمندر حائل ہوتا ہے۔ اور سمندر پر حکومت ایسی ریاست کی ہوتی ہے جو سب ریاستوں میں بڑی اور زبردست ہو۔ پھر ان جزیروں کے لوگوں سے یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ دشمن کی نظر بچاکر کسی ایک جزیرہ میں جمع ہوجاویں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو بھی تو رسد ہم نہ پہنچنے سے وہ سب ہلاکت کو پہنچ سکتے ہیں۔ اسوقت ایتھنز کی محکوم ریاستیں جو جزیروں پر نہیں بلکہ براعظم یورپ پر واقع ہیں اُن میں جو بڑی ہیں وہ اپنی ضروریات کی وجہ سے اور جو چھوٹی ہیں وہ خوف کے باعث سے مجبور ہیں کہ جو بڑی ریاست سمندر پر مستولی ہے اسکے احکام کو دل سے سنیں اور یہ مجبوری (٦٧)
اسوجہ سے ہوتی ہے کہ کوئی ریاست ایسی نہیں جسکی سلامتی کا دار ومدار مال کی درآمد و برآمد کے کھلے رہنے پر نہو۔ اگر یہ جزیری ریاستیں سمندر پر قبضہ رکھنے والی ریاست سے سرتابی کرتی ہیں تو پھر اُن میں مال کی آمد و رفت بند کردیجاتی ہے۔ علاوہ اسکے سمندر پر قابو یافتہ ریاست کے اختیار میں چند امور ایسے ہوتے ہیں جو محض خشکی پر حکومت رکھنے والی ریاست کو نصیب نہیں۔ مثلاً اپنے سے وسیع تر ریاست کے ملک کو تاخت و تاراج کرنا اُسکے اختیار میں ہوتا ہے کیونکہ جس ریاست کی بحری طاقت بڑھی ہوئی ہے وہ ایک ملک کے کنارے کنارے اپنا جہازی بیڑا لیجاکر اُس ملک میں فوجیں اُتار سکتی ہے۔ اُس مقام پر دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یا تو اُس ملک کی کسی بڑی فوج سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے یا تھوڑی فوج سے

اگر دشمن زیادہ جمعیت سے سامنے آیا تو بحری غنیم بھاگ کر اپنے جہازوں پر آسانی سے
آسکتا ہے اور لنگر اٹھا کر اپنا بیڑا وہاں سے ہٹا سکتا ہے۔ اُسکے لیئے یہ سب کام آسان
ہیں لیکن جو فوجیں ملک کو بچانے کیلیئے سمندر کے کنارے آتی ہیں اُنکے لیئے دشواریاں
بہت ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ جو طاقت سمندر کی مالک ہو اُسکے اختیار میں ہوتا ہے کہ
جسوقت چاہے گھر سے یا ہر دوسری جگہ کا قصد کرے اور جہازوں پر اپنی فوجیں
سوار کرکے جسقدر دور کا سفر کرنا چاہے کرے۔ لیکن کسی بڑی طاقت کے اختیار
میں اُس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ اپنی ریاست کی حدود سے باہر صرف چند روز کی
مسافت پر اپنی فوج کو روانہ کرے۔ خشکی پر فوجوں کے کوچ کرنے میں زیادہ عرصہ
لگتا ہے۔ اور کوچ کے زمانے میں یہ بھی ممکن نہیں ہوتا کہ کھانے پینے کا سامان بہت
دن کیلیئے ساتھ رکھا جاوے۔ بس اس فوج کو یا تو ایسی ریاست کی زمین پر سے
گذرنا ہوتا ہے جو دوست ہو یا منزل مقصود تک پہنچنے کیلیئے لڑائیاں لڑ کر راستہ
نکالنا پڑتا ہے۔ لیکن بحری طاقت کے اختیار میں ہوتا ہے کہ زمانہ سفر میں جہاں
کہیں اپنے سے کمزور لوگوں کو پاوے وہیں اتر پڑے۔ یا اگر کوئی بہت ہی سخت
صورت پیش آئے تو کسی ملک کے کنارے کنارے جہازوں کو آگے بڑھائے اور جب کسی
ایسی ریاست کی زمین کے قریب پہنچے جس سے دوستی ہے یا جو اپنے سے کمزور ہے اور مقابلہ
کی تاب نہیں رکھتی وہیں اتر پڑے۔ پھر وہ جسمانی بیماریاں جو خشکی پر پیدا ہوتی ہیں مثلاً
آسمانی بلائیں جو وباؤں کی صورت میں نازل ہوتی ہیں وہ خشکی کی ریاستوں میں بہت
شدّت سے پھیلتی ہیں۔ لیکن بحری ریاستوں کو اُنکی خبر تک نہیں ہوتی کیونکہ اس
قسم کی وبائیں دُنیا میں ہر جگہ ایک ہی وقت میں پیدا نہیں ہوتیں .... ایک
(۶۸) بات میں البتہ ایتھنز والے کم ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر اُنکی سلطنت کسی جزیرہ
پر ہوتی اور اُسوقت وہ سمندر کے بھی اُسی طرح مالک ہوتے جیسے کہ اسوقت ہیں
تو پھر یہ اُنکے اختیار میں ہوتا کہ جسکو جو نقصان پہنچانا چاہتے پہنچا دیتے اور خود
کچھ نقصان نہ اُٹھاتے"

بہر کیف ایتھنز کیلیئے لازمی تھا کہ وہ اپنا قبضہ سمندر پر قائم رکھے۔
جسکے معنی یہ تھے کہ ہر وقت لڑائی کیلیئے جہازوں کا بیڑا تیار رہے۔ اس کام میں

ایتھنز کے دولتمندوں نے بڑی بڑی مالی امداد پہنچائی اور اپنے نفس پر بھی ہر طرح کی
سختیاں جھیلیں اور اِس بات کو ثابت کر دیا کہ عمومی حکومت میں لوگ تن آسانی و آسائش
اختیار نہیں کر سکتے انگلستان میں شرفائے قوم اور فرانس میں نپولین اپنی اپنی قوم کے
حق میں اسقدر سختی سے کام لینے والے نہ تھے جسقدر کہ ایتھنز اپنے عموم حکمران سے
کام لینے میں سخت گیر تھا۔ سنہ ۴۱۲ ق م سے سنہ ۴۰۲ ق م تک ایتھنز میں قحط اور
گرانی اور اور طرح طرح کی مالی مشکلات قوم کو درپیش رہیں۔ اُس زمانے میں قوم کی تعلیم
وسامان تفریح کیلیئے ایک دولتمند سے بیس ہزار فرانک کی فرمائش کی گئی۔ اُسی وقت
کے بیس ہزار فرانک سے اتنی چیزیں خریدی جا سکتی تھیں جتنی اب تیس ہزار فرانک
سے خریدی جاتی ہیں۔ جہازی بیڑوں کی ساخت و پرداخت کیلیئے جو محصول مقرر
کیا گیا تھا اُسکی بابت بھی یہ دولتمند شخص چالیس بلکہ ۴۳ ہزار فرانک کے قریب ادا
کرتا تھا۔ شرفاء ایتھنز نے یہ ہی سخت زیر باری اپنے اوپر نہیں لی تھی بلکہ عموم کو
باوجودیکہ وہ شرفاء سے مخالفت کرتا رہتا تھا اس قسم کی زیر باری سے بہت کچھ
سبکدوش کر رکھا تھا۔ چنانچہ ۴۲۰ ق م میں شرفاء ایتھنز سے ایک شخص نے
لکھا ہے کہ سب سے پہلی بات انصاف کی یہ ہے کہ قوم کے عالی النسب اور مالدار لوگوں
کے مقابلے میں قوم کی تنگدست اور مفلس جماعتوں اور عموم کو ہر چیز میں زیادہ
فائدہ حاصل رہنا چاہیئے کیونکہ یہی عامی و تنگدست لوگ وہ ہیں جو جنگی جہازوں پر
کام کرتے ہیں اور جو شہر کے گرد اُسکی حفاظت کیلیئے ہر وقت حلقہ باندھے مستعد رہتے
ہیں۔ کشتی بان اور سکانی۔ ناخدا و نگہبان جو جہازوں پر بیٹھے چاروں طرف نظر دوڑاتے (٦٩)
رہتے ہیں اور جہازوں کے بنانے والے یہ سب لوگ عوام سے ہیں اور ان سے
شہر کو وہ قوت حاصل ہے جو قوم کے شریفوں اور امیروں اور مسلح پیدل فوجوں سے
نصیب نہیں"۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ "زمانہ امن میں سال میں آٹھ مہینے ۶۰ جنگی جہاز
ایتھنز کے بندرگاہ میں ہر وقت لڑائی کیلیئے تیار کھڑے رہتے تھے۔ ساٹھ جہازوں
کیلیئے سمجھنا چاہیئے کہ ۱۰۲۰۰ کشتی کھینے والوں اور ۴۸۰ افسروں اور ۹۰۰ بحری
سپاہ کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ اُس حساب سے گویا ایتھنز کے شہریوں کی کل
تعداد کا چوتھائی حصہ سال میں نو مہینے جنگی جہازوں پر رہتا ہوگا۔ اگر اسماخر کی

تردید ارسطاطالیس نے نہ کی ہوتی تو اسکو ہم باور کر لیتے لیکن اس بارے میں اس حکیم سے جو کچھ اطلاع ملتی ہے اُسپر شبہ ہوتا ہے کہ واقعہ کو کم کرکے ہی بیان نہیں کیا ہے بلکہ اُسکی کمی میں بھی مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس کی تحریر کے مطابق ایتھنز کے بندرگاہ پر جو بیڑا لڑائی کے زمانے میں ہر وقت ایتھنز کی پاسبانی کرتا تھا وہ صرف بیس جہازوں کا تھا اس لئے شہر کی آبادی کا تہائی حصّہ نہیں بلکہ بارھواں حصّہ ہر سال جہازرانی کے موسم میں بحری خدمت پہ کمر بستہ رہتا تھا۔ علاوہ بریں ہر سال دو ہزار آدمی قرعہ ڈالکر منتخب کیئے جاتے تھے کہ ملک کے قلعوں میں سپاہی بنکر رہیں۔ اگر اس تعداد کو سات سو شہنشاہی محسر ٹیوں اور سلح خانوں کے پانچ سو محافظوں کی تعداد میں جوڑ دیں تو کل شہریوں کا یہ تقریباً دوسرا بارھواں حصّہ ہو جاتا تھا۔ اس حساب میں شہریوں کی وہ تعداد شامل نہیں ہے جو بحری لڑائیوں کے وقت کام میں لائی جاتی تھی۔ ایتھنز کے دارالسفائن میں چار سو جنگی سفینے ہر وقت لڑائی کیلئے تیار رہتے تھے۔ اور ان میں سے جیسا معرکہ ہوا اُسکی ضرورت کے مطابق جہاز لیئے جاتے تھے اگر ڈھائی سو جہازوں کی ضرورت پڑتی ہوگی جیسا کہ بعض موقعوں پر اتفاق ہوا تو اُنکے لیئے پچاس ہزار ملاحوں کی (۷۰) خدمت درکار ہوتی ہوگی۔ لیکن اگر ایتھنز اپنے تمام شہریوں کو بھی اس کام میں لگا دیتا تو یہ تعداد پوری نہ ہوتی۔ اسلیئے جہانتک ممکن تھا اپنے آدمیوں سے کام لیکر باقی تعداد حلیف ریاستوں سے حاصل کر لی جاتی تھی۔

یہ سچ ہے کہ حلیف ریاستوں سے خراج لیا جاتا تھا تاکہ اسکے روپے سے جہاز بنائے جاویں اور ملاحوں کی تنخواہیں مقرر ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ایتھنز کے مالدار لوگ بڑی بڑی رقمیں جنگی بیڑوں کی تیاری کیلئے اپنے پاس سے دیتے تھے اور شاہی خزانے سے بھی اخراجات جنگ کیلئے کثیر صرفہ دیا جاتا تھا اور پھر یہ کہ ایتھنز اپنا روپیہ ہی کشادہ دستی سے صرف نہ کرتا تھا بلکہ اپنے آدمیوں کا خون بھی بے جگر ہوکر بہاتا تھا۔ بحری و برّی لڑائیوں کا جو لشکر دس حصوں میں تقسیم تھا اسمیں سے ایک حصے کے جسقدر لوگ ۴۵۹ ق م میں کام آئے تھے اُنکی نسبت یہ تحریر ملتی ہے کہ "ایرک تھی دستہ فوج کے مندرجہ ذیل لوگ وہ ہیں جو قبرس مصر فینشیا۔ ایلیس۔ ایجائنا اور میگارا کے معرکوں میں ایک سال کے اندر مارے گئے۔"

اس عبارت کے بعد ایک سو بہتر آدمیوں کے نام درج ہیں۔ اس سال کوئی بڑی لڑائی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ یہ سال ایسا تھا جس میں ایتھنز کو جنگی معرکوں میں کوئی بڑا نقصان پہنچا ہو۔ لیکن پھر بھی اگر اموات کی یہ ہی تعداد تھی تو از روئے حساب وہ پیدائش کے اوسط سے دوگنی پڑتی ہوگی۔ پس لڑائیوں کے زمانہ میں جانوں کا نقصان وہ چیز تھا جو شہنشاہی کو مالکان شہنشاہی کیلئے بڑی قیمتی شئے بنا دیتا تھا۔

پیرکلیس کی حکومتِ عمومیہ کے متعلق معاصرین نے تین باتوں پر خصوصًا اور ایک بات پر عمومًا اعتراض کیا ہے۔ ان معترضوں میں ایتھنز سے باہر کے رہنے والے ہی نہ تھے بلکہ خاص ایتھنز کے لوگ بھی تھے۔ اور جن باتوں پر انکا اعتراض تھا اُن میں ایک دلیل بھی ایسی نہیں کہ پیرکلیس نے اپنے زمانہ حکومتِ عمومیہ میں ایتھنز کی ماتحت ریاستوں کی رعایا سے نیک سلوک نہیں کیا۔ لیکن اس اعتراض میں جسقدر دلائل پیش ہوئے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس سے بدسلوکی ثابت ہوتی ہو۔ اس قسم کے (۷۱)
اعتراضوں کی نسبت کوئی قطعی فیصلہ کرنا یا تاریخ یونان کے چند دیگر مسائل کے بارے میں موافق یا مخالف رائے دینا اسباب پر موقوف ہے کہ بحث کے وقت اصلی ہمدردی شہری ریاستوں کے ساتھ ہے جنھوں نے حقیقت میں تعلیم و تہذیب کو دنیا میں شائع کیا یا یہ ہمدردی کل یونان (ہیلاس) کے ساتھ ہے جسکی ترقی و آزادی کے حق میں شہری ریاستوں کا اختلافِ طبیعت آخر کار مہلک ثابت ہوا۔ پیرکلیس کے مخالفین کہتے تھے کہ ہیلاس (کل یونان) کی سخت توہین کی گئی ہے۔ اور وہ ہماری (یعنی ایتھنز کی) حکومت کو اپنے حق میں یہ دیکھکر ایک خودسر حکومت سمجھتا ہے کہ لڑائیوں کے لیے جو روپیہ اوس سے جبرًا وصول کیا گیا تھا اُسکو ہم نے اپنے شہر کی رونق اور آرائش میں صرف کیا۔ دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہمارا شہر ایک زن عیاش کی طرح اپنے مال و متاع میں بیش بہا جواہرات قیمتی بتوں اور بت خانوں کا اضافہ کرتا رہا جنکی لاگت میں فی الواقع ہیلاس کا لاکھوں روپیہ صرف ہوگیا۔ یہ الزام سخت تھا۔ اور اسکا ٹھیک ٹھیک جواب یہی تھا کہ یونان کی ریاستوں کو سلطنت ایران کی غارت گری سے پورے طور پر حفاظت بخشنے کے بعد ایتھنز کو اختیار تھا کہ ریاستہائے ماتحت نے جو روپیہ دیا ہے اسکو جسطرح چاہے خرچ کرے۔ منطقی نتیجہ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ ماتحت ریاستوں نے

جس ضرورت کیلئے روپیہ دیا تھا وہ ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ لیکن پیرکلیس کو از روئے منطق بحث کرنے کی پرواہ نہ تھی کیونکہ جن چیزوں کو وہ واقعی ضروری سمجھتا تھا ان سے قطع نظر نہ کرسکتا تھا۔ جسطرح کہ حال میں ثابت ہوا ہے اگر پیرکلیس اُسوقت اس بات کا ثبوت دیدیتا کہ تعمیرات پر جسقدر روپیہ اس نے صرف کیا تھا وہ خراج کا ساٹھواں حصّہ تھا اور یہ رقم وہ تھی جو فصل کے پہلے پھلوں کے نام سے ایتھینا دیوی کا نذرانہ قرار پاچکی تھی تو پھر پیرکلیس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا لیکن یہ ثابت ہے کہ ایتھنز کی عمارتوں پر اُس تعداد سے کہیں زیادہ روپیہ صرف ہوا تھا جو خراج کی رقم سے براہ راست حاصل کیا گیا تھا۔ اور اسکی وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ روپیہ ان نقصانات کا معاوضہ (۷۲)
تھا جو بادشاہ ایران زرکسیز کے حملوں سے ایتھنز کو اٹھانے پڑے تھے اور ان رقوم کی بابت وصول ہوا تھا جو ایتھنز نے جنگ ایران کے زمانے میں لڑائی کے سرمایہ میں اپنے پاس سے جمع کی تھیں بہرحال جسقدر روپیہ ریاستہائے ماتحت نے دیا تھا وہ اُس روپیہ کے مقابلہ میں بہت کم تھا جو جنگی بیڑا نہ رکھنے اور اُسپر کچھ صرف نہ کرنے کی وجہ سے ان ریاستوں نے بچالیا۔

دوسرا سخت اعتراض یہ تھا کہ ایتھنز یوں نے حلیف ریاستوں کے لوگوں کو مجبور کیا کہ "بحری سفر کی صعوبتیں اٹھا کر وہ اپنے مقدمات ایتھنز میں تصفیے کیلئے لایا کریں"۔ اور یہ حکم اسلیئے دیا تھا کہ "سال بھر رسوم عدالت کی متواتر آمدنی سے اپنے شہر والوں کو خاطرخواہ تنخواہیں وصول ہوا کریں"۔ "گھر بیٹھے مقدمے سُنے جائیں تاکہ جہازی سفر کا خرچ نہ اٹھانا پڑے۔" "ان ریاستوں میں عمومیت کے جو طرفدار ہوں اُنکی سرپرستی کریں اور جو لوگ اُسکے دشمن ہوں اُنکو تباہ کریں"۔ اور ایتھنز میں جو لوگ سرائیں اور مسافرخانے رکھتے ہیں یا ایسا ہی کوئی پیشہ کرتے ہیں اُنکی گرم بازاری ہو۔ اور باہر والے شہر کے معمولی لوگوں کی بھی وہ خوشامدیں کریں جو کسی اور موقع پر سرداران فوج یا سفیران ملکی کی شان میں زیبا ہوں۔ اس حکم سے اسقدر فائدہ ضرور تھا کہ ایتھنز کا قانون اور ضابطہ جسکی بموجب مقدمات فیصلہ کئے جاتے تھے مقابلتًا بہت اچھا تھا اور ریاستوں کی مقامی عدالتوں سے جہاں بیجا طرفداریاں کیجاتی تھیں مقدمہ والوں کی جان بچ جاتی تھی۔ لیکن اس فائدہ کی کسر اسطرح نکل جاتی تھی کہ ایتھنز کی عدالتوں میں

مقدّمات کی نہایت کثرت رہتی تھی اور باہر والوں کو مدّت تک انتظار کرنے میں مصارف کی زیادتی کے ساتھ ذلّت و پریشانی بھی اٹھانی پڑتی تھی۔ مگر اس حکم کا جواز محض انہیں تھا کہ دور و دراز کے مقدّمات فیصلہ کرنے میں ایتھنز کو بحری سفر کی زیر باری نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ ایتھنز نے اپنی حلیف ریاستوں سے اُنکی زمینیں حاصل کیں اور اُن پر مفلس اور تنگدست ایتھنزیوں کو آباد کیا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اُن زمینوں کا ایتھنز نے ایک طور پر معاوضہ دیا تھا یعنی جن ریاستوں سے یہ زمینیں لی گئی تھیں اُنکے خراج میں کمی کردی تھی۔ اُسکے علاوہ خود حلیف ریاستو کے ہزارہا لوگ ایتھنز میں آکر آباد ہو گئے تھے اور اگر انھوں نے فوجی خدمت یا مالی (۲۳) امداد دینے سے پہلو تہی یا ایتھنز کے شہری حقوق حاصل کرنے سے پرہیز نہیں کیا ہوگا تو پھر ایتھنز کے لوگوں نے انکا خیر مقدم کیا ہوگا کیونکہ اس سے انکو موقع ملتا تھا کہ خاص شہر ایتھنز کی تجارت و حرفت کی گرم بازاری سے جسقدر فائدہ اٹھانا ممکن ہو فائدہ اُٹھائیں۔ مزید برآں اہل ایتھنز کو اپنا سرمایہ خاص علاقہ اٹیکا میں لگانے سے کوئی بڑا نفع نہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہ ملک ہر وقت دشمنوں کی زد میں تھا۔ بلکہ ایسی زمینوں پر اپنی دولت صرف کرنے میں زیادہ نفع دیکھتے تھے جو اُنکی شہنشاہی کے جزیروں کی ہوتی تھیں۔ اور یہ جزیرے وہ تھے جنکی حفاظت جنگی جہاز ہر وقت کرتے رہتے تھے۔ اُسوجہ سے اٹیکا کے اکثر کاشتکار ریاستہائے ماتحت کی زمین پر کاشتکاری کیا کرتے تھے۔ اور دوسروں کے ملک میں جائداد غیر منقولہ حاصل کرنے کا حق اُنکو تجارتی عہدناموں کے ذریعے سے ملا ہوا تھا۔ پس ان ریاستوں میں اور ایتھنز میں ہر طرح کا لین دین جاری تھا۔ اور یہ ایتھنز کا محض فوجی غلبہ تھا جو اُس نتیجے کا باعث ہوا کہ ایتھنز کے لوگ باہر کی ریاستوں میں پولیس کے کام پر اور باہر کی ریاست والے ایتھنز میں بطور ضمانت کے نظر بند دکھائی دینے تھے۔

اُن تینوں الزاموں کے متعلق ایتھنز کی طرف سے جو جواب پیش ہوتے تھے انکو ماتحت ریاستوں کے اکثر لوگ اپنی توہین جانتے تھے بلکہ توہین کے ساتھ

موجب نقصان بھی سمجھتے تھے۔ بہرکیف ایتھنز کی نیت خواہ توہین و نقصان رسانی کی ہو خواہ مصالحت اور فائدہ رسانی کی مگر ماتحت ریاستوں کے دل میں یہ خیال جم گیا تھا کہ ایتھنز کی حکومت ایک شہر کی حکومت ہے اور جسطرح ہو اُس سے گلوخلاصی کرنی چاہیے چنانچہ اس قسم کے خیالات جن میں مصالحت کی صورت نہ تھی ایسے تھے جنکو کوئی خاص زمانہ اگر بدلتا تو بدلتے۔ اور ایسے ہی زمانے کے فوائد حاصل کرنیکی غرض سے پیرکلیس نے ایک ہیلینی جنگ سے بچنے کی کوشش کی۔ پس ۴۴۵ ق م کے بعد صلح اور امن کا جو مسلک اسنے اختیار کیا وہ حقیقت میں ایک شہنشاہی پسند مدبر سلطنت کا صحیح مسلک سیاسی تھا۔

ایک عام بنیاد پر جو اعتراض اُس زمانے کے لوگ ایتھنز کی حکومت پر کرتے تھے وہ یہ تھا کہ خاص ایتھنز کے باشندوں اور ایتھنز کی ۲۰۴ ماتحت ریاستوں کے لوگوں کو جو شایستگی میں ادنیٰ درجہ رکھتے تھے ہر طرح کی مدد اُن لوگوں کا (۴۷)
نقصان کر کے دیجاتی تھی جو فی الواقع سب سے زیادہ عاقل اور تعلیم یافتہ تھے۔ اور یہ کہ ایتھنز کی حکومت کا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد اِس سے زائد نہ تھا کہ محض ایک اوسط درجے کی اخلاقی اور دماغی لیاقت سب میں یکساں پیدا کر دے۔ اُس بحث میں شاید کسی قدر سچائی ہو۔ لیکن اگر معترض اس اعتراض میں اُس بات کو زیادہ ظاہر نہ کرتے کہ عقل و دولت۔ تعلیم و شرافت ایک ہی چیز ہیں تو اُنکا یہ اعتراض زیادہ پختہ ہوجاتا۔ اگر اُس اعتراض کو صحیح مان لیا جاوے تو پھر اُن مورخوں کی رائے سے ہمکو اتفاق کرنا لازم ہوگا جنھوں نے لکھا ہے کہ اُس زمانے میں ایتھنز کو عمومی حکومت کی وجہ سے نہیں بلکہ باوجود عمومی حکومت رکھنے کے بزرگی حاصل ہوئی تھی۔ ذاتی طور پر میں اس اعتراض کو نہیں مانتا۔ میں تسلیم نہیں کرسکتا کہ ایسے زمانے میں جبکہ نئے نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے اور ہر علم و فن کے مضامین کو حسن و خوبی سے ادا کرنیکے طریقے ایسے درجۂ کمال کو پہنچائے جاتے تھے جو اُسوقت سے آجتک بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کیلئے موجب حیرت یا مایوسی رہے ہیں بہترین چیزوں کو غارت کیا گیا ہوگا۔ کیا یہ اعتراض ایک اُلٹی بات نہیں ہے کہ جس سلطنت نے سوفکلیز۔ ہیروڈوٹس۔ فی دیاس۔ پیرکلیس۔ پولیدیس۔ تھوکدائیس۔

سقراط اور تھیوسی ڈائڈیز جیسے کاملینِ فن کو پیدا کیا ہو اُسپر اِس بات کا الزام ہو کہ وہ
اپنے لوگوں میں محض ایک اوسط درجے کی لیاقت پیدا کرنی چاہتی تھی۔ عمومی حکومت
کے اُس میلان سے کہ سب لوگ ایک ہی سطح پر آجاویں کہیں بڑھکر وہ آسانی تھی جو
لائق لوگوں کیلئے اُس نے اس غرض سے پیدا کی تھی کہ وہ لیاقت و قابلیت کی پوری
بلندی پر پہنچ جاویں اور جب اُس بلندی پر پہنچیں تو اُنکے سامنے ایک ہمدرد و نکتہ چیں
مجمع سامعین کا ہو۔ یہانتک حکومت عمومیہ کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا وہ کہا گیا۔

ایتھنز کی عمومی حکومت کو سخت الزام دیا جاتا تھا کہ وہ شہنشاہی کو دوامی
نہ بنا سکی۔ لیکن یہ الزام خود ثابت کرتا ہے کہ شہنشاہی ایک پسندیدہ چیز تھی۔
اگر اس امر سے قطع نظر کیجاوے کہ کوئی حکومت خواہ کسی طرز کی ہو ہمیشہ قائم نہیں
رہی۔ اور جو سلطنتیں مدت تک قائم رہیں۔ وہ بالعموم بہت کم قابل قدر تھیں تو (۷۵)
پھر آج سے تئیس سو برس پہلے اس مسئلے کی نسبت جو کچھ تھیوسی ڈائڈیز نے لکھا ہے
اُسکو آخری فیصلہ سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ میں یہاں اِس مورخ کی وہ عبارت نقل
کرتا ہوں جسمیں اُسنے نہایت قابلیت سے اُن خیالات کا ذکر کیا ہے جو درحقیقت
ایتھنز کی شہنشاہی کے زوال کا باعث ہوئے۔

”زمانۂ امن میں جبکہ معاملات سیاسی پیریکلیس کے انتظام میں تھے تو
اُسنے نہایت احتیاط سے حکومت کی۔ اور اُسکی رہنمائی میں ایتھنز تمام آفات
سے محفوظ رہا اور اُس کے زمانے میں دولت ایتھنز کا اقبال اوج کمال کو پہنچا۔
جسوقت اسپارٹا سے جنگ شروع ہوئی اُسوقت بالکل ظاہر تھا کہ پیریکلیس نے
ایتھنز کی طاقت کا صحیح اندازہ کیا ہے۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد پیریکلیس ڈھائی
برس سے زیادہ نہ جیا۔ لوگوں کو اُسکی عاقبت بینی اور دور اندیشی کی قدر زندگی
سے بڑھکر اُسکے مرنے کے بعد ہوئی۔ کیونکہ وہ ایتھنز کے لوگوں سے کہہ گیا تھا کہ
اگر اُنھوں نے صبر سے کام لیا اور بحری سامانِ جنگ کی طرف پوری توجہ رکھی
اور جسوقت تک لڑائی جاری ہے اُسوقت تک اپنی حکومت کو بڑھانے کے
خیال سے پرہیز کیا اور اپنے شہر کیلئے نئے خطرے پیدا نہ کئے تو پھر ضرور
اُنکو لڑائی میں کامیابی ہوجاویگی۔ لیکن ایتھنز کے لوگوں نے وہی کیا جسکو پیریکلیس

منع کر گیا تھا۔ اور ایسے معاملات میں جنگو لڑائی سے کچھ تعلق نہ تھا انھوں نے نفسانی اغراض اور ذاتی فوائد کے خیال سے ایسا وتیرہ اختیار کیا جو خود انکے حق میں اور انکی ماتحت ریاستوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوا۔ اور یہ معاملات وہ تھے کہ اگر اُنمیں کامیابی بھی ہوتی تو صرف چند مخصوص لوگوں کو دولت اور عزت حاصل ہوجاتی۔ مگر جب ناکامی ہوئی تو اُن معاملات نے ایتھنز کو اتنا کمزور کردیا کہ وہ لڑائی میں بخوبی کام نہ کرسکا۔ گزشتہ اور موجودہ حالت میں اُس تفاوت کی وجہ یہ تھی کہ پیرک لیس جس بات کا حکم دیتا تھا وہ اپنی مسلّمہ لیاقت اور قابلیت سے سوچ سمجھکر دیتا تھا اور چونکہ وہ بڑا نیک نیت و متدین تھا اسلیئے آزادی کے ساتھ عموم پر قابو رکھتا تھا۔ وہ قوم کو رستہ بتانے والا تھا نہ کہ قوم سے رستہ پوچھنے والا۔ اور چونکہ بالکل بے لوث طریقوں سے وہ قوت حاصل کرنی چاہتا تھا اسلیئے اسکو خوشامد کرنیکی ضرورت نہ تھی بلکہ خود اپنی مضبوط طبیعت کے بل پر قوم کے لوگوں سے اختلاف کرسکتا تھا اور اُنکے بگڑنے کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ جسوقت دیکھتا تھا کہ اُنمیں ایک بے موقع کبر و پندار پیدا ہوچلا ہے تو اُسکے الفاظ اُنکی طبیعتوں میں انکسار و خوف پیدا کردیتے تھے۔ اور جسوقت دیکھتا تھا کہ وہ بلا وجہ خوفزدہ و افسردہ خاطر ہیں تو اُن میں ہمّت اور جوش پیدا کردیتا تھا کہ اُسکی ذات پر اعتماد و بھروسا رکھیں۔ پس گو ایتھنز نام کو ایک عمومی حکومت رکھتا تھا لیکن در اصل اُس پر اُسکے لائق ترین لوگ حکومت کرتے تھے۔ مگر پیرک لیس کے بعد جسقدر لوگ اُس کے جانشین ہوئے وہ سب آپس میں برابر کے لوگ تھے۔ اور اُنمیں ہر ایک یہ ہی چاہتا تھا کہ میں سب سے بڑھ جاؤں اور اُس مطلب کو پہنچنے کیلئے قوم کی ناز برداری میں معاملات سیاسی کا خون کر دیتے تھے۔ اُس قسم کا ضعف طبیعت ایک شہنشاہی حکومت میں بہت سی غلطیوں کا باعث ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ان ہی غلطیوں میں سے ایک غلطی جزیرہ صقلیہ پر فوجکشی کی تھی۔ یہاں غلطی یہ نہ تھی کہ ایتھنز کے لوگوں نے دشمن کی طاقت کا اندازہ صحیح نہیں کیا تھا بلکہ غلطی یہ تھی کہ جب مہم روانہ کی تھی تو اُسکی کامیابی کیلئے صلاح و مشورہ کرنے کی جگہ آپس کے ان جھگڑوں میں پڑ گئے کہ عمومیہ کی سرداری کسکو ملے۔ جو لشکر لڑائی کیلئے بھیجا تھا اُسکے انتظام میں (۷۶)

غلطیاں کیں اور اس سے بھی بڑھکر یہ ہوا کہ باہمی خانہ جنگی شروع کر دی جسکا ظہور پہلی ہی مرتبہ ہوا تھا۔ صقلیہ کی لڑائی میں فوج اور جہازوں کا بڑا حصہ تلف ہونے اور خانہ جنگی کی پریشانیاں اٹھانے پر بھی ایتھنز نے تین برس تک اپنے پہلے دشمنوں میں پیلوپونے سیس والوں سے اور صقلیہ کے لوگوں سے جو ان دشمنوں سے مل گئے
تھے اور اُنکے بہت سے ہوا خواہوں سے جو عین وقت پر ایتھنز سے باغی ہو گئے (۷۷)
تھے لڑائی جاری رکھی۔ یہانتک کہ جب ایران کا بادشاہ کارس پسر دارا لڑائی میں شریک ہو گیا اور اس نے پیلوپونے سیس کے بیڑے کیلئے روپیہ دیا تو بھی ایتھنز کی فوجیں برابر مقابلے پر جمی رہیں۔ مگر پھر آخر کار دشمن کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اُس کی نااتفاقیوں سے انکو پسپا ہونا پڑا۔"

تاریخی حالات کی یہ خلاصہ کیفیت جو طرز بیان کے اعتبار سے ترش و تکملہ ہے اور نفس مضمون کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے فہم و فراست و دقتِ نظر کے ساتھ معاملات سیاست کی حقیقت کو پہنچی ہوئی ہے تھیوسی ڈائڈیز کی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیتی ہے۔ بالخصوص جبکہ افلاطون اور ارسطاطالیس کے بیانات کے ایسے ہی ایک خلاصے سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات پر غور کرنیکی قدرت سے یونان اسوقت محروم ہو گیا جبکہ اسکے روشن ضمیر اس تجربہ سے مستفید نہ ہوئے جو ایتھنز کی شہنشاہی عمومیت میں رہنے سے حاصل ہو سکتا تھا۔ تھیوسی ڈائڈیز کی خوبیوں میں ایک بڑی خوبی طبیعت پر ضبط رکھنے کی ہے۔ واقعات سے یہ نتیجہ نکالکر کہ قوم کی سرداری کیلئے لوگوں کی حریفانہ کوششوں نے اور اہل شہر کے خطرناک جھگڑوں نے ایتھنز کو آخر کار تباہ کر دیا ایسے اسباب کے ظاہر کرنے سے پرہیز کیا ہے جنھوں نے لوگوں میں فساد کا مادہ پیدا کیا تھا۔ یہ کہنا کہ حکومت عمومیہ ایک فاش غلطی تھی تھیوسی ڈائڈیز کا کام نہ تھا بلکہ یہ الکی بیادیس کا قول تھا۔ اسی طرح اس بات کو بار بار کہنا کہ حکومت عمومیہ ایک شہنشاہی کا انتظام کرنیکی قابلیت نہیں رکھتی کلیون کا کام تھا نہ کہ تھیوسی ڈائڈیز کا۔ تھیوسی ڈائڈیز کو عمومیہ کی طرف سے مایوسی نہ تھی۔ کیونکہ ایتھنز میں قوم کی تباہی کا باعث زیادہ تر یہ نہ تھا کہ کثرت جمہور کی رائے خطا پر ہوتی تھی بلکہ اصل باعث یہ تھا کہ کثرت رائے سے

تیسرا باب

اِسپارٹا کے حالات سے لیکر ارسطا طالیس کے حالات تک

اسکندر اعظم کی تسخیر ایران کے بعد ہی ایک زمانہ ایسا آیا جسمیں قصّہ مشہور رہا (۷۹)
کہ یہودی اور اسپارٹا کے لوگ ایک ہی نسل سے ہیں ۔ اس قصّے کو دو طرح سے بیان کیا
گیا ۔ ایک یہ کہ دائینوسیوس دیوتا جسوقت تھیبس سے اٹھکر فتوحات کی غرض سے ایشیا
میں بڑھا تو اسپارٹا کا ایک شخص یوداس بھی اُسکے ہمراہ تھا ۔ اُسی یوداس نے
ارض یہودا کو آباد کیا جہاں سے یہودیوں کی نسل چلی ۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ اسپارٹا
کے لوگ در اصل حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے آل اسرائیل میں سب سے بڑھکر دلیر و
طاقتور تھے ۔ اور کچھ قبل اسکے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے نکالکر ارض کنعان
میں لائیں بنی اسرائیل کا یہ حصّہ یونان میں آباد ہو چکا تھا ۔

اس میں کچھ غلطی نہیں ہے کہ اسپارٹیوں اور یہودیوں کے ہم نسل ہونے کا
قصّہ پہلے یونان میں تصنیف ہو کر مشہور ہوا اور یہ ہی قصّہ ایک طور پر ان تعلقات
کا باعث ہوا جو اُن دونوں قوموں میں بعد کو پیدا ہوتے رہے ۔ کتب توریت میں
مقبیوں کی پہلی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسپارٹا کے بادشاہ ایریوس اوّل نے
جسکا زمانہ ۳۰۹ سے ۲۶۴ ق م تک رہا یہود کے حبر الاحبار اونیاس (عونیوس)
اول کو لکھا کہ آپ یہودیوں کو حکم دیں اور ہم اسپارٹیوں کو حکم دیتے ہیں کہ یہ دونوں
قومیں اپنے کل مال و متاع کو باہمی مال مشترکہ سمجھیں ۔ اسیطرح یہ بیان ہوا ہے
کہ اُس واقعے کے ڈیڑھ سو برس بعد (خاندان بنی حسمنائی سے) جوناتھن میکابیوس
(یوناثال مقبی) بادشاہ بیت المقدس نے اہل اسپارٹا کو بعد ادائے مراسم دوستانہ
اطلاع دی کہ جملہ قوم یہود " اپنی ضیافتوں اور عیدوں میں قربانی کے وقت اسپارٹا
کے لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہے اور اپنی عبادت میں بھی جہاں تک مناسب اور (۸۰)
ممکن ہوتا ہے اُنکے لیئے دعائے خیر کرتی ہے ۔" مگر کیا اس سے زیادہ خلاف
قیاس کوئی بات ہو سکتی ہے کہ اسپارٹا کے لوگ جنھوں نے حال ہی میں خاص اپنے

جو چند لوگ اختلاف کرتے تھے انکی خود غرضیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ عموم کے سرداروں
کو گمراہ کرنیکا الزام سقراط پر خود اتھنز کے باشندوں نے رکھا جس سے انکا مدعا یہ تھا
کہ سوفسطائیوں کی تحریک کو ایک جرم قرار دیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اتھنز کے لوگ
(۷۸) غلطی پر تھے۔ یا یہ کہ سوفسطائیوں کی تحریک سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں انکی ذمہ دار
اتھنز کی حکومت عمومیہ تھی۔

ہموطنوں میں مالی مشارکت کی ایک تحریک کو بہت ہی کشت و خون کے بعد مٹا یا تھا اسبات پر آمادہ ہو جانے کہ وہ اپنے مال اور "مواشی" میں یہودیوں کو برابر کا شریک بنالیں۔ رہی یہ بات کہ اُنکے حق میں دعائے خیر کیجاتی تھی تو اگر اسکا یقین کرلیا جاوے کہ بنی اسرائیل کی دعائیں بت پرستوں کے حق میں جو اپنے طریقے سے بھی منحرف رہتے تھے بارگاہ خداوندی تک پہنچتی رہتی تھیں تو پھر سب کچھ مان لینا درست ہوگا۔ بہرکیف اس میں کلام نہیں کہ جس زمانے میں یہودیہ میں اونیاس (عرنیوس) اور جوناتھن (یوناثال) اور اسپارٹا میں اریوس اور مینالیداس بادشاہ تھے تو اُسوقت یہودیوں اور اہل اسپارٹا میں دوستانہ مراسم جاری تھے۔ اُسکی شہادتیں بھی کثرت سے موجود ہیں کہ اسی صلبی تعلق کی بدولت یہودی اپنے بہت سے کام نکالتے رہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اسپارٹا میں یہودیوں کی بڑی آبادی موجود تھی۔

اُسکے علاوہ ایک قصہ یونان میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہودی ہندوستان کے ننگے جوگیوں اور فلسفیوں سے قرابت رکھتے ہیں۔ اُس قصے کو سنکر ان اسباب کی تلاش میں بھی مدد ملتی ہے جنھوں نے دریائے یوروتاس کی جنگجو قوم اور دریائے اردن کی بالطبع مذہبی قوم میں نسلی رشتہ قائم کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ یونان کے عالی دماغ اسوقت بڑے ذوق و شوق سے اُس کام میں مصروف تھے کہ اشیاء کی انواع کو کسی طرح اپنی اپنی جنس کے تحت میں لے آویں اور اُنکی مثالی صورتوں (۸۱)
کو پہچانیں جن سے عالم ظاہر کی ہر شئے کا نظامِ کائنات کی جزئیات سے ہونا سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ زمانہ حکیم ارسطاطالیس اور اُسکے شاگرد رشید تھیوفراسطیس اور اُسکے تلامذہ میں سے مشہور فلسفی نیاندر کا تھا شاعری کے میدان میں سروریہ ناٹک (کمیڈی) کا طرزِ جدید ایجاد ہوا تھا جس میں خیال کو اصلیت سے زیادہ دخل تھا پس اُس طرف توجہ کرنے سے بچنا مشکل تھا کہ جن انسانی گروہوں میں ذات برادری مانی جاتی ہے اُن میں نسلی قرابت قائم کیجائے۔ مگر اس ضروری امر پر غور نہ کیا کہ ارض یہودا میں یہودی احبار کی مدد کرنے کو اور لاکونیا میں وہاں کے لوگ سپاہیوں کی مدد کرنے کو اور ہندوستان میں ہندوستان کے باشندے برہمنوں کی سیوا کرنے کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے تھے۔ ان صورتوں میں سے

ہر صورت میں ایک عجیب جماعت ایسی ملتی ہے جسمیں تمام انسانی خواہشیں جہانتک حکومت سے بن پڑا ایک ہی خواہش کے تابع کر دی گئی تھیں۔ خواہ یہ خواہش لڑائی یا لڑائی کی تیاری ہو خواہ معمولی رسومات مذہب یا مذہب کے فلسفیانہ مسائل ہوں۔

اگر یونانی اسبات کو جانتے ہوتے تو اسپارٹیوں اور یہودیوں میں ایک ظاہری مشابہت اور ایسی تھی جسکو وہ بہت خوش ہو کر مان لیتے۔ کیونکہ جس زمانے میں یہودیہ میں قومی زندگی کا دائرہ جسکو طرح طرح کے عمدہ مشاغل نصیب تھے تنگ ہوتے ہوتے اس خیال پر محدود رہ گیا کہ کسی طرح خدا کے منتخب لوگوں کیلئے خدا کی مہربانیاں پھر حاصل کیجاویں تو اسی زمانے میں اسپارٹا نہایت بے دردی سے طرح طرح کے مفید قومی خصائل کو اس نظر سے محدود یا معدوم کر رہا تھا کہ اسکے سب باشندے کسی طرح سے تربیت یافتہ سپاہی بن جاویں۔ اور انکی طبیعت میں صرف وہ ہی جوش اور ولولہ باقی رہے جو ایک پیشہ ور سپاہی کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ وفاداری کرنے اور انکی عزت قائم رکھنے کا ہوتا ہے۔

سنہ ۵۰۰ ق م سے پہلے اسپارٹا شاعروں اور مطربوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ اسکے مشہور شاعر الکمون کے قلم سے جو نظم مناظر قدرت کے حسنِ خموشی پر لکھی گئی تھی وہ شرفائے اسپارٹا کی کواری لڑکیوں کے گانے کے واسطے تھی۔ اس نظم کی خوبیوں سے شایقینِ کلام شاعر گرتی کے ذریعے سے بخوبی آشنا ہو چکے ہیں۔ لیکی ڈیموں (اسپارٹا) (۸۴)
کا وادی قدرتی حسن و خوشنمائی میں بے نظیر تھا۔ ہر جگہ کثرت سے سبزہ موجود تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اناج بھی بکثرت پیدا ہوتا ہوگا۔ بیچ میں دریائے یوروتاس کی نیلگوں موجیں پتھریلی ناہموار رہگذر پر تڑپتی اور اچھلتی زور شور سے بہا کرتی تھیں۔ دریا کے دونوں جانب کوہ تجی ٹس اور پارنان کے سلسلے چلے گئے تھے جنکی چوٹیاں بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ پہاڑ کے دامنوں پر سبزہ زار تھے جہاں فصلِ بہار میں بلبلوں کا شور رہتا تھا۔ اس وادی دلربا میں جسکی خوشنمائی ایک مرتبہ نظر سے گذرنے کے بعد ہمیشہ دل کو خوش رکھتی ہے ایتھینا دیبی کے لیئے ایک خوبصورت بتخانہ بنایا گیا تھا جو "ایتھینا برنجی گھروالی" کے مندر کے نام سے مشہور تھا۔ یہ خوشنما عمارت لیکی ڈیمون میں اس زمانے میں تعمیر ہوئی تھی جب کہ خاص ایتھنز میں

اسی وجہ کو اپنی سکونت کیلئے ایک بہت ہی بھدی اور معمولی عمارت پر قناعت کرنی پڑی تھی حالانکہ وہ ایتھنز کی خاص طور پر نگہبان مانی جاتی تھی۔

بیس برس کا زمانہ گذرتا ہے کہ اسی مضمون کو اور اسکے علاوہ اور مضامین کو مع اُنکے نتائج کے ایڈورڈ مایر نے بیان کیا تھا۔ اب چھ سات برس کا عرصہ ہوا کہ انگلستان کے ماہرین آثار قدیمہ نے لاکونیا (اسپارٹا) کی زمین کھود کر پرانی چیزیں برآمد کیں۔ اور اُنکے حالات لکھے۔ کچھ شوق تو پہلے ہی ہو چلا تھا مگر اُس جدید تحقیقات پر شائقین کیلئے اور بھی دلچسپی کے سامان پیدا ہو گئے۔ اثری تحقیقات سے ثابت ہوا کہ میلاد مسیح سے ۶۰۰ برس پہلے اسپارٹا میں ایک قسم کے نہایت خوبصورت گلی ظروف بنائے جاتے تھے اور وہ ایسے مقبول تھے کہ سیرینی اور تارنتم کے دور و دراز شہروں میں اُنکی نقل اتاری جاتی تھی۔ یہ امر بھی اُن ہی کی تحقیقات سے ہے کہ اُس قدیم زمانے میں اسپارٹا کے تعلقات ملک مصر و لیدیا سے قائم تھے۔ علاوہ گلی ظروف کے "کنگھیاں۔ سنگھار دان۔ بالوں میں لگانے کے سہارے۔ پیتل کے زیور۔ مہریں۔ گلے کے ہار۔ سونے اور ہاتھی دانت کی چھوٹی چھوٹی خوشنما چیزیں زمین سے نکلیں جن سے ثابت ہو گیا کہ اسپارٹا میں بھی ایک زمانہ صنعت و حرفت میں کمال کا گذرا تھا۔ حالانکہ اسپارٹا کے ابتدائی اور وسطی زمانے کے لوگوں کی نسبت بالعموم یہ ہی باور کیا جاتا تھا کہ وہ بالکل ہی خشک اور سخت طبیعت رکھتے تھے۔

ایتھنز میں جیسا کہ اوپر آچکا ہے علوم و فنون کی ترقی کا باعث یہ تھا کہ (۸۴)
شرفائے قوم کے اخلاق اور علم و فضل کی تعلیم کل قوم کیلئے عام کر دیگئی تھی۔ اور جب کل قوم نے اِن چیزوں سے اپنی شرافت اور فضیلت قائم کر لی تو پھر اِس قوم کا پورا بوجھ باجگذار ریاستوں پر ڈالدیا گیا۔ اور بحری شہنشاہی رکھنے کیوجہ سے جو تجارتی مفاد حاصل تھے اُن سے بھی قوم کو مالامال کر دیا۔ لیکن اسپارٹا کی ترقی کے وسائل اُسکے بالکل برعکس تھے۔ یہاں شرفائے قوم جنکا شدت سے میلان عیش پرستی اور ہوائے نفسانی کی طرف کافی طور پر ثابت ہو چکا تھا چھٹی صدی قبل مسیح میں بالکل فنا کر دیئے گئے تھے۔

یہ صدی یونان کے حق میں بالعموم ایک ایسا زمانہ تھی جسمیں ہر چیز کی زیادتی وافراط کو روکا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض مورخوں نے اُس زمانے کو "دورِ اصلاحات" کہا ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جو "سات عاقلوں" کے نام سے مشہور تھا۔ اُن ہی دانشوروں میں سے ایک دانشمند نے دلفای کا مشہور اصول کہ "کسی چیز میں افراط نہ ہونے پاوے" قائم کیا تھا۔ یہ ہی وہ وقت تھا کہ جسمیں زندگی کی رندانہ مسرتوں اور اُس تازہ بیداری کو جو یونانی علوم وفنون کے نئے جنم سے پیدا ہوئی تھی روکا جاتا تھا۔ اور اتنی قوت سے روکا جاتا تھا کہ ہر جگہ اُسکا نتیجہ غارت گری ہو سکتا تھا جیسا کہ اسپارٹا میں ہوا۔ لیکن جسوقت ایران سے لڑنے کیلئے غیرتِ قومی حرکت میں آئی تو پھر اُس قوت نے ایسی نرمی سے اپنا عمل کیا کہ یونان کے وہ فنون اور ادبی ذخیرے پیدا ہو گئے جنکو کلاسک کہتے ہیں۔ یہی وہ خطرناک زمانہ تھا جسمیں اسپارٹا کے شرفا ہٹ گئے۔ اور اُنکے ساتھ اُنکے بڑے بڑے منصوبے اور اُنکا فضل وکمال بھی رخصت ہوا۔

اسپارٹا میں زندگی بسر کرنیکا جو طریقہ قائم کر دیا گیا تھا جب کوئی اُس سے آگے قدم بڑھانے کی جسارت کرتا تھا تو اُسکو فوراً روک دیا جاتا تھا۔ اور جو طاقت اُس جسارت کو روکتی تھی وہ پانچ ایفورون کے محکمہ میں متمکن تھی جسکو سمر وتیے راہ کے محکمہ ٹرائیبیون سے مشابہ بتایا ہے۔ ایفورون کو اُسدرجہ اختیارات حاصل (۸۳)
تھے کہ بادشاہوں کا تختِ حکومت پر قائم رہنا نہ رہنا بھی اِس پر موقوف تھا کہ ایفور حکم دیں اور بادشاہ اُسکی تعمیل کریں۔ اُنکے نافذہ قوانین نہ صرف رعایا پر بلکہ بادشاہوں پر بھی اپنا عمل رکھتے تھے۔

حکومتِ شرفاء سے حکومتِ عموم کیطرف اسپارٹا کا ترقی پانا جیسے کہ آگے چلکر رومانے ترقی پائی یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ اسپارٹا یا روما میں کوئی شخص واحد بہ اختیارِ کامل حاکم نہیں ہوا۔ بلکہ واقعہ یہ تھا کہ روما میں ٹرائیبیون اور اسپارٹا میں الفور ایسے بااختیار حاکموں کی ایک جماعت ہوتے تھے۔ حکومت کے جملہ اختیارات روما میں دس ٹرائیبیونوں میں اور اسپارٹا میں پانچ الفوروں میں جو ہر سال نئے مقرر کیئے جاتے تھے تقسیم کر دیئے گئے تھے تاکہ انتظامی اختیارات کسی شخص واحد کے قبضے میں نہ آجاویں

خواہ یہ شخص کوئی سورونی بادشاہ بلا اختیارات شاہی ہو خواہ کوئی جاہ طلب ماہر سیاست ہو جو اختیارات شاہی کو زندہ کرنا چاہتا ہو۔

زندگی بسر کرنے کے جو قوانین ایفوروں نے اسپارٹا میں جاری کیئے تھے ان میں ہر ایک اسپارٹی کیلیئے پیدائش سے لیکر موت تک بسر اوقات کے طریقے نہایت تفصیل وبسط سے بیان کر دیئے گئے تھے۔ یہ قوانین فی الحقیقت ایک ایسے فوجی اسکول کے قواعد تھے جسمیں فنون جنگ کی تعلیم ہوتی ہو۔ یا ایسے قواعد پر مشتمل تھے جنکی پابندی اعلان جنگ ہوتے ہی فوجی چھاؤنیوں میں لازم ہو جاتی ہے۔ سات برس کی عمر سے لیکر ساٹھ برس کی عمر تک مردوں کی آبادی کا نصف حصہ لڑائی کیلیئے تیار کیا جاتا تھا۔ لڑکے اور جوان مرد قواعد کرتے تھے۔ شکار کھیلتے تھے۔ ہتیار چلانا سیکھتے تھے۔ لڑتے تھے۔ ناچتے تھے۔ اور طرح طرح کی جسمانی ورزشوں میں مشق پیدا کرتے تھے۔ ہمیشہ ایک جگہ کھانا کھاتے تھے۔ اور کسی حال میں معلموں اور ایفوروں کی تیز نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاتے تھے۔

(۸۵) اسپارٹا میں کسی کو اجازت نہ تھی کہ اپنی زندگی جسطرح چاہے گذارے۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی ہر آدمی کی پوری زندگی کا نقشہ تیار کر دیا گیا تھا۔ کسی اسپارٹی کو دنیا کے اور دھندوں سے کچھ سروکار نہ تھا۔ تجارت اور حرفت کے کام دوسروں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ جو زمین کسی کو ورثے میں ملتی تھی وارث اُسکے فروخت کرنیکا اختیار نہ رکھتا تھا۔ اور نہ دوسرے سے زمین مول لے سکتا تھا۔ کھیتی کا کام ہیلٹ قوم کے گستاخ اور سرکش لوگوں سے لیا جاتا تھا۔ اُنکی تعداد اتنی تھی کہ فی اسپارٹی پندرہ پندرہ ہیلٹ پھیلتے تھے۔ پیریوسی قوم کے لوگ کپڑا اور ہتیار تیار کرتے تھے۔ یہ لوگ بہت فارغ اور مطیع تھے اور تعداد میں اسپارٹیوں سے پچ گنے تھے۔ اُنکے ایک سو سے زیادہ مواضع اور مواضع کے متعلق زمینیں ہیلٹ اور اسپارٹی دونوں کے مقبوضات کے گرد ایک حلقہ کی صورت میں واقع ہوئی تھیں۔ لوہے کا سکہ چلتا تھا۔ مگر جو مال باہر سے آکر فروخت ہوتا تھا اُسکی قیمت چاندی کے سکے میں دینی پڑتی تھی۔ مگر ایسے مال کی درآمد جہانتک ممکن ہوا کم کر دی گئی تھی۔ اور غیر ملکی جو پیریوسیوں کے حلقۂ مواضعات میں سے گزر کر

اندر کے علاقوں میں آجاتے تھے انکو گرفتار کر کے زبردستی باہر کر دیا جاتا تھا۔

اس حالت سے پہلے ہی اسپارٹا کے لوگ زندگی کی لذتوں اور خوشنما چیزوں کو جو اُن میں مستعمل تھیں ترک کر چکے تھے۔ سیدھا سادہ بد ذائقہ کھانا کھاتے تھے۔ بدنما گھروں میں رہتے تھے۔ اُنکے چوک اور بازاروں میں جا بجا نہ بیائش کیلئے بت نصب نہ تھے۔ ان میں چند بھدی اور بدصورت سرکاری عمارتیں تھیں۔ نہ تماشا گاہ تھے نہ رقص و سرود کیلئے عالیشان مکان تھے۔ اور نہ دماغوں میں کسی قسم کے نئے خیالات تھے۔ مائیں ہوتی تھیں جو اپنے کم عمر بچوں اور جوان لڑکوں کو بلا خوف و تامل دوسروں کے سپرد کر دیتی تھیں۔ بیویاں تھیں جو مضبوط بچے جننے کے شوق میں اُس عقل کے خلاف عمل کرتی تھیں جسکا لحاظ کرنا ہر عورت کیلئے مقدم ہے۔ لڑکے تھے جنکا کوئی گھر نہ تھا۔ گرمی جاڑے آدھے ڈھکے آدھے ننگے پھرا کرتے تھے۔ مویشیوں کیطرح کھلے احاطوں میں رات کو پڑ رہتے تھے اور جسطرح بن پڑتا تھا اپنا پیٹ پالتے تھے۔ اسپارٹیوں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار تھی۔ اگر یہ تعداد اتنی کم نہ ہوتی تو شاید بہنیں اپنے بھائیوں کو اور جوان بیاہی عورتیں اپنے شوہروں کو اور مائیں اپنے لڑکوں کو بھی نہ پہچان سکتیں۔ غرضکہ پرانا (۸۶)
اسپارٹا درگور ہو کر نیا اسپارٹا اس حال کو پہنچا تھا جو اوپر بیان ہوا۔ ایفور ہر سال لوگوں کو حکم دیتے تھے کہ "مونچھیں منڈاؤ اور قانون کی پابندی کرو۔" لمبے لمبے بال اور گھنی ڈاڑھیاں رکھتے تھے۔ اور پندرہ پندرہ کے غول تین سو خیموں یا بارکوں میں جو بازار ہیسنتھ کے کنارے واقع تھیں رہتے تھے۔ یہیں وہ کھاتے تھے اور یہیں وہ سوتے تھے۔ یہیں وہ اپنی برچھیاں اور ہتیار رکھتے تھے۔ اور یہیں سے وہ لال وردیاں پہنکر خطرے یا لڑائی کے وقت ردیف در ردیف پانچ عمدہ قواعد داں فوجوں کی شکل میں جن سے اسپارٹی فے لنکس مرتب ہوتا تھا نکلتے تھے۔ تمام لشکر نہایت چپ چاپ مقررہ وقت پر ایک ہی رات میں دبے پاؤں بغیر کسی بے ترتیبی کے پینتیس ہزار ہیلیٹ کی جمعیت کو پیچھے لیئے جسکے سپرد رسد کا سامان ہوتا تھا موقع جنگ کی طرف کوچ کر سکتا تھا۔ پانچ ہزار پیریوکی زرہ پوشوں کی سپاہ بھی اسکے عقب میں رہتی تھی کل فوج

اسطرح نقل وحرکت کرتی تھی جیسے کسی کل کے پرزے چلتے ہوں۔ اور ڈوریانی لے میں بانسریاں بجتی ہوئی یہ پوری جمعیت دس ہزار باقاعدہ فوج والے دشمن سے لڑنے کو چل پڑتی تھی۔ اُسکے مقابلے میں دشمن کی حالت اکثر بے ترتیبی و بدنظمی کی ہوجاتی تھی۔ اور ابھی نیام سے اُنکی تلواریں نکلکر کسی کی گردن تک نہ پہنچتی تھیں کہ دشمن فرار ہوجاتا تھا۔

انسان کی زندگی کو اسدرجہ بدل دینے کا باعث الیفور کے سخت احکام تھے۔ ہر سال حکم ملتا تھا کہ قوم ہیلٹ پر چڑھائی کیجاوے۔ مگر اُس قوم
سے باقاعدہ جنگ کرنی ممکن نہ تھی کیونکہ اسطرح لڑنے میں اپنی ہی آبادرعایا کے (۸۷)
غارت ہونیکا اندیشہ ہوتا تھا۔ اسلیئے چندچیدہ نوجوان سپاہیوں کو ہیلٹ کے پاس اس حکم سے روانہ کیا جاتا تھا کہ اُس قوم کے جسقدر فسادی دسرکش لوگ ہوں یا ایسے لوگ ہوں جو زور پکڑنا چاہتے ہوں اُنکو پوشیدہ طور پر قتل کردیا جاوے۔ کم سے کم ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں جو ہیلٹ سب سے زیادہ باغی و متمرد تھے اُنکی بستیاں اسپارٹا سے بہت دور کوہ تجی تس کے دوسرے سرے پر میسینیا کے علاقے میں واقع تھیں۔ یہاں کے ہیلٹ بہ نسبت دوسرے مقامات کے ہیلٹ کے اپنی غلامی کی حالت سے بہت ہی غصے اور غضب میں رہتے تھے اسکی وجہ یہ تھی کہ نصف پیداوار لینے کی شرط پر جن اسپارٹی آقاؤں کی زمینوں کو یہ لوگ کاشت کرتے تھے وہ کوہ تجی تس کے برفانی سلسلے کے اُس پار رہتے تھے۔ اس کوہستانی سلسلے نے مشرقی سمت میں میسینیا کے علاقے کو اسپارٹا کی طرف سے بالکل بند کردیا تھا۔ میسینیا کے ہیلٹ ہمیشہ اِس فکر میں رہتے تھے کہ کسیطرح غلامی سے گلوخلاصی کرکے پھر آزاد ہوجائیں۔ لیکن خاص وادی یوروتاس میں جو ہیلٹ آباد تھے اُنکو اُس قسم کا کوئی فکر نہ تھا۔ یہ لوگ ظلم ہونے پر بھی بغاوت کا قصد نہ کرتے تھے۔ البتہ جسوقت بغاوت ہوجاتی تھی تو پھر یہ بھی اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسیطرح اسپارٹی آقاؤں کا تخم دنیا سے اوٹھادیں یا کم سے کم انکو غلام بناکر خود اُنکے آقا بنیں۔ اس قسم کی بغاوتوں کے علاوہ ہیلٹ کا قرب اور اُنکی کثرت اسپارٹا کے لوگوں کو ہمیشہ خائف رکھتی تھی کہ کہیں وہ شہر میں گھس کر

سکو قتل نہ کریں۔ اسپارٹا کے گرد کوئی شہر پناہ نہ تھی بلکہ جس چیز سے مراد اسپارٹا کا شہر تھا وہ صرف پانچ گاؤں تھے جو پاس پاس آباد تھے۔ پس لڑائی کیلئے ہر وقت تیار رہنا اپنی حفاظت کیلئے ایک ضروری امر تھا۔

(۸۸) اسپارٹا کے لوگ اسکو خلاف مصلحت سمجھتے تھے کہ آنکے ایسے علاقے جن میں ہیلٹ سے کاشتکاری کا کام لیا جاتا ہو پیریوکیون کے حلقے سے باہر پڑ جائیں۔ اسکا ذکر اوپر آچکا ہے کہ پیریوکیون کے گاؤں اور زمینیں اسپارٹا کے مقبوضات کے ہر چہار طرف حلقہ کیئے تھیں اور یہ ہی گویا اسپارٹا کی دیواریں تھیں۔ پس یہ کسیطرح مناسب نہ تھا کہ اُن حدود میں جو ہیلٹ کام کرتے ہوں اُنکو باہر کے لوگوں سے کوئی تعلق رہے۔ کیونکہ اُس حلقے سے باہر زیادہ ہیلٹ کو جمع کرنے سے اس بات کا خوف تھا کہ دوسروں کے اغوا سے وہ باغی نہ ہو جاویں۔ پیریوکیون کی زمینوں نے اسپارٹا کی حدود پورے طور پر قائم کر دی تھیں۔ اُن حدود کو وسیع کرنیکی صورت یہی تھی کہ جو اسپارٹی علاقے اُن حدود سے باہر پڑتے تھے اُنکی حیثیت وہ ہی قائم کر دی جاوے جو پیریوکیون کے مواضعات کی تھی۔ اور فی الواقع اِسی طریقے سے ساتویں صدی قبل مسیح میں اسپارٹا نے اپنی حدود علمداری کو وسعت دی۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے اختتام پر اسپارٹا کو چند شہری ریاستوں سے مقابلہ درپیش آیا۔ یہ شہری ریاستیں لاکونیا اور میسینیا کے پہاڑی اور ساحلی دیہات کی مثل نہ تھیں کہ اسپارٹا کی ہمیشہ مطیع رہتیں۔ اُن میں طاقت اور غیرت دونوں چیزیں موجود تھیں۔ اور اسوجہ سے اُنھوں نے اسپارٹا کی حکومت سے آزاد ہونا چاہا۔ اس مقابلے میں اسپارٹا کو یہ بن نہ پڑا کہ اُن ریاستوں کو قطعاً نیست و نابود کر دیتا یا اُن سے مطلقاً ترک تعلقات کر دیتا اسلیئے مصالحت و رعایت سے کام لینا پڑا۔ اِسکا سبب ایک یہ بھی تھا کہ اسپارٹا کو اُس زمانے میں وطن سے باہر نکلکر معرکہ آرائی کرنی تھی۔ اسلیئے وطن کیطرف سے اور بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوئی کہ کہیں ایسے زمانے میں گھر میں کوئی فساد نہ برپا ہو جائے۔ ایفورون نے باہر کی ریاستوں سے جس قسم کے تعلقات رکھے اُن میں نہ تو سیاسیات کا کوئی بڑا نکتہ نکلتا تھا اور نہ ضوابط ہی ایسے تھے جنکی سختی سے پابندی کیگئی ہو۔

بہرکیف ۵۶۰ ق م کے قریب اسپارٹا نے سب سے پہلے ٹیگیا کی ریاست سے اور پھر پیلوپونیسس کی ریاستوں سے آرگوس اور آکایا کو چھوڑکر ایک عہدنامہ کرلیا جسمیں اسپارٹا کی شہنشاہی حیثیت محض اسقدر تھی کہ ہرایک ریاست نے بذاتِ خاص اسپارٹا کو مان لیا کہ دشمن کے حملے کو روکنے یا اسپر حملہ کرنے کیلیے جس قدر لڑائیاں ہونگی اُن میں اسپارٹا کو سب کا سرگروہ مانا جائیگا۔ (۸۹)

یہ پیلوپونیسی لیگ جو اسطرح قائم ہوا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُن ریاستوں کی حفاظت کریگا جو اُس میں شریک ہوئی تھیں۔ اور اُنکی آزادی میں کوئی خلل واقع نہ ہونے دیگا۔ لیکن اسپارٹا نے اُن ریاستوں میں سے ایسی ریاستوں کو جنمیں شرفا کی حکومت تھی ایسی ریاستوں کے مقابلے میں لاکر جن میں شخصی یا عمومی حکومت تھی اپنے نفع کیلیے تمام ریاستہائے مشمولہ میں رشک وحسد کی آگ بھڑکادی۔ اور باہر کے دشمنوں سے اُنکو خوفزدہ رکھکر ایک سواسّی برس تک اُن سب پر حکومت کا ڈنکا بجایا۔ اور اُس کل زمانے میں یونان کے معاملات سیاسی پر ایسا اثر قائم رکھا کہ سب اُس سے متاثر اور ہوشیار رہے۔ دومرتبہ اُس لیگ کا دائرہ اسقدر بڑھایا گیا کہ کل یونانی ریاستوں پر اُسکا اطلاق ہونے لگا۔ اوّل مرتبہ تین برس تک یعنی سنہ [illegible] سے سنہ [illegible] ق م تک جس زمانے میں ایرانیوں نے یونان پر فوجکشی کی تھی اور دوسری مرتبہ دس برس تک یعنی سنہ ۴۰۵ سے سنہ ۳۹۵ ق م تک جسوقت ایتھنز کی شہنشاہی کو زوال ہورہا تھا پیلوپونیسی لیگ کل ہیلاس (یونان) کا لیگ سمجھا گیا۔ اُس سے پہلے موقع پر یعنی سنہ [illegible] ق م جسوقت بحر ایجین کی ۲۲۰ ریاستوں نے یک قلم اسپارٹا کو اپنا سرگروہ ماننے سے انکار کیا اور اُسکی جگہ ایتھنز کو اپنا سرگروہ بنانا قبول کیا تو اسپارٹا کے ایفوروں نے سمجھا کہ اچھا سر سے بوجھ ٹلا۔ لیکن سنہ [illegible] ق م کے بعد چھیالیس برس کے زمانے میں جسقدر زیادتیاں ہوئیں وہ ایفوروں کی جانب سے نہیں بلکہ ایتھنز کی جانب سے ظہور میں آئیں۔ اُس زمانے میں ہرطرف عمومی طرزِ حکومت (ڈیموکریسی) کا شوق اسدرجہ بڑھا کہ عدیدی حکومتوں (اولیگارکی) کو اپنی حالت پر قائم رہنا دشوار ہوگیا اور اصول سیاسیات کے متعلق گفتگو اتنی بڑھی کہ اسپارٹا کی ظلم و معترض بحث میں آگئی۔ چنانچہ سنہ ۴۶۴ ق م میں

میسینیا کے ہیلٹ نے اسپارٹا سے آزاد ہونے کیلیئے آخری کوشش کی۔ بہرکیف
اب وہ وقت آیا کہ ایتھنز کی زیادتیوں اور غلطیوں سے عمومی طرز حکومت تعلیم یافتہ
لوگوں میں بدنام ہوجاوے اور پانچویں صدی قبل مسیح کے تیسرے چہارم میں اسپارٹا (۹۰)
کو ایک طور پر بالواسطہ نفع پہنچاوے۔ اور جنگ پیلوپونیسس کے ختم ہونے پر اسپارٹا
کے لوگ پھر اس قابل ہوجاویں کہ پیلوپونیسی لیگ کو کل یونان کا لیگ بنادیں اور
اس میں ایتھنز کو اور بحر ایجین کی اُن ریاستوں کو شامل کردیں جنکو ایتھنز کی خود سر
حکومت سے حال میں آزاد کیا گیا تھا۔

لڑائی میں فاتح کی کامیابی اُسکی طاقت کو پہلے سے زیادہ کردیتی ہے لیکن
اگر فتح کے باعث کام اتنا بڑھ جاوے جسکا انجام اُسکی قدرت سے باہر ہو تو
پھر ایسا نہیں ہوتا۔ اگر صقلیہ پر فوجکشی کے وقت سرقوسہ پر یا ایگوس پوتامی کے
معرکے میں ایتھنز کو فتح ہوجاتی تو اُسپر اتنے کام بڑھجاتے کہ انکو انجام دینا اُس سے
ممکن نہ ہوتا۔ اسکا ثبوت اسطرح مل سکتا ہے کہ جس زمانے میں اسپارٹا نے کل یونان
کا لیگ دوبارہ قائم کیا ہے تو اُس سے پہلے اسپارٹا کی اندرونی حالت پر اور
اُس حالت پر جو اسپارٹا کی کل یونان کے تعلق سے رہی بخوبی غور کیا جاوے۔

اُس زمانے میں ایسے اسپارٹیوں کی تعداد جنکی عمریں قاعدے کے مطابق
فوجی خدمت کے لائق تھیں صرف دو ہزار رہ گئی تھی۔ اس قلت کا باعث کچھ تو لڑائیاں
ہوئی تھیں مگر زیادہ تر وجہ یہ ہوئی تھی کہ شادیاں قریب کے رشتہ داروں میں ہونے
لگی تھیں اور ایسے لوگوں میں جو زیادہ عیال دار تھے زمین کی تقسیم در تقسیم سے
جو اُسوقت عمل میں آئی اولاد ذکور مفلس رہ گئی تھی۔ اور یہ افلاس اسقدر بڑھا تھا
کہ اکثر لوگ فوجی انجمنوں کے مصارف کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اُن انجمنوں میں
شرکت شہری قرار پانے کی لازمی شرط تھی۔ غرض یہ خرابیاں ایسی سخت تھیں کہ
بھائیوں نے اپنی موروثی زمین کو باہمی تقسیم نہ ہونے دیا۔ ایک ہی گھر میں بلکہ
ایک ہی بیوی کرکے سب شامل رہے زمین کوئی شخص نہ مول لے سکتا تھا اور
نہ فروخت کرسکتا تھا۔ لیکن عقد کرنیکی صورت میں یا ہبہ کے ذریعے سے وہ
مل سکتی تھی۔ اور چونکہ دولت مند لوگ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے اپنے ہی دولتمند

عزیزوں میں شادی کرتے تھے اسلئے کل جائداد صرف چند لوگوں کے قبضے میں آگئی اور جائداد کے ساتھ شہری حقوق بھی۔ دولت کا ذریعہ زمین تھی اور اکثر زمینوں
(91) کی مالک عورتیں تھیں پس جسقدر اسپارٹیوں کی تعداد کم ہوتی گئی اُن میں دولتمندوں کی حکومت بڑھتی گئی۔ ملک کی خانگی حالت اسطرح اور بگڑی کہ شہر میں ایسے لوگوں کا شمار بڑھ گیا جنکو یا تو معاملات سیاست میں رائے دینے کا اختیار نہ رہا تھا یا اپنے درجے سے گر کر وہ کم رتبہ ہوگئے تھے۔ یا غیر نسل کے میل سے خالص اسپارٹی نہ رہے تھے۔

اس خراب حالت سے جو خطرے پیش آتے رہتے تھے وہ ذیل کے ایک واقعے سے ظاہر ہونگے جسکو زینوفون نے اپنی کتاب ہیلی نیکا میں لکھا ہے۔

"بادشاہ اگیسیلاس (سنہ ۳۹۸ - سنہ ۳۶۰ ق م) کو تخت پر بیٹھے ہوئے ایک سال سے کم ہوا ہوگا کہ اُسنے تمام شہر کی طرف سے مقررہ قربانیوں میں سے ایک قربانی کی۔ جسوقت قربانی کا جانور ذبح ہوا تو فال نکالنے والوں نے اُس کو دیکھکر اگیسیلاس سے کہا کہ "اے اگیسیلاس دیوتا خبر دیتے ہیں کہ عنقریب کوئی بغاوت برپا ہونے والی ہے"۔ اسپر بادشاہ نے دوبارہ قربانی کی۔ اُس قربانی پر بھی فال نکالنے والوں نے کہا کہ "ذبیحوں کی شکل تو بہت ہی خطرناک معلوم ہوتی ہے"۔ بادشاہ نے یہ سنکر تیسری مرتبہ قربانی کی۔ اسپر فال نکالنے والے بہت ہی چیخ کر بولے کہ "اے اگیسیلاس اب تو علامت یہ ہے کہ ہم اسوقت دشمنوں کے بیچ میں ہیں"۔ اُسکے بعد بادشاہ نے ایسے دیوتاؤں کیلئے بلدان کیا جو اُسکے عقیدے میں لوگوں کو مصیبت سے بچا دیتے تھے۔ چنانچہ اب اچھے شگون نکلنے لگے یہانتک کہ بلدان بند کیا گیا۔ لیکن اُسکے بعد پانچ دن بھی نہ گذرے تھے کہ ایک مخبر دوڑا ہوا آیا اور ایفوروں کو خبر دی کہ غدر ڈالنے کیلئے ایک سخت سازش کیگئی ہے۔ اور اُسکے سرغنہ کا نام کناڈن ہے۔ بیان کیا کہ یہ شخص ہاتھ پاؤں اور دل کا بہت مضبوط ہے۔ مگر شہر کے رئیسوں میں سے نہیں ہے۔ اتنا سنکر ایفوروں
(92) نے مخبر سے پوچھا کہ غدر کس صورت اور شکل میں پیش آنے والا ہے۔ مخبر نے کہنا شروع کیا "سنیئے کناڈن مجھکو بازار کے بالکل سرے پر لیگیا اور وہاں مجھسے کہا

کہ اسوقت بازار میں جسقدر اسپارٹی موجود ہوں ذرا انکو شمار تو کرو ۔ چنانچہ میں نے
ایسے لوگوں کو گنا تو بادشاہ اور ایفور اور رئیس اور اور اسپارٹی کل ملا کر چالیس شمار میں
آئے ۔ اسپر میں نے کناڈن سے پوچھا کہ تم نے ان لوگوں کو شمار کرنیکی مجھے کیوں
ہدایت کی تھی ۔ کناڈن بولا سنو ۔ میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہی لوگ جنکو تم نے
گنا ہے وہ ہیں جنھوں نے تمھاری دشمنی پر حلف لے رکھے ہیں ۔ باقی جسقدر لوگ
تم دیکھ رہے ہو جو چار ہزار سے بھی زیادہ یہاں موجود ہیں ایسے ہیں جو تمھارے
سچے دوست اور خیر خواہ ہیں ۔ اسکے بعد کناڈن مجھکو ساتھ لئے بازاروں اور گلیوں
میں پھرنے لگا ۔ اور دشمنوں میں (یعنی اسپارٹیوں میں) کہیں ایک اور کہیں دو جو راستے میں
ملے انکو بتاتا گیا ۔ اور باقی سب لوگوں کی نسبت کہتا رہا کہ یہ دوست ہیں ۔ اسکے بعد وہ اسپارٹیوں
کی فہرستوں کا حوالہ دینے لگا جو دیہاتی اضلاع میں رہتے ہیں ۔ کناڈن برابر یہ ہی
ایک راگ الاپے گیا ۔ کہنے لگا کہ ان فہرستوں کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ مثلاً علاقہ
اگر ایک ہے تو اس پورے علاقے میں ایک ہی دشمن ہے یعنی علاقے کا مالک اور
باقی سب دوست ہیں ۔" اتنی گفتگو سننے کے بعد ایفوروں نے مخبر سے پوچھا کہ تمھارے
خیال میں اس سازش میں کسقدر لوگ شریک ہونگے ۔ مخبر بولا کہ یہ مضمون بھی کناڈن
کی زبان پر آیا تھا ۔ اسکا بیان تھا کہ اس سازش میں اصلی محرک تو کم ہیں مگر جسقدر ہیں
ان میں بہت بھروسے کے لوگ ہیں ۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ اس کمی کو پورا کرنے
کیلئے ہم خود انکے راز میں شریک ہیں ۔ اور اسیطرح انکے باقی لوگ یعنی جو سیاسی معاملات
میں رائے دیسکتے ہیں یا جو ادنیٰ طبقے کے ہیں یا جو پریوئیگی ہیں ان سب کا ایک ایک
آدمی اس راز میں شریک ہے ۔ ذرا ان لوگوں کی صورتوں کو اسوقت غور سے دیکھو
جسوقت کسی اسپارٹی کا ذکر انکے سامنے ہوتا ہو ۔ اگر ان میں سے کوئی آدمی تمام
اسپارٹیوں کو ایک ایک کر کے کچا کھا جائے تو ان سب کے چہروں سے ایسی خوشی
ظاہر ہوگی جو انکے چھپائے نہ چھپیگی ۔" یہ تحقیقات جاری تھی کہ ایفوروں نے
سوال کیا "یہ بتاؤ کہ یہ لوگ ہتیار کہاں سے پائینگے ۔" مخبر نے جواب دیا کہ "کناڈن
کہتا تھا کہ "ہم میں ایسے لوگوں کے پاس جو فوجوں میں بھرتی ہیں ہتیار موجود ہی ہیں ۔ (۹۳)
باقی لوگوں کیلئے جو کچھ بندوبست ہے وہ بھی بتاتا ہوں ۔ یہ کہکر کناڈن مجھکو جنگی

کارخانے کی طرف لیگیا اور وہاں صد ہا کٹاریں اور برچھیاں۔ تلواریں اور تیر کمان۔ لکڑیاں چیرنے کی کلہاڑیاں اور اناج کاٹنے کی درانتیاں مجھکو دکھائیں۔ اور کہنے لگا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی جس سے آدمی زمین کھودتے ہیں یا لکڑیاں کاٹتے ہیں یا پتھر توڑتے ہیں ہمارے کام میں آسکتی ہے۔ بلکہ یہ سمجھو کہ جب دشمن ہتیار نہ رکھتا ہو تو پھر اسکے مارنے کیلیئے کسی کام کا اوزار ہو وہ ہکو دس حصّوں نہیں تو حصے ہتیار بند بنا سکتا ہے۔

اُس خبر کے سننے پر ایفوروں نے مناسب سمجھا کہ کنادن کو اسپارٹا سے باہر کسی کام پر اسطرح بھیجا جاوے کہ کسی کو کسی بات کا شبہ نہو۔ چنانچہ انھوں نے اسکو ایک حکم دیکر بغرض تعمیل کیلیئے اولون کے شہر کو روانہ کیا۔ حکم یہ تھا کہ وہاں پہنچکر چند لوگوں کو گرفتار کرے جسمیں ایک عورت بھی تھی جو خوبصورتی اور سج دھج میں بہت بڑھی ہوئی تھی اور جو لیکڈیمون (اسپارٹا) کے تمام جوانوں اور بڈھوں کو جنکو اولون میں جانیکا اتفاق ہوتا تھا خراب کرتی تھی۔ کنادن کے ساتھ کچھ مسلح سپاہی بھی کر دیئے گئے تھے۔ لیکن اسپارٹا سے نکلنے پر اُن سپاہیوں نے کنادن کو گرفتار کر لیا۔ اور جبراً اُس سے اُسکے ساتھیوں کے نام دریافت کر لیئے۔" اور پھر کنادن کے مقدر کا لکھا یوں پورا ہوا کہ اسکو پا بہ زنجیر کرکے باہر نکالا اور گلے میں طوق اسطرح ڈالا کہ گردن کے ساتھ دونوں ہاتھ بھی اسمیں پھنسا دیئے اور اسطرح کوڑے مارتے ہوئے اور برچھیوں کے ہوَلے دیتے ہوئے اُسکو اور اُسکے ساتھیوں کو شہر کے گرد گشت کرایا۔" اسکے بعد بڑا متقی اور پرہیزگار زینوفون لکھتا ہے کہ "اِس طرح اُن کے سروں پر اُنکے گناہوں کا عذاب ڈالا گیا۔

جس حالت میں خطروں کا اندیشہ ہوا تو اسپارٹیوں نے بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا۔ پریوکیون کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرنے لگے۔ اور فوجکی مجموعی تعداد پانچہزار چھ سو کر دی۔ ہیلٹ میں سے بھی بعض لوگوں کو منتخب (۳۹۴)
کرکے اور انکو فوجی تربیت دیکر آزاد کیا اور باہر کے علاقوں میں سپاہی بنا کر بھیجدیا۔ تنخواہ دار سپاہی فوجوں میں بھرتی کیئے اور اسپارٹی کپتانوں کی ماتحتی میں

اُنکے دستے جہاں کہیں ضرورت دیکھی مقیم کر دیئے۔ اور جس مقام پر اُنکو مقرر کیا
وہاں کے مقامی حکّام کے کہنے کے مطابق کام کرنیکی ہدایت کی۔ اتحادی ریاستیں جو
اسپارٹا کی دوست تھیں اُن سے بھی فوجیں طلب کیں اور اُنکا خراج معاف کر دیا۔
جو ریاستیں پہلے ایتھنز کی حلیف تھیں اُن سے ایکہزار ٹیلینٹ سالانہ وصول کر کے
اُس رقم کو اپنی ریاست کے انتظام پر صرف کیا۔ اور اُس سے ملّاحوں اور سپاہیوں
کو تنخواہ دیکر اپنے جنگی جہازوں پر مقرر کیا۔ یہ جنگی جہاز حلیف ریاستوں سے حاصل
کیئے گئے تھے۔ غرض اسطرح اہل اسپارٹا نے خشکی اور تری پر اپنے پہرے بٹھا دیئے
اور ہر جگہ عمومی حکومت کے مقابلے میں شرفائے حکومت کی حمایت و حفاظت کو
خواہ وہ اصلی ہو یا نقلی اپنا فرض عین سمجھا۔ اور غیر یونانی قوموں کے مقابلے میں تمام
یونان کے حامی و سرپرست بنگئے۔ اور یہی اخلاقی وجہ اپنی شہنشاہی قائم کرنے کی
اُنکو ملگئی۔ مگر باوجود اسکے اُنھوں نے دائیونیسیوس[۱] اول سے دوستانہ مراسم قائم
کیئے جو صقلیہ کے پائے تخت سرقوسہ میں مطلق العنان بادشاہ ہوگیا تھا اور اُنکے
اس دعوے نے بھی کہ وہ غیر یونانی قوموں کے دشمن ہیں اُنکو اس بات سے
نہ روکا کہ جب تک ممکن ہو دولت ایران کا ساتھ دیکر یونانیوں کے خلاف معرکوں
میں شریک ہوں۔ لمولاس کورنتھی ۳۹۴ء ق م میں لکھتا ہے کہ "لیکی دیمون کی
ترقی مجھکو بالکل ایک زبردست دریا کا بہاؤ معلوم ہوتی ہے دریا منبع کے قریب تو
بہت تنگ اور آسانی سے عبور کرنیکے قابل ہوتا ہے مگر جوں جوں آگے بڑھتا ہے
ندیاں اور نالے اُسمیں شامل ہوتے جاتے ہیں جس سے اسکا پاٹ ایسا چوڑا ہوجاتا
ہے کہ وہ ایک دریائے زخار ہوجاتا ہے۔ یہی حال لیکی دیمون والوں کا ہوا۔ (۹۵)
ذرا اُنکی ابتدا پر غور کیجیئے۔ شروع میں اُنکا ایک چھوٹا سا گروہ تھا جسکا کوئی مددگار نہ تھا
لیکن جب وہ آگے بڑھے اور ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو اپنا شریک کرتے گئے
تو پھر اُنکی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور اُنکے مقابلے کی تاب کسی کو نہ رہی۔ مثال کے

---

[۱] سرقوسہ کے مطلق العنان بادشاہوں کا سلسلہ اور اسکی شہنشاہیوں کا ذکر جو مغربی یونان میں یکے بعد دیگرے قائم ہوئیں
قصداً اس کتاب میں چھوڑ دیا ہے۔ فریمن نے تاریخ صقلیہ میں اسکا ذکر بہت تحقیقات کیساتھ کیا ہے اور بلوک نے بھی اپنی کتاب میں بہت کچھ حصہ دیکر
اسکا حال لکھا ہے۔

طور پر ایک بات یہ بھی کہنے کی ہے کہ اگر بھڑوں کے چھتے پر کوئی قبضہ کرنیکے لیئے اڑتی بھڑوں کو پکڑنا چاہے تو آدھے چھتہ کی بھڑیں اسکو لپٹ کر کاٹنا شروع کر دینگی۔ لیکن اگر خود چھتے کو آگ دکھائی جاوے تو بھڑیں گھر چھوڑ کر اڑ جائینگی اور پھر بلا تکلف چھتے پر قبضہ ہو جائیگا۔ اسی مثال کے مطابق میری رائے میں یہ بہتر ہے کہ جسقدر لڑائی کرنی ہو وہ چھتے کے اندر کیجاوے یا اگر یہ ہو سکے تو جہانتک ممکن ہو لیکی ڈیمون (اسپارٹا) کے قریب پہونچکر لڑنا چاہیئے۔"

یہ نصیحت بہت درست تھی۔ لیکن چھتے کے قریب بھڑوں کو پکڑنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جب تک ایتھنز کے لوگوں نے سمندر پر اور تھیبس کے لوگوں نے زمین پر اسپارٹیوں کو شکست نہ دیدی اسوقت تک ایپامیناڈوس چھتے تک نہ پہنچ سکا۔ اسکے بعد البتہ اسنے پیلو پونیسی لیگ کو توڑ دیا اور میسینیا کے ہیلٹ لوگوں کو غلامی سے آزاد کیا۔ اور اس زبردست حکومت کو جس نے دوسو برس تک پیلو پونیسس کو دشمنوں کے حملوں سے بچایا تھا ایک ایسا مجموعہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا بنا دیا جسکی مثالیں یونان میں دوسری جگہ بھی موجود تھیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایسا مجموعہ بنا دیا جو یوروپین یونان میں دوسری جگہ اسوقت قائم ہوا جبکہ چند سال کے بعد ایپامیناڈوس کے مرنے سے تھیبس کا اقبال رخصت ہوا اور ایتھنز کا ساتھ ان ریاستوں نے چھوڑ دیا جو اسپارٹا کے مقابلے کیلیئے پہلے متحد ہوئی تھیں۔ مغرب میں دائیونی سیوس اول کی موت پر اسکی شہنشاہی ٹوٹ گئی اور جن ریاستوں کی شرکت سے یہ شہنشاہی قائم ہوئی تھی وہ ریاستیں اپنی پہلی حالت پر آگئیں۔

نظری طور پر یہ حالت اس اعتبار سے بہت اچھی تھی کہ شہری ریاستیں (۹۶)
جدید سیاسی ترکیبوں سے نکلکر اپنی قدیم صورت اختیار کرلیں یونانیوں کا حال یہ تھا کہ پرانے وقتوں سے انکی سرشت میں یہ بات داخل ہو چکی تھی کہ موجودہ زمانے کو پچھلے زمانے سے مقابلہ کر کے موجودہ زمانے کو اچھا نہ سمجھیں۔ انکے اس خیال میں ارتقا کے اس اصول سے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے دنیا ترقی کرتی جاتی ہے کوئی فرق نہ آتا تھا۔ یہ اصول وہ ہے جس سے آجکل کی بعض نیز طبیعتیں دھوکے میں پڑکر سمجھنے لگتی ہیں کہ جسقدر پچھلے زمانے میں جائیئے سیاسی و معاشرتی اصول

بالکل ہی خام اور ابتدائی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اور یہ کہ یونانیوں کا دورِ زرین اُس عہد سابق میں گزرا ہے جسکو زمانۂ گذشتہ کا "ایک گہرا اور تاریک غار" سمجھنا چاہیئے یہ جو کچھ ہو لیکن سب کو اسبات کا یقین تھا کہ شروع زمانے میں یعنی اسپارٹا اور ایتھنز کی شہنشاہیاں قائم ہونے سے پہلے ہر ایک شہری ریاست نہایت امن و آزادی اور عافیت و خودمختاری کے ساتھ اپنی حدود عملداری میں آسودہ تھی۔ چنانچہ جسوقت نئے حالات پیش آئے تو سو برس سے کچھ زیادہ کا زمانہ اسی کوشش میں صرف کیا گیا کہ پہلی سی خیر و برکت کا زمانہ پھر آجاوے۔ آخر کار اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور یونان کی ہر ایک شہری ریاست نے اپنی پچھلی آزادی و خودمختاری پھر حاصل کر لی اسیکے ساتھ ساتھ لوگوں نے یہ کوشش کی کہ ہر ایک شہر میں پرانی وضع کی "آبائی حکومت" جاری کریں۔ اسپارٹا کے زمانۂ سرگروہی میں اس کوشش میں کامیابی کا حاصل ہونا نظر بھی آتا تھا۔ مگر پھر معلوم یہ ہوا کہ علاوہ اس بات کے کہ شہری حقوق ایسے محصول ادا کرنے والوں کیلئے مخصوص ہوتے ہیں جو اپنے صرف سے ہتیار خریدیں اور جو لڑائی میں ہتیاروں کے استعمال سے واقف ہوں اور کوئی بات ایسی نہیں جسپر دو آدمی متفق الرائے ہو کر بتا سکیں کہ "آبائی حکومت" کا طرز کیا تھا۔ ہر ایک مدبر و مصلح قوم کو یہ دھن سوار ہوتی تھی کہ اپنے باپ دادا کی طرح حکومت کا انتظام کیا جاوے۔ لیکن چونکہ وہ معمولی قیود بھی جو مہذب قوموں کی تاریخ میں ہر جگہ پائی (۹۷)
جاتی ہیں اُس زمانے میں مفقود ہو چکی تھیں اسلیئے کسی طریقے پر ناراضی یا اختلاف ہوتے ہی بغاوت و بدنظمی پیدا ہونے میں دیر نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اُس کوشش کا نتیجہ کسی کے نزدیک قابل اطمینان پیدا نہیں ہوا کہ ہر شہری ریاست کی امتیازی خصوصیات جو یونان کے دورِ وسطی میں اسکو حاصل تھیں پھر زندہ کی جاویں اور پرانے وقتوں کے سیاسی طریقے جنکی حد سے زیادہ تعریفیں کیجاتی تھیں پھر اختیار کیئے جاویں۔ بجائے اُس کوشش کے کہ شہنشاہی اغراض کیلئے حوصلہ مندی سے بڑے بڑے معرکے کیئے جاتے ایک شہر دوسرے شہر سے بے قاعدہ لڑائی میں مصروف ہو گیا۔ جہاں پہلے سیاسی ترقی کی گرم بازاری تھی وہاں اب چاروں طرف سازشیں تھیں۔ اور سازشوں کے جواب تھے۔ فوجی طاقت گو پہلے سے

بڑھی ہوئی تھی مگر بجز قومی نقصان و ذلت کے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔ اور یہی تلخ ورزش پھل تھے جو اسپارٹا کے زمانۂ عروج میں سیاسی ردِ عمل سے یونان کی ریاستوں کو ملے۔

یہ ہی نامبارک زمانہ تھا کہ نظم حکومت کا فن پیدا ہوا۔ اور پیدائش کے وقت جو نشان اُسکے جسم پر تھے وہ آج تک موجود ہیں جس دائی نے اس بچے کو جنایا تھا وہ سقراط تھا جسکو ایتھنز کے لوگوں نے ایرسٹوفینز کے اغوا سے اِس جرم کی سزا میں ہلاک کر دیا کہ "وہ نوجوانوں کے اخلاق و اطوار بگاڑتا ہے اور پرستش کے لیئے نئے نئے دیوتا ایجاد کرتا ہے" سقراط نے ان الزاموں کی تردید کی اور اِس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ قوم سے عزت پانے کا مستحق ہے کیونکہ اُسنے ایتھنز کے ایک ایک آدمی سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کر کے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جن نیکیوں پر معاشرت کی بنیاد ہے مثلاً۔ انصاف۔ دانائی۔ پرہیزگاری۔ دلیری انکو وہ کیسی غلط صورت میں سمجھے ہوئے ہیں۔ اسکا یہ مضبوط خیال تھا کہ جو لاعلمی اُن نیکیوں سے پھیلی ہوئی ہے اُسکو دور کرنے اور امرِ حق کی اشاعت کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں ہے جو ایتھنز کے لوگوں کو بہتر انسان بنائے۔ سقراط کی موت نے اُس کام کو جسکے لیئے وہ دنیا میں آیا تھا تبرک بنا دیا۔ اور اُسکو ہلاک کرنا ایسا ہی ہوا جیسے دیو کا ایک دانت زمین میں دباتے ہی بہت سے جنات ہتیار باندھے زمین سے نکل کھڑے
ہوں اور انھی جنات میں سب سے زبردست اور دیو ہیکل جن افلاطون اور (۹۸)
ارسطاطالیس کو سمجھنا چاہیئے۔

سقراط کے ماننے والوں کے عیوب بھی شریفانہ تھے۔ یعنی انھوں نے تعلیم کی قدر و قیمت کو حد سے بڑھا دیا تھا۔ افلاطون کا قول تھا کہ "راستی ہر اچھی چیز کی ابتدا ہے۔ خواہ یہ چیز انسان سے متعلق ہو خواہ دیوتاؤں سے۔ جو شخص خیر و برکت حاصل کرنی چاہتا ہے اور ہمیشہ خوش رہنا چاہتا ہے اسکا فرض ہے کہ شروع ہی سے راستی اختیار کرے تاکہ جسقدر زیادہ زمانے تک ممکن ہو وہ ایک راستباز انسان ہوکر زندہ رہے۔ اس حالت میں لوگ اسپر اعتماد کرینگے۔ لیکن جو شخص ایسے جھوٹ و فریب کو جو ارادۃً عمل میں آیا ہے پسند کرتا ہے تو اُسکا کوئی اعتبار نہ کریگا اور جو شخص ایسے جھوٹ و فریب کو جو بلا ارادہ عمل میں آیا ہے پسند کرتا ہے

وہ احمق ہوتا ہے" راستی اپنی ذات سے ایک ہی ہوتی ہے اور جب اسکا علم ہوجاوے تو پھر اُسکا سکھانا بھی فرض ہوجاتا ہے۔ اور جب وہ سیکھی جائے تو اُسپر عمل کرنا بھی لازم ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ اگر راستی کا علم فی الحقیقت حاصل ہوجاوے تو پھر ناممکن ہے کہ لوگ اُسپر عمل نہ کریں۔ لیکن اس خیال میں افلاطون نے انسانی ارادے کی کمزوری اور اُسکی خودرائی کا لحاظ نہیں کیا۔ سقراط کی صرف یہی دو نصیحتیں تھیں کہ "راستی کا علم پیدا کرو" اور "راستی سکھاؤ"۔

میری نیت یہ نہیں کہ افلاطون وارسطاطالیس کے فلسفۂ سیاسیات کی یہاں شرح لکھوں۔ میرا کام اُس سے کم درجے کا ہے۔ میں صرف یہ جتانا چاہتا ہوں کہ یونانی شہنشاہی کے مسئلے میں کہاں کہاں اور کن کن وجوہ سے یہ دونوں عالی دماغ حقیقت کو پہنچنے میں قاصر رہے ہیں اور ایسے چند نتائج اور اُنکے اثرات کا ذکر کروں جنکی طرف وہ مطلق متوجہ نہوئے۔ سیاسیات کے متعلق افلاطون کی دو بڑی کتابیں ہیں۔ ایک ری پبلک یعنی "جمہوریہ" اور دوسری کتاب "لواطیس" یعنی "قوانین"۔ میں نے زیادہ تر کتاب قوانین کے مضامین سے بحث کی ہے۔ اور اُسکی وجہ یہ ہے کہ یہ تصنیف اُسنے اپنی آخر عمر میں جبکہ تجربہ بہت پختہ ہوگیا تھا لکھی تھی اور اُس میں ری پبلک کی مثل تخیلات کو زیادہ دخل نہ تھا۔

افلاطون نے اُس زمانے پر جسمیں وہ خود زندہ تھا زیادہ تر توجہ کی۔ اور اُسی (۹۹)
زمانے کے سیاسی و اخلاقی حالات کی قوت یا کمزوری کو نظر تعمق سے تحقیق کیا۔ اور جو کچھ لکھا یا پڑھایا یا جسکے لیئے اور طرح پر زحمت اٹھائی وہ اُسی زمانے کی بہتری کے لیئے تھی۔ زمانہ گذشتہ کو اُسنے ایسی صورتوں سے مملو دکھایا جو اُسی کے تصور آفرین دماغ کا نتیجہ یا عوام کی غلط فہمی یا ناقص و نا تمام علم کا ثمرہ تھیں۔ تاریخی غلطیوں کے مرتکب ہونیکا الزام افلاطون پر بہت آسانی سے ثابت ہوسکتا ہے اور اس سے بھی سنگین الزام یہ ہے کہ اُسنے صحیح تاریخی واقعات کا یا اُن جزئیات کا جن سے تاریخی کلیے پیدا ہوسکتے تھے پورا لحاظ نہیں کیا۔ بغیر کسی قسم کے پس و پیش کے اور بغیر اسکے کہ واقعات کی صحت و عدم صحت کو تحقیق کرے اپنا مطلب نکالنے کیلیئے اپنی قوم کی دینی تذکرہ کی تاریخ میں تحریف کو اسطرح جائز رکھا گویا کسی مسلمہ اصول کے مطابق اُس تحریف نے

مصروف ہے۔ کتاب القوانین میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ "واضع قانون کو غور کر کے صرف یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ کس بات پر یقین رکھنا جمہور کے حق میں سب سے زیادہ مفید ہوگا۔ اور جب یہ بات معلوم ہو جاوے تو پھر تا حد امکان اسکی کوشش کرے کہ وہی بات کل قوم کی زبان سے۔ اُسکی نظم و نثر سے اُسکی بحثوں اور تقریروں سے تمام عمر ظاہر ہوتی رہے" یونانیوں کی مذہبی تواریخ میں جو باتیں ناگوار بیان ہوئی تھیں اُنکا فیصلہ بہت مختصر طور پر یوں کر دیا کہ دیوتا گویا اپنی صفات میں کمال رکھتے ہیں اسلیئے ایسی چیزوں کو جو اُنکے نام کو داغ لگائیں غلط سمجھنا چاہیئے۔ انسان کی دنیاوی تاریخ کو بھی ایک اصول قائم کر کے افلاطون نے اسطرح حل کرنا چاہا کہ انصاف ایسی چیز ہے جسکے بغیر شخصی یا قومی آسودگی ممکن نہیں اسلیئے تمام ایسے واقعات جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ بھلائی بے انصافی سے اور برائی انصاف سے پیدا ہوئی ہے اُنکی تاویل کیجاوے یا انسے قطعی طور پر انکار کر دیا جاوے۔
(۱۰۰) پس افلاطون کے خیال کے مطابق تاریخ کا میدان صرف دلچسپ کہانیوں اور ہمت افزا قصوں کیلیئے مخصوص تھا۔ مگر اس صورت میں تاریخ سے جو سبق ملنا چاہیئے وہ کب ملسکتا تھا۔ تاریخ کا کام تو یہ ہے کہ انسانی تجربوں کو جس شکل و صورت میں فی الواقع وہ پیش آئے ہوں بیان کر دے خواہ وہ کسی کے قیاسات کے مطابق ہوں یا غیر مطابق اور وہ اصل ایسی ہی صورت میں تاریخ کا علم فائدہ بخش ہو سکتا ہے۔

افلاطون کو صرف زمانہ حال سے بحث تھی اور اِس میں اُسکی رجحان کا تھا کہ نہ صرف حالات سابقہ کو اُسنے غلط طور پر پڑھا بلکہ مستقبل کا اندازہ بھی صحیح طور پر نہ کر سکا۔ کیونکہ جو معیار گذشتہ سیاسی طریقوں کے وزن کرنیکا اُس نے قائم کیا تھا وہ ہی غلط نہ تھا بلکہ جو واقعات خاص اُسکے زمانہ میں پیش آ رہے تھے اُنکی نسبت بھی اُسکو غلط رائے قائم کرنی پڑی۔ زمانہ آیندہ کی نسبت یہ خیال کیا کہ ہر ایک شہری ریاست خود مختار اور حکومت کا بہترین نمونہ بننے والی ہے مگر یہ خیال غلط نکلا۔ کیونکہ اُسوقت کے حالات فی الحقیقت یہ خبر دے رہے تھے کہ آیندہ تمام ریاستیں ملکر ایک ہونیوالی ہیں۔ مگر یہ بات وہ تھی جسکو وہ اچھا نہ جانتا تھا۔ افلاطون کی یہ خواہش نہ تھی کہ ریاستوں کے طریقۂ حکومت میں ترمیم کرکے

انکی درستی کیجائے ۔ حالانکہ دنیا اس بات کی ضرورت محسوس کر رہی تھی کہ شہری ریاستیں ملکے حکومتیں پیدا کریں ۔ اور اصلی ضرورت بھی یہی تھی کہ گھر سے باہر کی سیاسیات پر ہر وقت نظر رکھی جاوے ۔ مگر افلاطون اسی دھن میں تھا کہ بیرونی سیاسیات کو نظر انداز کرکے اندرونی سیاسیات کے طریقوں پر غور کیا جائے ۔

کتاب القوانین میں جو خیالی ریاست افلاطون نے قائم کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کو اسنے کس نظر سے پڑھا تھا ۔ اسکے شہریوں کے واسطے حکم تھا کہ "کھانا اور کپڑا انکے لئے اعتدال کیساتھ مہیا کیا جائے ۔ کپڑا اسطرح کہ صنعت و دستکاری دوسروں کے ذمے ڈالی جائے ۔ اور کھانا اسطرح کہ جن ریاستوں میں غلام پیداوار سے ایک حصہ لیکر ان ریاستوں کی زمین میں کاشت کرتے ہیں انسے صرف اتنا غلہ وصول کیا جائے جو محض معتدل طریقے پر شہریوں کی احتیاج کو کافی ہوسکے" شہریوں کو یہ بھی حکم تھا کہ ہمیشہ ایک ہی جگہ کھانا کھائیں مردوں کا دسترخوان علیحدہ چنا جائے اور اسکے قریب ہی انکی بیویوں اور ماں بیٹیوں کے دسترخوان ہوں ۔ مردوں کے دسترخوانوں پر مرد اور عورتوں کے دسترخوانوں پر عورتیں روزانہ (۱۰۱)
نگرانی رکھیں ۔ مگر اسکے ساتھ یہ نہو کہ لوگ جانوروں کی طرح کھا کھا کر موٹے ہو جاویں کیونکہ ایسی زندگی نہ تو واقعی اچھی ہے اور نہ اس سے کسی قسم کی عزت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ کوئی شخص جو ایسی زندگی بسر کرتا ہے تکلیف و سزا سے بچ سکتا ہے ۔ کیونکہ ٹھیک ٹھیک صلہ ایک سست اور موٹے جانور کی زندگی کا یہ ہے کہ کوئی دوسرا طاقتور جانور جسکے بدن کی چربی محنت و مشقت سے چھٹ گئی ہے اسکو پھاڑ کھائے"

مگر ظاہر ہے کہ افلاطون کا یہ منشاء کبھی نہ ہوسکتا تھا کہ اسکی خیالی ریاست کے خیالی باشندے ایسی بے عزتی کی موت مریں ۔ اسکے بعد وہ اپنے شہریوں کی زندگی کیلیئے ایک طریقہ عمل قائم کرتا ہے جسمیں شیرخواری اور بچپن کا زمانہ بہت احتیاط سے گذرنے کے بعد تین برس پڑھنے اور لکھنے میں صرف کیئے جانے ضروری تھے ۔ اسکے بعد تین برس تک لائر (ایک قسم کا ستار) بجانا سکھایا جاتا تھا اور پھر اسیطرح تین تین برس حساب و ہندسہ ہیئت اور قانون کے سیکھنے اور ناچنے اور کشتی لڑنے اور دوڑنے اور شکار کھیلنے اور سخت فوجی ورزشوں میں

صرفشا ہونے لازمی تھے۔ شہریوں کو موٹا کر کے اُنکی نسل کو خراب ہونے سے بچانا بھی لازمی رکھا گیا تھا اور یہ قاعدہ نہ صرف مردوں کیلیئے بنایا گیا تھا بلکہ عورتوں کو بھی اِسکا پابند کیا گیا تھا۔

بچوں کیلیئے کہانیاں تک مقرر کر دی گئی تھیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی حال گانے بجانے ناچنے اور شعر کہنے کی تعلیم کا تھا کہ سب کیلیئے ایک نصاب معیّن کر دیا تھا۔ جسمیں رد و بدل ممکن نہ تھا۔ قانون جو پڑھایا جاتا تھا وہ اِس طریقے کا تھا کہ کوئی کتنی ہی دولت کمائے مگر سب اُسمیں برابر کے شریک رہیں۔ اور اِسی طریقے کا بہترین ہونا سب کے ذہن میں بٹھایا جاتا تھا۔ اخلاقی اور مذہبی خیالات بھی معیّن کر دیئے گئے تھے۔ جو شخص مذہب مقررہ میں کسی قسم کی جدت پیدا کرے وہ واجب القتل تھا۔ ہر چیز میں سختی پیدا کی گئی تھی اور تاکید کر دی گئی تھی کہ اُس سختی کو قائم رکھا جائے۔ مکانات اور کھیتیاں۔ شہر کے لوگ۔ بچے۔ تاجر۔ کاریگر۔ غیر ملک والے اِن سب کی ایک خاص تعداد مقرر کر دی گئی تھی کہ اُس سے بڑھنے نہ پاویں۔ مال و دولت کی مقدار بھی ان میں سے ہر ایک کیلیئے
(۱۰۲) معیّن تھی کہ کم سے کم کسقدر اور زیادہ سے زیادہ کتنی ہونی چاہیئے۔ بہ الفاظ دیگر یہ سمجھیئے کہ قومی مشارکت کے جس اعلیٰ نمونے کو افلاطون نے اپنی آخری عمر کی تصنیف یعنی کتاب القوانین میں دکھایا وہ اُس مکمل طریقۂ مشارکت کو نہ پہونچتا تھا جو اُسنے اپنی زیادہ مشہور تصنیف ری پبلک میں جو جوانی کی لکھی ہوئی تھی بیان کیا تھا۔ "قوانین" میں جس مشارکت کا ذکر ہے اُس سے مراد ایک طریقہ حکومتی نگہداشت کا ہے اور جہانتک نتائج ایک اصول سے مستنبط ہو سکے اُن سبکو یکجا کر دیا ہے۔ بلکہ یہ سمجھیئے کہ اسپارٹا کے طرز حکومت میں کچھ ترمیم کر کے اُسکی ایک مکمل صورت قائم کر دی ہے۔

ایسی آزادی کے بعد کہ اِنسان جسطرح چاہے اپنی زندگی بسر کرے جب کسی قوم سے بری حرکتیں ظاہر ہونے لگیں تو پھر اُس حالت پر ایتھنز کے ایک شریف و نجیب عالم کو رنج و تعب کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اور پھر اگر اُس رنج اور غصّے میں اُسنے قوم کے ہاتھ پاؤں باندھنے چاہے تو اُسپر

تعجب کرنیکی ضرورت نہیں ۔ اُس زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسی حکومت پر جسمیں کسی قسم کی روک ٹوک ہو اعتراض کرتے ہیں ۔ مگر سیاسیات افلاطون کا یہ طرز خیال کہ دلیل جہانتک لیجاوے وہاں تک جانا چاہیئے اور پھر ایسے طرز حکومت کو بہترین سمجھنا جسمیں اظہار خیالات اور آزادیٔ نطق کی مطلق رعایت ہو ضرور حیرت خیز ہے ۔ اگر ہم اسباب کا پورا پورا لحاظ بھی کرلیں کہ جب کوئی صاحب فکر ہر چیز کو اپنے کمال تک پہنچا دیتا ہے اور کمال اپنی ذات سے ایک ہی ہوتا ہے تو پھر ہر قسم کی تبدیلی موجب نقصان ہوتی ہے تب بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور انحطاط میں یونان کے بہترین دماغ بھی کس درجہ متناقض اور حقیقت سے بعید خیالات میں مبتلا تھے ۔

افلاطون کے نزدیک شخصی آزادی سے مراد جیسی کا ایتھنز میں اُس سے واقعی مراد لیجاتی تھی یہ تھی کہ معاشیات میں تو دولتمند مفلسوں کو لوٹیں اور سیاسیات میں مفلس دولتمندوں کی گت بنائیں ۔ اُس لیئے افلاطون نے شخصی آزادی کی بحث سے بالکل قطع نظر کی ۔ بلکہ کل مخلوق کی زندگی کا ایک مجموعی نقشہ اپنے ذہن میں پیدا کرکے انسان کی شخصی و ذاتی خواہشوں اور احتیاجوں کو اُسکے حق میں مضر سمجھا اور ریاستوں کی سلامتی اسمیں دیکھی کہ وہ اپنے بہترین آدمیوں کو حاکم بننے کی تعلیم و تربیت دیں ۔ پس افلاطون نے تعلیم کے ذریعے نجات حاصل کرنیکے اصول کو بہت بلند کرکے دنیا پر ظاہر کیا ۔ اور اُن تمام ریاستوں کی طرف سے مایوسی ظاہر کی جن میں (۱۰۴)
قانون کا وضع کرنا اور اسکا نفاذ قوم کے چند منتخب اور اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ دانشمندوں کے سپرد نہ کیا گیا ہو ۔ ایتھنز کی حکومت عمومیہ اُن تمام خیالات کی نفی کرتی تھی اور افلاطون چونکہ ایک پرجوش طبیعت رکھتا تھا اسلیئے حکومت عمومیہ سے وہ قدرتی طور پر متنفر ہو گیا ۔

(افلاطون کو شہنشاہیت سے بھی نفرت تھی ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عہد پیرکلیس کی حکومت عمومیہ کو بھی جسکی بنیاد شہنشاہیت پر رکھی گئی تھی بحیثیت ایک سیاسی نظام کے ناپسند کرتا تھا ۔ آجکل بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اسی شہنشاہیت کی وجہ سے اور اس غلط خیال کی بنیاد پر کہ ایتھنز کی حکومت عمومیہ کا

وار و مدار رواج غلامی پر تھا اس حکومت کو اچھا نہیں سمجھتے اور یہ کہکر چپ ہوجاتے
ہیں کہ درخت کا اندازہ اسکے پھل سے کرلینا کافی ہے۔ یہ لوگ یونان کے علم و ہنر
اور اسکی خوبیوں کو ایسی ہی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی مدقوق کی صورت کو دیکھے
کہ تبخیر کی وجہ سے چہرے پر ایک طرح کی رونق آگئی ہے۔ مگر افلاطون ان لوگوں
کا بھی ہم خیال نہ تھا۔ وہ درخت سے کہیں زیادہ اسکے پھلوں کو زہریلا سمجھتا تھا۔
قوانین کے ایک مکالمے میں کہتا ہے کہ "موسیقی" جس سے اسکی مراد ساز کے ساتھ
اشعار پڑھنے کی ہے" وہ چیز ہے جس نے ایتھنز کے لوگوں میں ہمہ دانی کا زعم
پیدا کیا اور اس زعم میں بالکل بے لگام ہوکر وہ مغرور و متکبر ہوگئے۔ اسکے بعد
ان میں آزادی آئی۔ اور یہ سمجھکر کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ کچھ بھی
نہ جانتے تھے انھوں نے کسی بات کا خوف نہ کیا۔ اور جب خوف دل سے
نکلگیا تو جیسے ہمیشہ ہوتا ہے ان میں بے غیرتی پیدا ہوگئی اور یہی بے غیرتی
جو سخت عیب ہے ان میں اسطرح ظاہر ہوئی کہ ایک بے باکانہ آزادی رکھنے
کی وجہ سے بالکل گستاخ ہوکر ایسے لوگوں کی رائے کو تسلیم کرنے سے جو ان
سے بہتر تھے بالکل انکار کرنے لگے۔" اس گفتگو کو سنکر ایک اسپارٹی جو ہمیشہ اس قسم کے
مکالموں میں موجود رہتا ہے بول اٹھتا ہے کہ "آپکا یہ خیال بالکل بجا و درست ہے"۔
اسکے بعد مقرر کہتا ہے کہ "اس مذموم بے باکی کے بعد یہ آزادی پیدا ہوتی ہے کہ (۱۰۴)
حاکموں کے حکموں سے روگردانی کرتے ہیں۔ اور والدین اور بزرگوں کے قابو
سے باہر ہوجاتے ہیں۔ اور آنکی کسی نصیحت کو نہیں مانتے یہانتک کہ قانون کی
پابندی سے بھی قطعی ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ اور پھر اس سے بھی آخر درجہ یہ آتا
ہے کہ نہ اپنے انجام کی پروا کرتے ہیں۔ نہ اپنے وعدوں کا خیال کرتے ہیں
اور نہ دیوتاؤں کا ادب کرتے ہیں۔ اور اسمیں وہ قوم تائیتون کی تقلید کرتے ہیں۔
اور اس حالت کو پہنچ جاتے ہیں جو منکر خدا ہونیکے بعد اس قوم کی پہنچی تھی اور اسطرح
خیر سے گذر کر شر کی زندگی سے پیوستہ ہوجاتے ہیں۔"
اسمیں کلام نہیں کہ آجکل کا وہ نقاد بھی جس نے شاعر یوریپڈیس کو جو حکومت
عمومیہ شدیدہ کے دور کا ڈراما نویس تھا اِس الزام کے دینے میں حصہ لیا ہو کہ

اِس شاعر نے اٹیکا کے دردیہ ناٹک میں سرودی ناٹک (میلو ڈراما) اور اوپرا کنسرٹ کے عناصر شامل کر کے اُسکو بگاڑ دیا اور اُسکی عبارت اور موسیقی کی شکل رکیک مضامین اور نامناسب بحروں سے مسخ کر دی۔ اور جس حسن و خوبی سے ڈراما کے لوگوں (کیرکٹروں) کے اوصاف قصے میں ظاہر ہوتے تھے اور خود قصے کی جو عمدہ ترکیب ہوتی تھی اُسکی جگہ بے لطف و بے محل مباحثے عورتوں کے متعلق یا حال کے عجیب و غریب علمی و فلسفی مسائل کے تذکرے بیچ میں لا کر دردیہ ناٹک بدنما کر دیا یا پرانے دیوتاؤں اور سورماؤں کی زبان و حرکات سے ایسی باتیں ادا کرائیں جو حال کے زمانہ ساز لوگوں یا سورماؤں کو زیب دیتیں اُسکی خوبی میں فرق پیدا کر دیا تو ایسا نقاد بھی مثلاً پروفیسر شوری بھی جس نے شاعر سوفیکلیز کی حمایت بڑے جوش سے کی ہے افلاطون کے اُس قول کو سنکر افلاطون سے کنارہ کشی کریگا کہ ایتھنزیوں کی بزرگی کے زوال کا باعث در اصل اُنکا ڈراما تھا۔

"قوانین" میں افلاطون نے بڑی عمر میں دنیا کا زیادہ تجربہ حاصل کر کے ایسی چیزوں سے بحث کی ہے جنکو وہ قابل اصلاح سمجھتا تھا۔ اپنی پہلی تصنیف
"ری پبلک" میں اُسنے کسب دولت۔ زمین۔ گھر اور اہل و عیال رکھنے کے ۱۰۵
شوق کو اصلاح طلب چیزوں میں شمار کیا تھا۔ لیکن "قوانین" میں اُسنے اُن چیزوں کو قابل اصلاح نہیں ٹھہرایا۔ اور انسان کی کمزوری سے بہت کچھ چشم پوشی کی۔ مگر حرص دولت کو اُسنے کسی حال میں گوارا نہ کیا۔ ذرا غور کیجئے۔ یہ لوگ یونانی تھے کوئی اور بھی نہ تھے کہ جن کی نسبت افلاطون کہتا ہے کہ "وہ دولت کی طمع میں ہر وقت مبتلا ہیں اُنکو اتنا وقت نہیں ملتا کہ مال و دولت کے سوا کسی اور بات کیطرف متوجہ ہو سکیں۔ دولت ہی میں سب کا دم اٹکا ہے۔ اور سوائے اُس خیال کے کہ آج کتنا نفع کما لینا چاہیئے اور کسی بات کا خیال اُنکے ذہن میں نہیں۔ کوئی علم و ہنر کوئی پیشہ اور کام جس سے روپیہ پیدا ہو سیکھنے کو تیار ہیں۔ باقی سب چیزوں پر ہنستے ہیں"
"............ سونے چاندی کی حرص اور طمع میں جس کا

سیر ہونا ممکن ہی نہیں ہر شخص تیار ہے کہ کوئی فن کوئی کام جس سے روپیہ پیدا ہوتا
ہو اسکو فوراً اپنا پیشہ بنالے۔ جانوروں کی طرح کھانے اور ہر طرح کی چیزیں پینے یا
ہوا و حرص کو بجھانے اور نفس پروری کیلئے کوئی شکل بھی پیدا ہو خواہ پاک ہو یا
ناپاک خواہ نیک ہو یا بد اسکو اختیار کرنے میں ذرا عار نہیں۔"

افلاطون کے زمانے میں یہ حالت اُسوقت تھی جبکہ ایک شہری دوسرے
شہری کو اور ایک ریاست دوسری ریاست کو کھاتی اور لوٹتی تھی۔ لیکن اس
زمانے سے پہلے یہ حالت نہ تھی۔ پیشتر اس سے کہ امیرانہ ٹھاٹھ اور پُر تکلّف مذاق
پیدا کیا گیا تاکہ مادۂ ایجاد کو ترقّی ہو اور پیشتر اس سے کہ زرِ مسکوک جاری کیا گیا تاکہ
اسکا اندازہ نہ رہے کہ کہاں تک دولت کمانے کے بعد قناعت کرلی چاہیئے
پرانے لوگوں کا دستور تھا کہ "گرمی کے موسم میں ننگے گلے اور ننگے پاؤں اور
جاڑے میں موٹے جھوٹے کپڑے اور جوتا پہنے اپنے اپنے کام میں مصروف (۱۰۶)
رہتے تھے۔ جَو کا دَلیا یا گیہوں کا آٹا جسکو گوندہ کر روٹی سینک لیتے تھے اُنکی
گذر کیلئے کافی ہوتا تھا۔ کھانا ایک بوریئے کے ٹکڑے پر یا صاف ستھرے
پتوں پر رکھکر کھاتے تھے۔ اور اُسکے پاس ہی بچھونوں پر حنا کے پتے پھیلاکر
آرام سے بیٹھے یا لیٹے رہتے تھے بال بچّے سب ساتھ بیٹھکر کھاتے اور اپنے
ہاتھ کی بنائی ہوئی شراب پیتے تھے۔ پھولوں پتوں کے ہار سر پر لپیٹ کر دیوتاؤں
کے بھجن گاتے اور خوش ہوکر آپس میں باتیں چیتیں کرتے۔ اسبات کا بہت
خیال رکھتے کہ بیوی بچّے مقدور سے زیادہ خرچ نہ کریں۔ ہر وقت افلاس
اور لڑائی کا خیال سامنے رہتا۔ مگر یہ سادگی اور ابتدائی حالت کا زمانہ
وہ نہ تھا جسکو افلاطون اپنے ہم زمانہ لوگوں کو یاد دلایا کرتا تھا۔ افلاطون
جس زمانے کو یاد دلاتا تھا وہ شہری ریاستوں اور اُنکے موجودہ کاروبار تجارت
سے کچھ پہلے کا زمانہ تھا۔ اور چاہتا تھا کہ موجودہ شہروں کے آباد ہونے اور
تجارت میں مال و دولت لگانے سے پہلے جو سادگی اور نیک چلنی دیہات
وقصبات کے لوگوں میں تھی اُسکو پھر زندہ کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب بات
ہے کہ اپنے زمانے کی بحری تجارت یا سوداگری و خوردہ فروشی یا صنعت و حرفت کے

کاموں سے یا مہاجنی اور سودی لین دین یا اسی قبیل کے اور کاموں سے جو شہروں کے مابین ہوتے رہتے تھے افلاطون کو سخت اختلاف تھا۔ ان چیزوں کو برا ہی نہیں جانتا تھا بلکہ کہا کرتا تھا کہ یہ ہی چیزیں وہ ہیں جنکی کبھی خواہش نہ کرنی چاہیے کیونکہ یہ ہی باتیں جنگ وجدال اور دشمن کی فتوحات کا باعث ہوتی ہیں۔ مگر باوجود اسکے اپنی خیالی حکومت کے خیالی لوگوں میں علم وفضل کا ہونا اور انکا ایسے سامان راحت وآسائش سے مہیا رہنا جو تجارت میں دولت لگانے سے میسر آتا ہے وہ بہت ضروری سمجھتا تھا۔ اسمیں شبہ نہیں کہ اسکے خیالی شہر کے لوگ کاشتکار ہیں لیکن شریف اور آسودہ حال کاشتکار ہیں جنھوں نے اپنا سرمایہ کھیتی اور غلاموں پر لگا رکھا ہے۔ اور ان چیزوں سے جو آمدنی ہوتی ہے اسپر اپنا گزر کرتے ہیں۔ وہ خود بالکل آزاد ہیں کہ اپنا کل وقت جسمانی ورزشوں یا دماغی کاموں یا دل آویز مشغلوں میں صرف کریں۔ ان لوگوں میں افلاطون نے ایک وصف یہ بھی رکھا تھا کہ انکو دولت کی طمع نہ تھی کیونکہ ہر شخص "کافی مقدرت" رکھتا تھا۔ "مقدرت" کی تعریف افلاطون نے تو یہ کی تھی کہ اعتدال وپرہیزگاری سے زندگی بسر کرنیکا مقدور جسکو ہو وہ صاحب مقدرت ہے۔ مگر ارسطاطالیس "صاحب مقدرت" اس شخص کو کہتا تھا جو فراخ دستی اور پرہیزگاری سے زندگی بسر کرنے کیلئے کافی مقدور رکھتا ہو۔ افلاس کی نسبت ان دونوں فلسفیوں کا یہ خیال تھا کہ افلاس ایسے کاموں کا حکم دینے والا ہے جن میں جان وجسم دونوں کا زوال ہے اور جس کسی کو ایسے کام کرنے پڑتے ہیں وہ ذلیل وخوار ہوجاتا ہے یہانتک کہ آخری نوبت میں اسکی حالت غلامی کی ہوجاتی ہے۔

افلاطون اور ارسطاطالیس دونوں نے کھیتی کیلئے یا کھیتی وتجارت کیلئے غلاموں اور پردیسیوں کو تجویز کیا تھا ان غلاموں اور پردیسیوں کی زندگی کا مآل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اپنے مالکوں اور حاکموں کی ایسی ضروریات کو مہیا کرتے رہیں جو آسائش سے زندگی بسر کرنے کی ہوتی ہیں۔ اسی مضمون کے سلسلے میں ارسطاطالیس لکھتا ہے کہ ہم کو یہ امر مخفی نہ رکھنا چاہیئے کہ "پانچہزار شہریوں کی معاش کیلئے جو تن آسانی اختیار کریں ایک ایسے وسیع ملک کی ضرورت ہوگی جو شاید ارض بابل یا اس سے بھی زیادہ وسیع ملک کے

برابر ہو۔" یہ اندازہ جو چوتھی صدی قبل مسیح کے سب سے بڑے دانشمندوں نے ایک خیالی قوم کی بہترین معاشی حالت کا کیا تھا ایسا اعلیٰ درجے کا تھا کہ امریکہ اپنی موجودہ حالت میں بھی اسدرجے کو نہیں پہنچا ہے۔ امریکہ میں ایک حساب سے ملک کی مجموعی دولت کا نوے فیصدی حصہ کل آبادی کے دس فیصدی لوگوں کے قبضے میں ہے۔ معلوم نہیں افلاطون اس بات کو سمجھتا تھا یا نہیں کہ اس حساب سے وہ اپنی خیالی ریاست میں کل آبادی کے نوے فیصدی لوگوں کی گردن میں جہالت اور غلامی کا طوق ڈال رہا ہے۔ اگر اس نکتے کو وہ سمجھتا تھا تو پھر یہ کہنا پڑیگا کہ اسنے بجز معدودے چند لولوں کے کسی کے لیئے ثروت و اقبالمندی کی گنجایش رکھنی مناسب نہ سمجھی۔ بہرکیف دونوں صورتوں میں نتیجہ واحد ہے اور وہ یہ کہ افلاطون کو مطلق کامیابی نہیں ہوئی کہ وہ اسپارٹا کی علمی شورازاری اور اپنے شہر ایتھنز کی حیرت خیز علمی سرسبزی کے تاریخی اسباب دریافت کر لیتا۔

(۱۰۸) "قوانین" میں افلاطون نے جس خیالی ریاست جمہوریہ کو بیان کیا ہے اگر ارسطاطالیس اسمیں آباد ہوتا تو جسطرح ایتھنز میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا ارسطاطالیس کا بھی یہی درجہ ہوتا۔ ارسطاطالیس گو اپنے استاد افلاطون کا ناشکر گذار شاگرد نہ تھا لیکن وہ ایسا شاگرد بھی نہ تھا جو استاد سے دب جاتا۔ پیدایش کے اعتبار سے وہ استاگیری کا باشندہ تھا۔ تجربے کے اعتبار سے اسکو تمام دنیا کا باشندہ کہنا چاہیئے۔ افلاطون کی طرح اسکی زندگی ایسی صحبت میں نہ گذری تھی جو ایک بداخلاق و کج رفتار جمہور کی حکومت سے ہر وقت پیچ و تاب میں رہتی ہو۔ جسوقت سترہ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ ایتھنز میں آیا تو وہاں حکومت جمہوریہ کا دور دورہ تھا مگر حالت خراب تھی۔ ارسطاطالیس نے اس حکومت کو پسند نہیں کیا۔ لیکن اسکی طبیعت میں وہ جوش نہ تھا جو افلاطون کی طبیعت میں تھا۔ فن تاریخ میں اسنے بہت سی کتابیں لکھیں جو ضائع ہو گئیں مگر انمیں سے ایک نسخہ اتفاق سے مصر میں ملگیا ہے۔ اس کتاب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑا مورخ نہ تھا۔ مگر اسکے عالم متبحر ہونے میں کلام نہیں اور یونان کی تاریخ پر اسکو اسدرجے عبور ضرور تھا جو ایک سیاسی فلاسفر کو ایسی حالت میں ہو سکتا ہے

کہ واقعات سابقہ کی تحقیقات کیلئے سوائے چند غیر مستند طریقوں کے جو اُسوقت
جاری تھے اور کوئی وسیلہ پاس نہو۔

سائینس کا قدرتی تعلق محسوسات خارجی سے ہے۔ سائینس انسان کے
حق میں بے درد نہیں ہے۔ لیکن اُسمیں کہیں شخصیت یا انانیت نہیں ہے۔
اور اس خصوص میں وہ فنون سے ممیز ہے۔ کسی فن کا بڑے سے بڑا ماہر چاہے
شاعر ہو یا مصور یا بت تراش وہ اپنے خیالات کو الفاظ یا رنگ یا پتھر میں
مرتسم کرتا ہے۔ اگر اُن خیالات کے اجزاء پر جدا جدا غور کیجئے تو وہ بالکل عام
ہوتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی مصنّف کے نقش میں وہ بعینہٖ اُسکی طبیعت کا نمونہ
ہوجاتے ہیں یا یہ کہئے کہ مصنّف اپنی ذات سے اُس نقش میں موجود ہوجاتا ہے۔
تاریخ دراصل ایک سائینس ہے مگر معمولی قسم کا نہیں۔ ایک سائنٹیفک مورّخ کا
حال معمولی سائینس دان کا سا نہیں ہوتا۔ سائنٹیفک مورّخ کو اُسکی مزاولت
کرنی ہوتی ہے کہ اپنی ذات و شخصیت سے قطع نظر کر کے اپنی نظر کو وسعت دے۔ ۱۰۹
اور جہانتک امکان میں ہو اپنے زمانے میں جسقدر باتوں سے نفرت یا رغبت
رکھی جاتی ہے اُنکا علم پیدا کرے۔ مگر اُن سب چیزوں سے قطعاً بےتعلق ہوکر
ایک اجنبی ملک میں وارد ہو۔ اور بالکل بے طرفداری سے وہاں کی کیفیت لکھکر
وطن میں لائے اور وطن میں آکر اپنی کہانی اسطرح سُنائے کہ وہ اہل وطن یا کم سے کم
اپنے تمام ہم مشرب مورخوں کی سمجھ میں آجائے۔ اُسکا کام یہ نہیں ہے کہ عہد ماضی
کی حکایتیں زمانۂ حال کے رنگ میں سنائے یا واقعات سلف کی تحلیل اُنہی اجزا
میں کردے جن میں آجکل کے واقعات تحلیل کر کے پیش کیئے جاتے ہیں۔ اُسکو اسکا
علم ہونا بھی ضروری ہے کہ تاریخ کا زمانۂ ماضی کوئی بسیط یا مسلسل شئے نہ تھا۔ ماضی
کے مختلف و متعدد زمانے تھے جو زمانۂ حال پر مختتم ہوئے۔ اُنکی ترتیب کا علم
کہ کونسا پہلے تھا اور کونسا پیچھے نہ تو پہلے سے معلوم چلا آتا ہے اور نہ یہ ظاہر
ہوتا ہے کہ اُنمیں یکے بعد دیگرے ہمیشہ ترقی کا سلسلہ قائم رہا۔ یہ سچ ہے کہ نقطے
جب ملائے جائینگے تو خط پیدا ہوگا مگر یہ خط ہر قسم کے پیچ و خم کا خط ہو سکتا ہے۔
ارسطاطالیس کو تحقیقات تاریخی کی مشکلات کا پورا اندازہ نہ ہوسکا۔ لیکن تاریخ کا

علم حاصل کرنے میں برخلاف افلاطون کے اسنے کوشش و محنت کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

ارسطاطالیس نے پرانے وقتوں کے نظامہائے حکومت کی نسبت یہ خیال نہیں کیا کہ بس یہ ہی اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے "اگر ایک ریاست میں سب لوگ کمر میں خنجر لگائے پھریں تو قیاس ہوسکتا ہے کہ خنجر کی انکو ضرورت ہے اور خنجر سے وہ کام بھی لیتے ہونگے۔ جس سے حالت کشت و خون کی رہتی ہوگی۔ اُس حال میں اگر انظم حکومت میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنی ممنوع قرار پاچکی ہے تو یہ حالت کشت و خون کی ہمیشہ قائم رہیگی"۔ پس اُس حکیم کے نزدیک یہ امر مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ قوانین کو وقتاً فوقتاً تبدیل کیا جاوے۔ اسپارٹا کی اُس بات کو ضرور قابل تعریف سمجھتا ہے کہ اُسکے قوانین مستقل طور پر نافذ ہیں لیکن اُسکے ساتھ ہی اسپارٹا کے انحطاط و زوال کا باعث بھی اُس بات کو قرار دیتا ہے کہ حکومت میں جن اصلاحوں کی ضرورت تھی اُنکی طرف پوری توجہ نہیں کیگئی۔ خلاصہ یہ کہ اسپارٹا اور ایتھنز نے جو جو باتیں حاصل کی تھیں اُنکی بھلائی یا بُرائی کا اندازہ جیسا ٹھیک ارسطاطالیس نے کیا افلاطون سے نہ ہوسکا۔

(۱۱۰) کسی حکمران خاندان، یا نظم حکومت کی عمدگی یا غیر عمدگی کے اندازے کیلیئے ارسطاطالیس نے سب سے پہلا معیار یہ قرار دیا تھا کہ اُس خاندان یا حکومت کی ساخت و ترکیب کو دیکھا جائے کہ آیا وہ فطرت کے مطابق ہے یا غیر مطابق یعنی جس ترکیب سے وہ موجود ہے وہ انسان کی اُس فطرت سے جو اُسکی تاریخ سے ظاہر ہوتی ہے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ جس فن سیاست کی بنیاد ایسی فطرت پر رکھی گئی ہو جو حد کمال کو پہنچ چکی ہے تو پھر وہ فن دیوتاؤں اور دیوتاؤں کی اولاد کیلیئے مخصوص ہوگا نہ کہ معمولی انسان کے لیئے۔ اور یہ کہ نظم حکومت کے وہ ہی اصول درست کہے جاسکتے ہیں جو عمل میں ٹھیک اترتے ہوں۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "جسقدر باتیں دریافت کرنیکی تھیں وہ دریافت ہوچکی ہیں لیکن بعض صورتوں میں اُنکو ملا کر امتحان نہیں کیا گیا اور بعض صورتوں میں

اُنکا عمل ابھی تک نہیں دیکھا گیا۔ ارسطاطالیس کی کتاب سیاسیات کی نسبت حال کے ایک مصنّف نے لکھا ہے کہ "انتظام حکومت کے فن میں یہ ہی ایک کتاب ہے جسکی بنیاد تجربے پر رکھی گئی ہے۔"

یہ تعریف زیادہ ہے۔ ہم کو اٹلی کے مشہور مصنّف میکاولی کی مشہور کتاب پرنس (ملک زادہ) پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ تجربہ و مشاہدے کے مسئلے کو چھوڑ کر ارسطاطالیس کی کتاب میکاولی کی کتاب سے بعض امور میں اختلاف رکھتی ہے۔ بالخصوص اِس بات میں کہ یونانی حکیم نے اخلاقی نمونے بھی قائم کیئے ہیں مگر اٹلی کے مصنّف کو اخلاق سے کچھ بحث نہیں۔ ارسطاطالیس اور افلاطون دونوں کے نزدیک ریاست کا مقصد اصلی مذہب و اخلاق ہے۔ یہ دونوں حکیم ایک ریاست سے اسی امر کے متوقع نہیں ہوتے کہ وہ اپنی اعمال کی درستی کا ثبوت از روئے مذہب و اخلاق پیش کریگی بلکہ عالم موجودات میں وہ اپنے ظاہر ہونیکو بھی ایک اخلاقی ضرورت ثابت کریگی۔ ظالم و بے انصاف ریاستیں دنیا میں ہوتی ہیں اور ارسطاطالیس کے زمانے میں اُنکی کمی نہ تھی۔ مگر اِس حکیم کا دماغ سیاسی معاملات پر غور کرنے میں ایسا تیز تھا کہ یہ ظالم ریاستیں بھی اُسکے مشاہدے سے نہ بچیں۔ اُسنے تمام ایسے طریقوں اور ذریعوں پر غور کیا تھا جن سے ہر قسم کی حکومت و ریاست کو استحکام ہوتا ہے اور اُس باب میں واقعات کی اصلیت پرکھنے میں اُسکی نظر بھی ایسی ہی خاص معلوم ہوتی ہے جیسے میکاولی کی۔ لیکن ارسطاطالیس سے کسی واضع قانون کو اس بات کی ہدایت ملتی تو درکنار کبھی وہ اُس حالت کا روادار بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک (۱۱۱) عادلانہ حکومت قائم کرنے کیلیئے فاسد اور ایک ظالمانہ حکومت کیلیئے نیک وسائل سے کام لینے کو جائز قرار دیا جائے۔

نظامہائے حکومت قائم کرنیکا مضمون ایسا نہ تھا جس پر ارسطاطالیس نے زیادہ غور کیا ہو۔ لیکن میکاولی کا خاص مضمون یہ ہی تھا۔ چنانچہ اُسنے اپنی کتاب کے دوسرے حصّے کے شروع میں لکھا ہے کہ "تمام حکومتوں کی بنیاد خواہ وہ جدید ہوں یا قدیم یا جدید و قدیم دونوں کی ترکیب سے بنی ہوں اُسپر ہے کہ عمدہ قوانین اور عمدہ آلات حرب اُنکے پاس موجود ہوں۔ اور جسوقت تک

کسی حکومت کے پاس حرب کیلیئے عمدہ آلات نہ ہونگے عمدہ قوانین بھی اُسکے پاس نہ ہونگے۔ اُس سے نتیجہ یہ نکلا کہ جس حکومت کے آلات حرب عمدہ ہیں اُسکے قوانین بھی عمدہ ہیں اب میں قوانین کی بحث سے علیٰحدہ ہوکر آلات حرب سے بحث کرتا ہوں۔ اگر ارسطاطالیس اُس بحث کو سنتا تو دلیل اور نتیجے دونوں پر لعنت بھیجتا۔ میکاولی کی دلیل میں کج روی ہے مگر نتیجہ اسوجہ سے ناقص نہیں کہ مطلق العنان بادشاہوں کو جن سیاسی وسائل سے کام نکالنا چاہیئے اُن سے وہ پہلے بحث کرچکا ہے۔ ارسطاطالیس کی کتاب واضعان قانون کی رہنمائی کیلیئے ہے اور میکاولی کی کتاب بادشاہوں کی ہدایت اور عمل کیلیئے۔ میکاولی کی رائے میں وہ طریقے اور وسائل جن سے قوت حاصل کیجاوے سب سے بڑی چیز ہیں۔ ارسطاطالیس نے واضعان قانون میں قوت واختیار کا وجود پہلے ہی سے مان لیا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر واضعان قانون نے یہ معلوم کرلیا ہے کہ اُنکی ریاست کی معاشی وسیاسی حالت کے لحاظ سے نظمِ حکومت کا کونسا طرز اور کس قسم کے قوانین اور طریقۂ تعلیم بہتر ہیں تو پھر اُن چیزوں کو اپنی ریاست میں جاری کرنے کا اُن کو پورا اختیار ہوتا تھا۔

پس ہر صورت میں سمجھنا چاہیئے کہ میکاولی کی کتاب "پرنس" اور (۱۱۲)
ارسطاطالیس کی کتاب سیاسیات ایک دوسرے کا ضمیمہ ہیں گو ہم اُسکے معترف ہیں کہ ارسطاطالیس اُس خیال کو سنتا تو اُسکے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے کیونکہ ارسطاطالیس کے خیال میں دنیا کیلیئے حکومت کا بہتر سے بہتر نمونہ قائم کرنے کیلیئے ہر شہری ریاست کو اختیار تھا کہ اپنے اندرونی معاملات کا انتظام ایسے طریقے سے کرے جسکو بہترین سمجھتی ہو۔ اور جب یہ اختیار تھا تو پھر جس طریقۂ انتظام کو اُسنے بہترین سمجھا اُسمیں فلسفۂ سقراط کی پابندی لازم آجاتی تھی یعنی اُسکا فرض ہوجاتا تھا کہ فوراً اُس طریقے پر عمل کرے جسکو بہترین سمجھا ہے۔ لیکن شیطان کو شیطان کا صلہ دینے کے لیئے اتنا کہنا ضروری ہے کہ میکاولی کو جس چیز نے شہزادہ لارنزو کیلیئے ایک مجموعۂ ہدایات تیار کرنے پر مجبور کیا وہ اُس بات کی ہوس تھی کہ کسی طرح اٹلی کا تمام ملک اُس شہزادے کے قبضے میں آجاوے۔ اور اُس قبضے کیلئے اور اٹلی کی شہری ریاستوں کو

اپنا غلام بنانے کیلئے جس قدر جرائم کا ارتکاب ضروری ہو انکو پہلے ہی دھو دھلا کر جائز کر دیا جائے۔ کتاب میں ایک فرضی شہزادہ قائم کیا گیا ہے جو مجموعہ کمالات ہے۔ اسکے ہاتھ تمام اٹلی کا فتح ہو جانا میکاولی کی کتاب کا مضمون ہے۔ لیکن ارسطاطالیس اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ " اگر اہل یونان متحد ہو کر مختلف حکومتوں کو شامل کر کے ایک ہی ریاست قائم کرلیں تو وہ ایک ایسی شہنشاہی جو تمام دنیا پر حکم رکھتی ہو قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اُس قسم کے اتحاد کو ہرگز لائق تمنا نہیں سمجھتا۔ اسکے نزدیک ایسی ریاست جو شہری ریاست نہیں ہے بالکل ایک خام اور ابتدائی صورت کی ریاست ہے اور جسوقت وہ آزادی سے محروم ہوئی تو پھر وہ ریاست نہیں۔ پس ایک شہری ریاست کیلئے یہ ممکن ہے کہ اسکے تحت میں رعایا اور غلام ہوں لیکن کوئی ریاست اسکے تحت میں نہیں آسکتی (کیونکہ جب کوئی ریاست اپنی آزادی کھو کر دوسرے کے تحت میں گئی تو پھر وہ ریاست نہیں) اور چونکہ اسکے نزدیک کم مایگی غلامی کا موجب ہو سکتی ہے اور یہ کم مایگی خاصکر ایشیائی قوموں میں پائی جاتی ہے مگر یونان میں وہ نام کو نہیں اسلیئے کوئی یونانی ریاست دوسری یونانی ریاست کے لوگوں کو جائز طور پر اپنا غلام نہیں بنا سکتی۔ وہ صرف غیر یونانی قوموں سے لڑ سکتی ہے یا اپنے غلاموں کو ان سے لڑنے کیلئے تیار کر سکتی ہے۔

حکومت عمومیہ سے بلاوجہ نفرت کرنا گویا افلاطون کے جسم کا وہ پیدائشی (۱۱۳)
داغ تھا جسکی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ مگر ارسطاطالیس کے سیاسی خیالات کو جس چیز نے داغ لگایا وہ شہنشاہیت کے ساتھ اسکے زمانے کی نفرت تھی۔ یہ داغ بھی بدنامی کی ایک علامت تھی جسکو ہم ابھی ثابت کرینگے۔ ارسطاطالیس نے جہاں ریاستوں کیلئے نظم حکومت کا بہترین طریقہ یہ بتایا ہے کہ طرز عمومیہ (ڈیموکریسی) اور عدیدیہ (اولیگارکی) کو شامل کر کے ایک معتدل طریقے کی حکومت (پولیٹی) پیدا کیجاوے وہاں اخیر میں لکھا ہے کہ " اُس کام کو ایک ایسے اصول سے شروع کرنا چاہیئے جو کل صورتوں پر حاوی ہوتا ہو۔ یعنی اصول ایسا رکھا جاوے کہ باشندگان ریاست کا وہ حصہ جو اُس معتدل

حکومت کو قائم رکھنا چاہتا ہے اُس حصّے سے زیادہ "طاقتور" ہو جو اُسکو قائم نہ رکھنا چاہتا ہو"۔ اسکے بعد بتاتا ہے کہ "طاقت" جس چیز میں مخفی ہے وہ نہ تو تعدادِ نفوس ہے اور نہ دولت و مال۔ اور نہ حربی یا سیاسی قابلیت بلکہ اُن سب چیزوں کے مجموعے کا نام "طاقت" ہے۔ اس لئے آزادی اور دولت۔ علم و فضل۔ شرافت۔ نیز تعدادِ مردم کی کثرت کا لحاظ کرنا ضروری ہے"۔ مگر ہمارے نزدیک اُس اہم مسئلہ پر ارسطاطالیس کا اسطرح خیال کرنا ایسا ہے جس سے زیادہ کوئی چیز مشکوک اور قابل اعتراض نہیں کیونکہ اسمیں ایک عجیب فروگذاشت ہوئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس حالت میں اُس "طاقت" کے واسطے یہ حکم لگایا گیا ہے کہ شہری ریاستوں کے اندرونی انتظام میں وہ پورے طور پر اپنا عمل کر سکتی ہے اُس بات سے قطعی چشم پوشی کیگئی ہے کہ ریاستوں اور ریاستوں کے مابین اُنکی آبادی و دولتمندی۔ حربی و سیاسی لیاقتوں کا فرق کسقدر مختلف قسم کے تعلقات اُنمیں پیدا کر سکتا ہے۔

ارسطاطالیس کے تمام سیاسی خیالات میں یہ خیال سب پر چھایا ہوا ہے
۱۴۱۱ کہ انسانوں کی دنیا ایک لا متناہی صف اعلیٰ اور ادنیٰ لوگوں کی ہے اور ہر متنفس کی یہ خواہش کہ دوسرے سے آگے نکل جائے انسانی سرشت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اگر خدائے علیم جسکے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے ہر شہری ریاست کے باشندوں کو اُنکی اصلی طاقت کے مطابق صفوں میں ترتیب دے تو اُنمیں بہت کم ایسے ہونگے جو آگے کی صفوں میں رکھے جائینگے۔ لیکن یہ خیال یونانیوں کی طبیعت کا خمیر ہو گیا تھا اور ارسطاطالیس کے قلم سے جس ہوشیاری اور ذہانت کیساتھ وہ ادا ہوا ہے اور کسی سے ادا کرتے بن نہ پڑا کہ اہل یونان دنیا کی قوموں میں عزت و مرتبے کے اعتبار سے سب میں برتر ہیں۔ اسلیئے یونانیوں کا گویا یہ ایک لازمی فرض ہے کہ وہ ایشیا کے لوگوں کو مغلوب کریں کیونکہ اعلیٰ قوموں کا ادنیٰ قوموں پر حکومت کرنا ارسطاطالیس کے خیال میں فطرت کا ایک حکم تھا جو کمزوروں کے فائدے کیلیئے جاری ہوا تھا۔ فلسفۂ اخلاق کے حکیموں کیں ارسطاطالیس ہی میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ

مساوات انسانی کے نظر فریب سراب سے وہ ہرگز اپنے تئیں دھوکے میں نہ پڑنے دے۔ مگر باوجود بیان میں احتیاط اور اِس بات کو تسلیم کرنے کے کہ یونان کی شہری ریاستیں "طاقت" کے اعتبار سے اسقدر غیر مساوی واقع ہوئی ہیں کہ اتنا فرق انسان اور انسان کی جسمانی قوت میں بھی نہیں ہوتا ارسطاطالیس نے اس امر کو جائز نہ سمجھا کہ جو زیادہ طاقتور ہیں وہ طاقت کے بل پر نفع حاصل کریں۔ ریاستوں کے باہمی معاملات یعنی مابین الاقوامی تعلّقات کو اُسنے بالکل ایک علیحدہ چیز سمجھا اور اُن سے یہ عام اصول متعلق نہیں کیا کہ اعلیٰ ادنیٰ پر حکومت کرے۔ خیالی دنیا میں ایک "طاقتور" انسان ارسطاطالیس کے خیال کے مطابق "حلیم الطبع انسان" ہوسکتا ہے مگر واقعات کی دنیا میں وہ ایک حاکم ہی ہوتا ہے۔ اگر ارسطاطالیس کی آنکھوں پر اُن تعصبات کا پردہ نہ پڑجاتا جو شہنشاہیت کی نسبت اُسکے زمانے میں موجود تھے تو وہ سمجھ جاتا کہ واقعات کی دنیا میں ایک طاقتور ریاست کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے سے کمزور ریاست پر حاکم بنے۔ بہرکیف ارسطاطالیس کے اُن خیالات کو پڑھکر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوئے۔ کیونکہ فیلقوس بادشاہ مقدونیہ کے عہد میں وہ پیدا ہوا تھا اور مدّت تک اُسی کی رعیت رہا تھا۔ اور یہ بادشاہ وہ تھا جس نے یونانی ریاستوں کو اپنا مغلوب و محکوم بنایا تھا۔ اُسی طرح یہ بھی طنز تقدیر کا ایک نمونہ معلوم ہوتا ہے کہ ارسطاطالیس آزادی کا اتنا بڑا حامی اسکندر اعظم فاتح دنیا کا معلّم اور اتالیق ہو۔

چوتھا باب

اسکندرِ اعظم[۱] اور دُنیا کی بادشاہی

اسکندرِ اعظم[۱] ۳۵۶ ق م میں پیدا ہوا۔ اُسکی ماں کا نام اولمپیاس تھا۔ یہ ایک نیم شائستہ قوم مولوسی کی شہزادی تھی۔ ساموتھراکی کے جزیرۂ پُر اسرار میں ایک بڑی پوجا کے موقع پر فیلقوس مقدونی کی آوارہ نظر اِس شہزادی کے حسنِ نوخیز پر پڑی۔ دونوں میں تعلق ہوگیا۔ اس تعلق میں فیلقوس نے یہ بھی سوچا کہ شاید کسی دن اپیروس کی حکومت قبضے میں آجائے۔

فیلقوس نے شہزادی اولمپیاس کو کبھی اپنی ملکہ نہ بنایا۔ صرف اپنی حرموں میں اُسکو سب سے بڑا رتبہ دیا۔ اولمپیاس بڑی مغرور اور آتش مزاج عورت تھی۔ شوہر کی بیوفائیوں پر ہمیشہ پیچ وتاب کھاتی رہی۔ دلیر اور ہمت والی ایسی تھی کہ جب ۳۳۷ ق م میں فیلقوس نے اُس سے قطع تعلق کیا تو بغاوت کر بیٹھی اور اپنی طرف سے حکومت چلانے لگی۔ مگر یہ جو کچھ ہو اِس جرم سے اسکی کبھی صفائی نہیں ہوسکتی کہ اپنے شوہر کے قتل کا مجرمانہ علم اُسکو تھا۔ شوہر کے قتل کا واقعہ تعلق قطع ہونے کے ایک سال بعد پیش آیا۔ فیلقوس نے اولمپیاس کی لڑکی اور اولمپیاس کے حقیقی بھائی میں شادی ٹھہرائی تھی۔ اِسی شادی کے اہتمام میں مصروف تھا کہ کسی نے اُسکو قتل کردیا۔ قتل کی غرض یہ تھی کہ اولمپیاس کو اسطرف سے کامل اطمینان ہوجاوے کہ اُسکا لڑکا وارث سلطنت ہوگا جسکا در اصل وہ سب سے زیادہ مستحق تھا۔

بیان ہوا ہے کہ اُس قتل کے واقعے کے بارہ برس بعد جسوقت مقدونیہ کی

نمبر۱ "اسکندر کے متعلق اہلِ اسلام کا خیال یہ ہے کہ کم از کم وہ موحّد ہیں اور اُنھوں نے شرک، بت پرستی اور آتش پرستی کو نابود کیا۔"
ناظر مذہبی۔

سپاہ نے بغاوت کرنی چاہی تو اسکندر نے باغیوں سے کہا "شروع شروع میں جس حال میں میرے باپ نے تم کو پایا تھا وہ یہ تھا کہ تم خانہ بدوش تھے اور مفلس تھے۔ بھیڑ بکریوں کی کھال پہنتے تھے۔ اور اپنے بھیڑ گلے پہاڑوں پر چرایا کرتے تھے۔ رات دن ان ہی گلوں پر الیریا۔ تریبالی اور تھریس والوں سے نقصان کیساتھ تمہاری لڑائیاں رہتی تھیں۔ بھیڑ کی کھالوں کی جگہ میرے باپ نے تم کو قبائیں پہنائیں۔ اور پہاڑوں سے اتار کر تم کو ۱۱۷
مسطح ملک میں لایا۔ تمہارے آس پاس جو وحشی قومیں بستی تھیں ان سے لڑنے بھڑنے میں تم کو انکی جوڑ کا بنا دیا۔ اسوقت سے تمہاری حفاظت اس پر منحصر نہیں رہی کہ تمہارے ملک تک کسی کا گذر ہونا مشکل تھا۔ بلکہ یہ حفاظت اب تم کو اپنے ہی بل بوتے پر میسر ہوگئی۔ میرے ہی باپ نے تم کو شہروں میں رہنا سکھایا۔ اور تمھارے واسطے ایسے عمدہ قوانین اور دستور وضع کیے کہ انکی مدد سے تم خود اپنا ملکی انتظام کرنیکے قابل ہوگئے۔ بجائے اس کے کہ تم غیروں کے غلام اور رعیت بنے رہتے جو آئے دن تمھاری زمینوں کو پامال کرتے رہتے تھے میرے باپ نے تم کو آقا اور مالک کے رتبے کو پہنچا دیا۔ اسنے علاقہ تھریس کا زیادہ تر حصہ فتح کرکے مقدونیہ میں شامل کیا۔ سمندر کے کنارے عمدہ عمدہ مقامات پر قبضہ کرکے تمھارے ملک کیلیئے تجارت کے راستے کھول دیئے۔ میرے ہی باپ نے تم کو اس قابل کیا کہ اپنی دیس کی کانوں میں بے کھٹکے کام کرتے رہو۔ اسنے تم کو لڑنے میں ایسا مشاق کر دیا کہ تھسلی والوں کو فتح کر لو جنکو پہلے تم دیکھتے ہی چھپ جایا کرتے تھے اور انکے خوف سے تمھاری جان آدھی رہجاتی تھی۔ یہ اسی کا کام تھا کہ فوکس کے لوگوں کو فتح کرکے اس تنگ اور دشوار گذار سڑک کو جو تمھارے وطن سے یونان کو جاتی تھی زیادہ عریض و سہل گذار بنا دے۔ اور ایتھنز اور تھیبس کے لوگوں کو جو مقدونیہ کو فتح کرنے کیلیئے ہر وقت کمر باندھے رہتے تھے۔ ایسا مغلوب کرے کہ ایتھنز والے خراج وصول کرنا اور تھیبس والے حکومت چلانی بھول جائیں۔ اور خود دشمنوں سے جان بچانے کیلیئے ہمارے دست نگر ہو جائیں۔

یہ وہ معرکے تھے جنمیں میں نے بھی اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اور یہ بھی میرے
ہی باپ کا کام تھا کہ پیلوپونیسس جاکر وہاں کے معاملات کو درستی پہ لایا۔ اور جسوقت
یونانیوں نے سلطنت ایران سے لڑنے کا قصد کر لیا تو یونان کی تمام ریاستوں
نے متفق ہوکر اُسی کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ یہ منصب جلیلہ میرے باپ نے کچھ
اپنی عزّت و نام کیلئے قبول نہیں کیا تھا بلکہ مقدونیہ کی حکومت عمومیہ کی عزّت
و نام کیلئے قبول کیا تھا۔"

اِس تقریر کے الفاظ اسکندر کے نہیں ہیں۔ اِس بارے میں بہتر یا بدتر ۱۱۸
دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ بہتر صورت تو یہ ہے کہ خیالات جو اِس موقع پر بیان
ہوئے اسکندر کے ہیں اور عبارت کسی اور کی۔ اور بدتر صورت یہ ہے کہ عبارت
اور خیالات دونوں کسی مورخ کی ایجاد ہیں جسنے اِس بات کا لحاظ کر کے کہ
ایسے موقع پہ تقریر کس قسم کی ہونی چاہیئے اپنی طرف سے ایک مضمون تیار
کر کے اسکندر کی زبان سے ادا کر دیا۔ بہرکیف اِس عبارت میں ایک
بیان واقعی ان کارگذاریوں کا موجود ہے جو مقدونیہ کی ترقی دولت و اقبال
کیلئے اسکندر کے باپ سے عمل میں آئی تھیں۔ اور جنکو اسکندر نے اپنے
لڑکپن یا آغاز جوانی میں بچشم خود دیکھا تھا۔ ایتھنز کے فصیحوں میں سے
ڈیموستھینیز نے جو فیلقوس کا بڑا دشمن تھا ایک موقع پر اپنی تقریر میں کہا
تھا کہ "ذرا غور تو کرو کہ اسوقت تم کو کس آدمی سے لڑنا ہے۔ یہ آدمی وہ
ہے جس نے شوقِ حکومت میں اپنی ایک آنکھ کھو دی۔ ایک شانہ تڑوالیا۔
ایک پاؤں اور ہاتھ زخمی کرالیا۔ یعنی جسم کے اعضا میں سے جس چیز کو تقدیر
نے حکومت کے معاوضے میں طلب کیا فوراً نذر کر دیا تاکہ باقی جسم عزت و آبرو
کے ساتھ زندہ رہے۔" اسیطرح تھیوپومپس جو فیلقوس کا ایک ہم زمانہ مورخ
تھا اور جو رائے قائم کرنے میں دل کا فیاض بھی نہ تھا فیلقوس کے کاموں
کی نسبت لکھتا ہے کہ "اگر تمام باتوں پر نظر رکھکر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے
کہ آج تک فیلقوس بسر امنتاس کی مثل یورپ نے کوئی آدمی پیدا نہیں کیا۔"
فیلقوس کا شاہی دربار بہت سخت وزشت تھا۔ کثرت مے نوشی

وبدکاری سے اُسکے جلسے قابل نفرین تھے بلکہ ملکی لڑائیوں اور خود فیلقوس کے وعاشقانہ معرکوں میں بھی ہارج ہوا کرتے تھے۔ پائے تخت پیلا میں لوگ نیم انسان اور نیم حیوان "سنتاروں" اور مردم خوار ستری گونیوں کی سی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ بات بات پر ایتھنز کے شائستہ وخوش مذاق لوگوں کی تحقیر وتذلیل کرتے تھے۔ جو وحشت ودیوانگی فیلقوس میں شراب کا نشہ پیدا کرتا تھا وہی وحشت وجنون اولیمپیاس میں اُسکا مذہب پیدا کرتا تھا۔ چنانچہ بالکل آوارہ مزاج ہوکر دائیونیسیوس دیوتا کو اپنے سر پر بلا لیتی تھی اور رات کے وقت نشہ میں چور اپنی ہی مثل بدمست عورتوں کا ایک غول ساتھ لیئے ہاتھ میں عصا یا لہراتے سانپ کی شکل کی ایک چھڑی پھراتی ہوئی بڑے شور وغل کے ساتھ پہاڑوں میں گشت لگایا کرتی تھی۔ اُسکا مذہب وہ باطل مذہب تھا جسکا حال ولیم واگی ہودی (۱۱۹) نے اپنی تصنیف "حکم تقدیر" کے مقدمہ میں اُس زمانے کی دُنیا کے تذکرے میں خاص طور پر منتخب کیا ہے جبمیں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پیدا ہوئے تھے۔ یہ کیش باطل یونانیوں کے طبقۂ اعلیٰ میں ہمیشہ قابل نفرین رہا اور جب رومانیوں کا دَور دورہ ہوا تو انھوں نے اُسکو نہایت سختی اور بے رحمی سے مٹایا۔

قہر وکرم کی صفات جن سے دُنیا میں بڑے بڑے کام ہوئے ہیں اسکندر کی ہڈی میں موجود تھیں۔ اُسکی قوّت متصورہ جو فطرتًا رنگین و پُر جوش واقع ہوئی تھی اپنے جد امجد اکیلیز کی بڑی بڑی باتیں سنکر جسکی کہانیاں بچپن میں ماں کے گھٹنے سے لگا سنا کرتا تھا اور بھی تیز ہوگئی تھی۔ اور باپ کی حیرت انگیز معرکہ آرائیوں نے اُسکے قصد اور ارادے کی جولانی کیلیئے بہت ہی دُور ودراز کی راہیں کھول دی تھیں۔ تیرہ برس کا سن تھا کہ باپ نے حکیم ارسطاطالیس کو اسکا معلم واتالیق مقرر کیا اور یہ ہی فاضل اجل تھا جس سے اسکندر نے عالم شباب میں کہ طبیعت اپنا ایک خاص ڈہنگ پیدا کرتی ہوتی ہے شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ یہ شاعر یونانی تھے مقدونی نہ تھے۔ اور اُن کا کلام اُس قوم کے عمدہ خیالات سے مملو تھا جن سے اسکندر کو باعتبار طبیعت ونسب کے تعلق تھا گو قومیت جدا رکھتا تھا۔ اِن ہی شاعروں کے کلام سے

وہ خیالات گہرے جذبات کے رنگ میں رنگے ہوئے طبیعت پر نقش ہوئے جو سیکھنے والے کے دل میں عمر بھر پتھر کی لکیر بنکر رہتے ہیں۔ یعنی نیک و بد کی پہچان دل کی نرمی و حلم۔ ماں باپ کی اطاعت و فرائض منصب کے ادا کرنے کا خیال جنکو افلاطون اپنی عبارت میں انصاف و عقل۔ اعتدال و پرہیز گاری۔ ہمت و مردانگی سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ ہی وہ خیالات ہیں جو بعد کو ہر فکر میں اپنا رنگ پیدا کرتے ہیں اور انسان کی ایک خصلت جو اُسکے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے قائم کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یونان کی شاعری میں انسان کو تعلیم دینے کا مادہ اسقدر موجود ہے کہ ہم کو ابھی تک اس سے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔

ہومر کے احکام جنکو ارسطاطالیس اپنی حکیمانہ تصانیف میں ہر موقع مناسب پر نقل کرتا نہیں بھولتا اسکندر کے دل و دماغ میں نقش کالحجر ہو گئے تھے۔ اور اکیلیز جو ہومر کی نظم الیاد کا نوجوان ہیرو ہے اسکندر کی نظر میں ایک مجسّم و زندہ ہستی بن گیا تھا۔ ہومر کے بعد اسکندر نے اٹیکا کے (۱۲۰)
دردیہ نگار شاعروں کے کلام کی قدر کی ان دردیہ شعرا کی نسبت ارسطاطالیس کا خیال تھا کہ اُنھوں نے ہومر کے سلسلۂ فکر کو جاری ہی نہیں رکھا بلکہ اسمیں ترقی بھی دکھائی۔ یہ ہی وجہ ہوئی کہ ارسطاطالیس نے اپنی کتاب بوطیقا (شعر) میں دردیہ کی نسبت لکھا کہ وہ ناٹک کے فن کا سب سے ممتاز شعبہ ہے

اسمیں شبہ نہیں کہ اسکندر کو علم سے جو مناسبت یا علم کا ذوق تھا وہ سب ارسطاطالیس کی تعلیم اور اثر صحبت کا پھل تھا۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ ارسطاطالیس کو حیوانات و نباتات کی تحقیق میں جسقدر دخل تھا اسکندر کو بھی بخوبی اُس سے واقفیت تھی اور وہ اُستاد کی اس تحقیق و تلاش میں غالبًا خود بھی حصّہ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ دریافت ہوتا ہے کہ جسوقت اسکندر ایشیا میں وارد ہوا تو یہاں سے حیوانات اور نباتات کے چند نمونے اُستاد کی خدمت میں بھیجے تاکہ اُن ذخیروں میں جو اُستاد نے اس فن کے متعلق جمع کیئے تھے وہ بھی شامل کیئے جاویں۔ جب یہ حالت ہو تو اُسکا یقین نہ کرنا کہ سیاسیات میں بھی

اُسنے ارسطاطالیس سے سبق لیا تھا کیونکر ممکن ہے۔ اور جس حالت میں ثابت ہے کہ حکیم افلاطون نوجوان شہزادہ دائیونیسوس ثانی کو فنِ حکومت میں تعلیم دینے کیلئے تا کہ وہ بادشاہی کرنیکے لائق ہو جاوے یونان سے صقلیہ گیا تھا تو پھر یہ کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ افلاطون کے شاگرد ارسطاطالیس نے مقدونیہ اور یونان کے آیندہ فرمانروا کو اُن خیالات کی تعلیم نہ دی ہوگی جو اُس نے اپنی فکرِ رسا کی مدد سے بہترین طریقۂ حکومت کے متعلق سوچے تھے۔ اگر تصور سے کام لیا جاوے تو وہ ہزارہا موقعے نظر کے سامنے آسکتے ہیں جو میزا کے زمانۂ قیام و معیت میں اُستاد و شاگرد کو سیاسیات پر بحث کرنے کے حاصل ہوئے ہونگے۔ اور ارسطاطالیس اپنے نوجوان شاگرد کو سمجھاتا ہوگا کہ نیکی و علم یا سیاسی قابلیت یا جو کچھ بھی معنی قریب یونانی لفظِ اریتی سے مُراد ہو قوم و ملّت کی سرگروہی و رہبری کا زیادہ سے زیادہ استحقاق پیدا کرادیتی ہے۔ اور نظمِ حکومت کی بہترین شکل وہ ہے جسمیں زیادہ سے زیادہ
نیکیاں رکھنے والا شخص حکومت کرتا ہو۔ چنانچہ ارسطاطالیس خود ایک مقام پر (۱۲۱)
لکھتا ہے کہ " جہاں کہیں کوئی خاندان یا شخص واحد نیکی میں ایسا بلند پایہ ہو کہ اُسکی نیکی ریاست کے اور تمام لوگونکی نیکیوں سے بڑھ جاوے تو ایسی صورت میں انصاف مقتضی ہے کہ حکومت شاہی میں ایسے خاندان کو سب سے ممتاز اور شاہانہ رتبہ دیا جاوے اور ایسے شخص واحد کو بادشاہ بنایا جاوے کیونکہ ...... یہ خیال اُنھی قواعد عدل کے مطابق نہیں ہے جنکو بانیان حکومت نے ملحوظ رکھا ہے خواہ اُنکی مخترع حکومتیں شرفائی ہوں یا عدیدی یا عمومی مگر ہر صورت میں استحقاق حکومت صاحب حکومت کی فضیلت پر مبنی کیا گیا ہے گو یہ فضیلت ہر صورت میں ایک ہی نوعیت نہ رکھتی ہو۔ بلکہ یہ خیال اس نظریہ کے مطابق ہے جسکی ہم ابھی تصریح کر چکے ہیں اور یقیناً یہ درست نہوگا کہ ایسے صاحبِ فضیلت کو ہلاک کر دیا جاوے یا قانون کی بناء اس سے اٹھالی جاوے یا اُسکو ملک سے خارج کر دیا جاوے یا اس بات کی جستجو کیجاوے کہ جب اُسکی باری آئے تو وہ بھی

ایک رعیت خیال کیا جاوے .... پس چارہ بدل یہ ہی ہے کہ لوگ
اسکی حکم برداری کریں اور یہ کہ سب پر اسکو فضیلت حاصل رہے باری باری کے
اصول پر نہیں بلکہ ہمیشہ کیلئے اور مطلقاً"......... ارسطاطالیس زور دیکر لکھتا
ہے کہ "یہ بھی ایک غلطی ہوگی کہ ایسے شخص کو اپنے برابر کے درجے کا آدمی سمجھا
جاوے درآنحالیکہ وہ نیکی اور سیاسی قابلیت میں نہایت بڑھا ہوا ہو کیونکہ
ایسے شخص کو ایک دیوتا سے جو زمین پر وارد ہو نسبت دی جا سکتی ہے۔"
بار بار اور وقت بے وقت اور بعض مرتبہ اسطرح سے کہ شہزادہ اسکندر
پریشان ہو جاتا ہوگا کیونکہ وہ اس فکر و تردد میں رہا کرتا تھا کہ کہیں باپ کی
فتوحات اتنی نہ بڑھیں کہ اسکی تیغ آزمائی کیلئے دنیا میں کچھ باقی نہ رہے
ارسطاطالیس اپنے شاگرد کے دل پر یہ ہی نقش کرتا رہا ہوگا کہ "انسان قدرتی
طور پر ایک شہر کا رہنے والا حیوان ہے اور جو شخص ایک شہر کا رہنے والا (۱۲۲)
نہیں ہے اور شہر سے اسکی بے تعلقی اتفاقیہ نہیں بلکہ قدرتی ہے تو ایسا
شخص یا تو انسان سے بالاتر کوئی ہستی ہے یا وہ درجۂ شائستگی میں بالکل
پست اور گویا بساط شطرنج پر مثل ایک تنہا مہرے کے سیاہ داغ ہے۔ ہماری مراد
یہاں ایک ایسے آدمی سے ہے جسکی نہ کوئی قوم ہے اور جسکا نہ کوئی قانون
ہے اور نہ گھر ہے" اور جسکا ذکر ہومر نے بہت بری طرح سے کیا ہے کیونکہ ایسا
شخص قدرتی طور پر کسی شہر کا باشندہ نہیں ہوتا اور وہ لڑائی اور فساد کا ہمیشہ
شائق رہتا ہے" ارسطاطالیس کا اس امر پر اصرار کرنا ہم اپنے تصور میں
بخوبی لا سکتے ہیں کہ جسطرح شہر کی زندگی مترادف ہے شائستہ زندگی سے اسیطرح
شہر مترادف ہے ریاست و حکومت سے اور یہ کہ سیاسی فرائض کا ادا کرنا
جو انسان کا سب سے بڑا کام ہے اسوقت معدوم ہو جاتا ہے جبکہ ریاست
کسی خارجی طاقت کی محکوم ہو جاوے۔ اور رعایا ہمیشہ رعایا نہیں رہ سکتی
تاوقتیکہ مفتوحین شائستگی میں قدرتی طور پر کم درجہ رکھتے ہوں جیسے کہ ایشیا کے
لوگ ہیں اور ان ادنیٰ لوگوں ہی کے حق میں یہ بات مفید ہے کہ جو لوگ
ان سے درجے میں زیادہ ہوں انکے وہ محکوم رہیں۔ اسی قسم کے

اصولِ سیاسیات ہیں جو اس سیاسی فلسفی یعنی ارسطاطالیس نے بار بار بیان کیئے ہیں۔ فیلقوس خوش ہو ہو کر کہا کرتا تھا کہ میرا فرزند اسکندر حکیم ارسطاطالیس کے زمانے میں پیدا ہوا ہے تاکہ اُسکی تعلیم سے فرزند اپنے باپ کے لائق بنے اور اُس منصب کیلیئے مناسب ہو جسکا وہ وارث بننے والا ہے۔ پس اسکندر کی ادبی و سیاسی تعلیم اس پایہ کی تھی جو بیان ہوئی۔ فوجی تعلیم و تربیت اسکو اسطرح پہنچی تھی کہ باپ کیساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا تھا لیکن اس قسم کی تعلیم کی نسبت ہمکو نپولین کا یہ قول یاد رکھنا چاہیئے کہ "لڑائی عجیب چیز ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ساٹھ لڑائیوں میں بھی شریک ہوکر کوئی بات میں نے ایسی نہیں سیکھی جو پہلی لڑائی کے وقت مجھکو معلوم نہ تھی۔ افسر فوج کا سب سے بڑا وصف ثابت قدمی ہے اور یہ وصف خداداد ہوتا ہے کسی کے سکھانے سے نہیں آتا۔" (۱۲۳)

یہاں میرا یہ قصد نہیں کہ اسکندر کی سوانح عمری لکھوں یا اُسکی فتوحات کے دل آویز قصّوں اور اُسکے کاموں کے اُن نتیجوں کو بیان کروں جو اُسکے بعد تاریخ عالم میں ظاہر ہوتے رہے۔ بلکہ کتاب کے اُس حصّے کو میں نے اس قصد سے شروع کیا ہے کہ اسکندر کی خاندانی خصوصیات کی شرح اسطور پر کروں کہ اُسکے سیاسی خیالات کی بھی پوری توجہ ہوتی جاوے اور پھر مورّخ پلوٹارک کیطرح اُسکی زندگی کے ایسے واقعات لکھوں جن سے معلوم ہو کہ وہ کیا نقشہ اُسنے سوچا تھا جسکے مطابق وہ تمام دنیا میں اپنی شہنشاہی قائم کرنی چاہتا تھا۔

نپولین کا قول ہے کہ سیاسیات میں اسکندر نے سب سے بڑھکر ذہانت جس چیز میں دکھائی وہ یہ تھی کہ لوگوں کے تخیل پر وہ اپنا اثر پہونچانا خوب جانتا تھا۔ طریقۂ رمزیت اُسکی آب و گل میں سرایت کرچکا تھا یعنی وہ اپنے ہر ایک کام کو کسی دیوتائی قوت کارمز یا اُسکی علامت سمجھتا تھا۔ ایشیاء میں فتوحات جاری تھیں کہ یکایک تمام کاموں کو بحال خود چھوڑکر ایک ایسے کام کیلیئے روانہ ہوا جسکے ذریعے سے اُسنے بار بار ایک بڑے

مسئلہ پر روشنی ڈالی۔ دنیا کو ایک خاص سبق پڑھایا اور ایک بڑی حکمت عملی
کو سب پر ظاہر کر دیا۔ یہ کام گویا ایک قسم کا اشتہار دینا تھا۔ بلکہ ایک ذریعہ تھا
کہ بادشاہ کے ارادے اور خیال کو دنیا پر اسطرح ظاہر کر دے کہ انمیں مطلق
غلطی کا احتمال نہ رہے۔ بلکہ اسکا کام شاید اس سے بھی بڑھکر تھا۔ یعنی فن سیاست
میں اس کمال قوت کا اظہار کرے جس سے یونانیوں نے فن بت سازی
میں دنیا کو مانوس کر رکھا تھا۔

اس کام کی پہلی مثال تو اسمیں ملتی ہے کہ ۳۳۵ ق م میں اسکندر نے
تھیبس کے شہر کو غارت کر دیا۔ اسکندر کی تخت نشینی سے ایک سال پہلے تمام (۱۲۴)
یونان میں سخت بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ فیلقوس جسوقت قتل ہوا ہے تو اسکی
عمر صرف ۴۰ برس کی تھی۔ بیٹا تخت نشین ہوا تو بیس برس کا ایک جوان لڑکا
تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی جنوبی ملکوں کا رخ کیا اسی زمانے میں ایک بغاوت
ہونیوالی تھی مگر وہ پوری شروع نہونے پائی تھی کہ اسکا خاتمہ کر دیا۔ اور اس
خیال سے کہ آگے کوئی فساد کھڑا نہو شہر تھیبس کے قلعہ میں اپنی فوجیں مقیم
کر دیں کیونکہ بغاوت کی علامتیں سب سے زیادہ اسی شہر میں نظر آیا کرتی
تھیں۔ اسکے بعد سلطنت کی شمالی سرحد پر فتنہ و فساد فرو کرنے میں مصروف
ہوا تاکہ ان سے فارغ ہوکر ایران پر لشکر کشی کی تیاری کرے مگر چند ہی
مہینے گزرے تھے کہ لوگوں نے اسکے مرنے کی غلط خبر سنکر ایتھنز اور یونان
کی دیگر ریاستوں سے سازش کرکے بغاوت کر دی۔ اسکی خبر پاتے ہی نہایت
پوشیدہ مگر بہت تیزی سے تھیبس پہنچا۔ حملہ کرکے شہر پر قبضہ کیا اور قبضہ
کرتے ہی شہر کے لوگوں کو غلام بناکر فروخت کر دیا اور شہر کو قطعاً مسمار کرنیکا
حکم دیا۔ یہ وہ آفت عظیم تھی جسکا تجربہ یونانیوں کو سوائے جزیرہ صقلیہ
یا ۴۹۴ ق م میں شہر ملیطوس کی بربادی کے جسکو اہل ایران نے منہدم
کیا تھا کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔ اب اسمیں کسیکو شبہ نہیں رہا کہ اگر اسکندر
ایشیا کو گیا اور اسکی عدم موجودگی میں کسی یونانی ریاست نے بغاوت کی
تو پھر اسکا کیسا برا درجہ کیا جائیگا۔ اس موقع پر لوگوں کو صرف یہی سبق نہیں ملا

بلکہ ایک خاص بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ گو تھیبس کی کل عمارات کو مسمار کردیا گیا لیکن اس بات کو ثابت کرنے کیلیئے کہ اسکندر یونان کی تہذیب و تمدن کا پورا قدر شناس ہے شاعر پیندار کے مکان کو مسمار نہیں کیا۔ تاکہ اہل یونان سمجھ لیں کہ تھیبس کے غارت کرنے والے کا شمار ملیبطوس کے غارت کرنیوالوں میں یا دیگر غیر یونانی قوم کے لوگوں میں نہیں ہے۔

اسکے دوسرے برس جسوقت اسکندر ایران کی سلطنت پر قبضہ کرنیکو ہوا تو اسنے اپنا لشکر شہر سیتوس سے ہیلس پونت (در دانیال) کے اس پار ابیدوس کے مقام کو روانہ کیا اور خود ایلیوس کے شہر میں آیا اور یہاں پر وتوسیلاس کی قبر پر قربانی کی اور دعا مانگی کہ اسکی قسمت ایگامیمنن کے (۱۲۵)
ہمراہیوں میں سے اس شخص سے بھی بہتر ہو جس نے ایشیا کی زمین پر سب سے پہلے قدم رکھا تھا۔ پھر ہیلس پونت عبور کرکے اکایا والوں کے مقام ہاربور پہ اترا اور یہاں سے ایلیم کو گیا اور ایلیم میں ایتھینا ایلیاس کے مندر میں اپنے ہتیار اتار کر دیبی کی نذر چڑھائے اور انکے بدلے میں مندر سے چند ایسے ہتیار اٹھا لیئے جو پرانے وقتوں میں جنگ ترو جن میں یونان کے بہادروں نے استعمال کیئے تھے۔ اسکے بعد توراے کے بادشاہ پرائم کی آتما سے عفو تقصیر چاہا کیونکہ اسکندر نیوتولیموس پسر اکیلیز کے اخلاف سے تھا جسنے پرائم کو قتل کیا تھا۔ پھر اکیلیز کی قبر پر گیا اور وہاں پھولوں کے ہار رکھے۔ ہفا سیلتون نے بھی جو اسکندر کا بڑا دوست تھا اکیلیز کے دوست پترو کلس کی قبر پہ پھول چڑھائے۔ اسکے بعد اسکندر اپنے لشکر کے ساتھ ہولیا۔ مگر اسکی ان باتوں سے یونانیوں کو اپنے قدیم کارناموں کی ہزارہا باتیں یاد آگئیں اور انکے دل میں اسکندر کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ وہ سمجھے کہ آج ہماری قوم سے دوسرا ایگامیمنن ایک نئے توراے کو فتح کرنے اٹھا ہے اور یونان کے لوگوں میں ایشیا کے مقابلے کیلیئے ایک دوسرا سورما پیدا ہوا ہے۔ اسکندر کیلیئے اس سے بہتر طریقہ یونانیوں پر اس بات کے ثابت کرنے کا نہ تھا کہ آج وہ اس ملک کی فتح پر کمربستہ ہوتا ہے جسکے خواب یونان کی قوم کو

خدا جانے کن وقتوں سے نظر آیا کرتے تھے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ یونانیوں
کا ایشیا سے یہ محاربہ طلب دنیا کیلئے نہ تھا بلکہ قریب قریب ایک ایسی مذہبی
لڑائی کا حکم رکھتا تھا جسکا اعلان کرنا اس وقت کے کسی تاجدار کے امکان
میں نہ تھا۔

گردیوم کے مقام پر جہاں اسکندر کے لشکر نے ایشیا کی زمین پر پہلا
جاڑا بسر کیا ایک قلعہ تھا۔ اس قلعہ میں ایک چھکڑا رکھا تھا جسکی نسبت مشہور
تھا کہ اسی میں بیٹھکر ایک کسان کا لڑکا میدیاس نامی اس مقام پر پہنچا تھا
جہاں فرائجیا کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع ہو رہا تھا۔ جونہیں یہ لڑکا مجمع کے قریب
پہنچا تو سب لوگوں نے اسکو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس چھکڑے کی بم میں جوئے
کی لکڑی کسی درخت کی چھال سے بڑی مضبوط گرہ میں بندھی ہوئی تھی۔ اور
یہ بات گردونواح میں مشہور تھی کہ جو شخص اس گرہ کو کھول دیگا اسکو ایشیا
کی بادشاہت ملیگی۔ اسکندر نے گرہ کھولنے کی بہت کوشش کی جب اسکو
(۱۲۶) کسی طرح جنبش نہ ہوئی تو تلوار نکال کر گرہ کو کاٹ دیا۔ اس حرکت سے اسکندر
نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے باپ فیلقوس کے اس مسلک سے ہٹ گیا ہے
کہ محض علاقۂ آئی اونیا کے یونانیوں کو ایرانیوں کی غلامی سے آزاد کرنے کیلیئے
ایشیا پر لشکر کشی کیجاوے بلکہ وہ ایرانیوں سے انکی ایشیائی سلطنت چھین کر
بالکل اپنے قبضے میں لانے کا پورا قصد رکھتا ہے۔

دریائے گرنیکس پر جب پہلی لڑائی جیت لی تو ایشیائے کوچک کے ساحل
پر بڑھتے بڑھتے سلیسیہ کے علاقے تک آیا اور ساحل پر جسقدر ایسے شہر
ملے جنھوں نے ایرانی بیڑے کو یونانیوں سے لڑنے کیلئے جہاز دیئے تھے
انکو فتح کر لیا۔ دارا کے مقابلے میں آئی سوس کے مقام پر فتح پاکر بھی اسنے
لڑائی کا جو نقشہ سوچا تھا اسکو قائم رکھا۔ یہ نہیں کیا کہ دارا کے شکست خوردہ
لشکر کا تعاقب کرکے ملک کے اندرونی حصوں میں پہنچ جاتا جیسا کہ لڑائی میں
عام قاعدہ ہے بلکہ اسنے دارا کو بحال خود چھوڑ کر سلیسیہ سے لیکر افریقہ میں
علاقہ کسائینی تک سمندر کے کنارے کنارے جسقدر شہر ایسے تھے

جہاں جنگی جہاز موجود رہتے تھے اُن کو خشکی کے راستے سے پہنچکر فتح کرلیا۔ اس
فتح کی غرض یہ تھی کہ اسی ترکیب سے ایران کا جنگی بیڑا غارت ہوجاوے کیونکہ
خود اسکندر کے پاس اسوقت جنگی جہاز موجود نہ تھے۔ ایرانیوں کے جہاز
بحر متوسط میں پڑے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں اس سمندر کو دشمن کے
ہاتھ میں رہنے دینا اور خود ملک کے اندرونی حصّوں میں مصروف جنگ
ہوجانا خلاف مصلحت ہی نہ تھا بلکہ اسمیں خطرہ تھا کہ ابتک جسقدر مقامات
فتح کیے تھے کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ اور ایرانیوں کے پاس
ایسی چیز کو رہنے دینا جس سے وہ یونانیوں کو بھی کسی وقت میں اسکندر کے
خلاف بغاوت پر آمادہ کردیں کسی طرح مناسب نہیں۔ سچ پوچھیے تو اسوقت
اسکندر کو ایرانیوں سے بڑھکر یونانیوں کی طرف سے خوف دامنگیر تھا۔
بلاد شمال سے اطراف جنوب میں مصر سے آگے سائرینی کا دور و دراز سفر
کچھ بلا وجہ نہ تھا۔ اصول جنگ کے اعتبار سے یہ مراجعت ایک بڑا کار آمد
حیلہ ثابت ہوچکی ہے لیکن سائرینی میں پہنچکر جنوب میں ریگستان اور صحرا کو
بہ ہزار مشکل طے کرکے نخلستان سیوہ تک پہنچنے کی بظاہر کوئی معقول وجہ نہیں
معلوم ہوتی تھی۔ یہاں مصریوں کے دیوتا ایمون کا ہیکل سب سے الگ ایک مقام پر
واقع تھا۔ جہاں سے غیب کی خبریں دیجاتی تھیں۔ یونان کے لوگ ایمون (۱۲۷
کو زیوس کے نام سے پکارتے تھے۔ اسوقت ایمون کو بہت شہرت تھی۔
ایک زمانہ تھا کہ ایپیروس کے علاقے میں دیدونا کا مندر غیب کی خبریں دینے
میں شہرہ آفاق تھا۔ مگر جب اسکی شہرت کم ہوئی تو دلفائی میں اپولو دیوتا
کا نام مشہور ہوا۔ مگر جب یونانیوں کو رفتہ رفتہ علم ہوا کہ زیوس ایمون اپنے
کاہنوں کو جیسی صحیح خبریں دیتا ہے ایسی کہیں سے نہیں ملتیں تو دلفائی کی
قدر کم ہوگئی اور ایمون کا چرچا زیادہ ہوگیا۔ ایمونیوم کا مقام جہاں ایمون
کا ہیکل تھا اسکندر کے زمانے سے پہلے ہی بت پرستوں کا تیرتھ بنا ہوا تھا۔
اور یونانی دنیا کے تمام حصّوں سے وہاں تحائف اور نذریں آیا کرتی تھیں
اتیھنز والوں نے ایک جہاز خاص طور پر تیار کیا تھا جسکا نام "سفینۂ پاک"

تھا۔ یہ جہاز اُن قاصدوں کی آمد و رفت کیلئے مخصوص تھا جو کسی معاملے میں اینھمز سے غیب کے احکام سننے کیلئے ایمونیم میں آیا کرتے تھے۔ لیکن خاص باشندگانِ مصر میں نخلستانِ سیوہ کے ایمون کو وہ درجہ حاصل نہ تھا جو تھیبس (واقع مصر) کے ایمون کو تھا۔ لیکن یونانیوں میں جس ایمون کی شہرت تھی اور جسکی پرستش کیجاتی تھی وہ افلاطون کے بیان کے مطابق افریقہ میں علاقہ سائرینی کا ایمون تھا۔ اسکندر اس بات کو خوب سمجھ گیا تھا کہ اگر ایمون کے پروہتوں نے اسکو ایمون کا فرزند قرار دیدیا تو کل یونان کے باشندوں پر بڑا اثر ہوگا خواہ اُنکا تعلق حکومت سے ہو اور خواہ مذہب سے۔ مگر ایمون کے پروہتوں کو اسمیں کیا عذر ہوسکتا تھا۔ انھوں نے اسکندر کے آتے ہی اپنا پہلا فرض اسی کو سمجھا کہ اسکو ایمون کا فرزند قرار دیں۔ کیونکہ اسی زمانے میں ملک مصر نے اسکندر کو اپنا فرعون تسلیم کرلیا تھا اور مدت دراز سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ فرعونِ مصر کوئی ہو وہ ایمون کا فرزند سمجھا جاتا تھا۔ پس اگر اسکندر کو یہ عزت نہ دیجاتی تو گویا اسکندر کی اطاعت سے جو حال میں فرعون مصر ہوگیا تھا انکار کرتا تھا۔ نیز یہ امر سیوہ کی خصوصیات سے تھا کہ جس بادشاہ کو ایمون کا فرزند کہدیا جاتا تھا۔ اسکی نسبت یونان میں بھی اشتہار ہوجاتا تھا کہ وہ زیوس یعنی یونان کے بڑے دیوتا کا بھی فرزند ہے۔

سرکاری نوشتوں میں مرقوم ہے کہ ساحل بحر سے سیوہ تک صحرا اور ریگستان کا سفر تائید غیبی سے طے ہوا۔ اور ایمون سے اسکندر کی ملاقات
ایک راز سربستہ قرار پائی۔ چنانچہ انگلستان کے ملک الشعراء ٹینی سن نے اسکندر (۱۲۸)
کے متعلق اپنی نظم میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرکے لکھا ہے "وہاں بڑی بڑی باتیں ہوئیں جو ہم تک نہیں پہنچیں۔ لوگوں نے صرف اسکندر کو دیکھا کہ ایک مقامِ اسرار سے واپس آرہا ہے۔ چہرہ تمتمایا ہے اور آنکھیں روشن ہیں"۔

اس واقعہ کی سرکاری کیفیت میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ ایمون کے سب سے بڑے کاہن نے وہ بات پوری کی

جسکی آرزو کیجاتی تھی یعنی اپنی زبان سے سب کے سامنے کہدیا کہ اسکندر ایمون کا فرزند ہے۔ اور اس مضمون کو زیادہ قوت اس سے پہنچی کہ قاصدوں نے اس زمانہ میں خبر دی کہ ایرسنھرا کی دیبیاں اور برانکائیدی کا اپولو بھی ندائے غیب سُنکر اسکندر کے اس اعزاز کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس کے سکوت کے بعد یہ پہلی خبر تھی جو ان دیبیوں اور دیوتاؤں کے استھان سے ملی تھی۔ ایمون سے پوشیدہ ملاقات کی نسبت اسکندر نے اپنی ماں کو لکھا کہ اسپر بڑے بڑے اسرار کھلے ہیں لیکن وہ کبھی خود حاضر ہو کر زبانی عرض کریگا۔"

نخلستان سیوہ میں اسکندر کے جانیکا جو مطلب تھا وہ ہم ابھی بیان کرینگے لیکن اس سے پہلے یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ اسوقت تک جو طریقے اسکندر نے عام طور پر لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنیکے اختیار کیئے تھے یا چند کرشمے دکھا کر اپنی سابقہ پالیسی میں ایک اہم تبدیلی پیدا کرنی چاہی تھی ان ہی میں نخلستان سیوہ کا سفر بھی تھا۔ اور اسکی مثالیں اسکے زمانۂ حکومت میں بعد کو بھی چند در چند پیش آتی رہیں۔

سیوہ سے رخصت ہونیکے بارہ مہینے بعد اسکندر کا قبضہ پرسی پولس (۱۲۹)
(اصطخر) پر بھی ہوگیا۔ یہ سلطنت پارس کا پایۂ تخت تھا۔ اسمیں شاہان کاریس (خورس) اور داریوش (دارا) کے زمانے میں پانچ لاکھ آدمیوں کی ایک پوری قوم بستی تھی جسکو ان بادشاہوں نے ایسی رعایا کا حاکم بنا دیا تھا جو شمار میں رومانی شہنشاہی کی آبادی سے کم نہ تھی۔ دو سو برس سے زیادہ تک چار کرور لوگوں نے سلطنت پارس اور اسکے پایۂ تخت پرسی پولس (اصطخر) کو اقتدار شاہی اور سطوت خسروی کا سرچشمہ سمجھا۔ "پارسی پولس" یعنی "اہل پارس کا شہر" اور اسکے بادشاہوں کے قصر و محل ایک سلطنت عظمیٰ کی زبردست نشانیاں تھے۔ مگر مخلوق کے دل سے ان نشانیوں کی عظمت مٹانے کے لیئے اسکندر نے پرسی پولس کو تو اپنی فوجوں کے حوالے کیا کہ جسطرح چاہیں اسکو لوٹیں اور خود شاہی محلوں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگا دی تا کہ دنیا میں اس امر کا اعلان کردے کہ خاندان پارس کا نام دنیا سے رخصت ہوا۔ سلف کا نام

ہٹانے کیلئے یہ کام خاص اپنے ہاتھ سے کیا اسکا اثر اہل ایران کے دلوں پر
وہی ہوا جو سنہ ۴۱۰ عیسوی میں اہل روما پر ہوا تھا جبکہ قوط کے بادشاہ ایلارک
نے روما پر قبضہ کیا تھا۔ ایک رات اسکندر ارکین دولت کیساتھ جس میں
ایتھنز کی مشہور حسینہ تھائیس بھی موجود تھی اصطخر میں بیٹھا دعوت کھا رہا تھا کہ
کھانا ختم ہونے پر دائیونیسیوس کے نام پر ساغر کا دور چلنے لگا۔ جب خوب شرابیں
پیکر نشہ تیز ہوا تو اسکندر اور اسکے درباری مشعلیں ہاتھ میں لئے ساتھ ساتھ
بانسریاں بجتی ہوئی پرسی پولس کے گلی کوچوں سے گذرتے ہوئے قصر کسرے
میں آئے اور مشعلوں سے اسکی چھت کے شہتیروں میں جو صنوبر کے بنے تھے آگ
لگادی جب شعلے تیز ہوکر بلند ہوئے تو اسکندر نے جو اثر لوگوں کے دلوں
میں پیدا کرنا چاہا تھا وہ پیدا ہوگیا اسکے بعد اسنے آگ بجھانے کا حکم دیا۔
اس واقعے کے دوسرے ہی سال کے شروع میں ہگمتانہ (ہمدان)
کے شہر میں داخل ہوا۔ موسم گرما میں یہ مقام شاہان پارس کا مستقر
رہتا تھا۔ اسکندر کے ہمدان پہنچتے ہی دارا (بادشاہِ ایران) فرار ہوا۔ اسوقت
تک اسکندر ریاستہائے یونان کے لیگ کا سرگروہ اور مقدونیہ کا بادشاہ
تھا۔ ایشیا میں یونانی شہروں کو ایرانی حکومت سے آزاد کرنیکے بعد اسنے
ان شہروں کو بھی لیگ میں شامل کرلیا تھا۔ اب چونکہ ایران سے لڑائی ختم (۱۳۰)
ہوگئی جسکے لئے یہ لیگ یونانی ریاستوں میں قائم ہوا تھا اسلئے اسکندر نے
لیگ سے علحدگی چاہی جسمیں وہ اپنے باپ فیلقوس کی پالیسی کیوجہ سے
شروع زمانہ حکومت میں شریک ہوا تھا۔ یہ علحدگی بھی اسنے حسب عادت
بہت کچھ نمائش ونمود کیساتھ اختیار کی۔ لیگ کی طرف سے جسقدر فوجیں ساتھ
آئی تھیں انکو جواب دیدیا اور ساحل تک انکی اور انکے سامان کی واپسی اور
ساحل سے بحر متوسط کو عبور کرکے انکے یونان تک پہنچنے کا بڑی دھوم دھام
سے اہتمام کیا۔ فوجوں کی واپسی گویا ہر شہری ریاست کو جسنے فوج ساتھ
کردی تھی اسبات کا پیام پہنچانا تھا کہ اسکندر اب ان عہدناموں کا جو لیگ
کے قائم ہونے کے وقت ہوئے تھے پابند نہیں رہا۔ مگر اسکے ساتھ ہر ایک

ریاست کو فہمائش کردی کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ ریاستیں اب اس کے احکام
کو نہ مانیں۔ لیگ کے اعتبار سے مقدونیہ والوں کی طرف سے جو سرداری ابتک
اسکو حاصل تھی وہ ختم ہوئی لیکن وہ مقدونیہ کا بادشاہ بدستور قائم ہے۔

اسکے کچھ دن بعد ایرانی لباس کی جو جو چیزیں پسند آئیں ان کو پہنکر اپنے
فوجی افسروں کے سامنے آیا جو اسکو دیکھتے ہی حیرت زدہ ہو گئے۔ اونچی کلاہ
اور چلی آستینوں کی قبا اور ڈھیلا ڈھالا شلوار تو اسکو پسند نہ آیا لیکن اندر کے
نرم کپڑے ایرانی قطع کے پہننے اختیار کر لیئے۔ اور تاج شاہی بھی جو صاحب سلطنت
ہونے کا نشان تھا سر پہ رکھا۔ اپنے دربار کا طریقہ بھی مشرقی انداز کا کر دیا۔
فوج محافظ کے جوانوں اور محل سرا کے خادموں کو لال وردیاں پہنائیں اور
اگر یہ خبر صحیح ہے تو اس سازوسامان کیساتھ غالباً ایک پوری حرم سرا بھی
لواحقین شاہی میں شامل کیگئی ہوگی۔ آخر کار ۳۲۷ ق م میں جسوقت شاہان
(۱۳۱) صغدانیہ (بخارا و ترکستان) کے خاندان کی ایک شہزادی رو کسیانہ (روشنک)
کو اُسنے اپنی ملکہ بنایا تو اسوقت اس قاعدے کی ضرورت ہوئی کہ جو شخص بادشاہ
کی حضور میں آئے وہ بادشاہ کے قدموں کے قریب آکر زمین بوس ہو جسوقت
یہ قاعدہ جاری ہوا اسوقت کاربوس ساکن متلینی دربار اسکندری میں نقیب
کا منصب رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ایک دن اسکندر بادہ نوشی میں
مصروف تھا کہ اپنا جام شراب بھر کر ایک درباری کو دیا۔ درباری فوراً اسکندر
کے ہاتھ سے ساغر لیتے ہی کھڑا ہوا اور آتش دان کے قریب جاکر اسکو پی گیا
اور پھر سامنے آکر گھٹنے ٹیک کر زمین پر جھکا اور بادشاہ کے قدموں کو بوسہ دیکر
اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ جسقدر اور درباری حاضر تھے اُنھوں نے بھی یہی کیا لیکن
کالس تھینز نے ایسا نہیں کیا بلکہ جھکنے اور قدم چومنے کی جگہ اسکندر کے رخسار
کو بوسہ دیا۔ اسپر اسکندر اُس سے ناخوش ہو گیا۔ غرض یہ اس قصے کا بدنما
آغاز ہے جسکو دربار کے مقدونی شرفا ایسے قصوں میں شمار نہ کرتے تھے جنکا
انجام اچھا ہوا کرتا ہے۔

اس زمین بوسی یا قدم بوسی کے قاعدہ کی نسبت جسکو یونانیوں نے

پروسکائی نی سیس کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ایڈورڈ مایر لکھتا ہے کہ "یہ اس بات
کے تسلیم کر لینے کی علامت تھی کہ اسکندر لڑائیاں جیت کر سلطنت ایران کا
مالک اور دارا کا جانشین جائز ہے۔ اس واقعہ کی صحت میں کلام نہیں لیکن
اس قدم بوسی کے اصلی معنی اور یہ تاریخی واقعہ کہ لوگوں سے یہ رسم ادا کرائی
گئی اور پھر اس سے جو کدورت یا اختلاف پیدا ہوا محض اتنا کہدینے سے
سمجھ میں نہیں آسکتا کہ مشرقی رعایا کا دل رکھنے کیلئے اس رسم کی اجازت دی گئی
تھی۔ اگر اتنا ہی ہوتا تو اسمیں کسی کا نقصان نہ تھا۔ لیکن اصلی بناء اختلاف
یہ تھی کہ مقدونیوں اور یونانیوں سے بھی اس قاعدے کی تعمیل کرائی جاتی
تھی۔ مشرقیوں سے بحث نہ تھی کیونکہ یہ ہی وہ چیز ہے جسمیں یورپ کی (۱۳۲)
قومیں بلالحاظ نسل و قومیت مشرق کے لوگوں سے اختلاف رکھتی رہیں۔
اسکا علم کسی کو نہیں کہ یورپ کی قوموں میں یہ بات کب سے پیدا ہوئی
لیکن یورپ کے ہر حصے میں تمام علمی و سیاسی ترقیوں کے زمانے میں یہ
خود داری ہمیشہ ظاہر ہوتی رہی ہے۔ مشرق کے لوگوں میں البتہ چاہے
وہ سامی ہوں یا مصری۔ انڈو یورپین ہوں یا چینی یا کسی اور نسل کے سب
اسکو ایک قدرتی بات سمجھتے ہیں کہ دوسروں سے تعلقات رکھنے میں کسر نفسی
اختیار کریں۔ دوسروں کو اپنا آقا اور اپنے تئیں انکا غلام کہیں۔ بادشاہِ
وقت ہی کے سامنے زمین تک نہ جھکیں بلکہ اپنے سرداروں اور افسروں
کے سامنے بھی یہ ہی حال ہو اور اسمیں انکی نیک نیتی یا تمکنت میں جو
انکی طبیعتوں میں بھی ہوتی ہے کسی قسم کی کمی نہ آئے۔
"لیکن اسکے برعکس ایک یورپین سمجھتا ہے کہ کسر نفسی سے اس کی
خود داری فنا ہو جائیگی۔ اسکے نزدیک کبھی ایک آزاد آدمی اپنے تئیں دوسرے
کا غلام یا بندہ نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اپنی نسبت جو کچھ کہیگا وہ ایسے
لفظوں میں کہیگا جس سے معلوم ہو کہ اسکو اپنی لیاقت اور قابلیت پر پورا
بھروسا ہے .... زمین پر پیشانی رگڑنی یا کسی کے سامنے خاک پر بوسہ
دینا ایک یورپین کے خیال میں صرف اسکے سامنے درست ہے جسکو اسکا

پرستش کرنیوالا اپنا مالک سمجھتا ہے اور جسکی سامنے پرستش کرنیوالا خود کوئی ارادہ
یا اختیار نہیں رکھتا۔

یہ یونانی اور انکی آزاد حکومتیں ہی تھیں جنہیں خودداری کا یہ خیال
ترقی پاکر اپنی پوری قوت کو پہنچا تھا۔ چنانچہ اسکا حال اسپرتھنیز اور بولیس کے
قصّے سے جو اسپارٹا کے دو سفیر تھے خوب ظاہر ہوتا ہے۔ ان اسپارٹیوں
نے قتل ہونا بے تکلّف منظور کر لیا مگر بادشاہ ایران کے سامنے جھکنا صفائی سے
قطعی انکار کیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ان سفیروں نے کہا کہ "ہمارے
ملک میں قدمبوسی کا دستور نہیں ہے اور نہ وہ کسی کی قدمبوسی کیلئیے اس ملک (۱۳۴)
میں آئے تھے۔" تمس طاکلیس کی نسبت مشہور ہے کہ جسوقت وہ دربار
ایران میں حاضر ہوا تو اُسنے بادشاہ کے سامنے زمین بوس ہونا قبول کیا
لیکن کونن یونانی نے جو یونانیوں کے خلاف بادشاہ ایران کو تمس طاکلیس
سے بھی زیادہ مفید مشورہ دینے آیا تھا بادشاہ کے سامنے زمین چومنے
سے قطعی انکار کیا۔ پس اسکندر نے جب یونانیوں کو بھی اس امر پر مجبور کیا کہ
وہ اسکے سامنے زمیں بوس ہوں تو وہ اس سے ناراض ہو گئے۔ اسکندر
کا منشاء زیادہ تر یہ تھا کہ خلوت میں اُسکے تعلقات یونانیوں کے ساتھ کیسے ہی
بے تکلّفی کے ہوں لیکن بادشاہ ہونیکی حیثیت سے چونکہ اب وہ انسان
نہیں ہے بلکہ دیوتا ہے اسلیئے سب لوگ ایک طرح سے اُسکو تعظیم دیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اہل یونان و مقدونیہ سے
قدموں میں گر کر زمین چومنے کی توقع کرنی اس مراد سے تھی کہ وہ اسکندر کو
ایک دیوتا مانیں جیسا کہ زیوس کا فرزند قرار پانے پر وہ بخیال عام ایک دیوتا
ہو گیا تھا۔ لیکن اہل ایران اس رسم سے اس قسم کے کوئی معنی نہ نکالتے
تھے۔ آگے چلکر ہم دیکھینگے کہ اسکندر کے نزدیک اب اہل ایران ایرانی نہیں
رہ سکتے تھے بلکہ وہ انکو اپنی تعلیم و تربیت دیکر یونانی بنانا چاہتا تھا۔

اسکندر نے جسوقت ایشیا کا قصد کیا تو پہلے ہی سے اسکے دل میں یہ
بات جم چکی تھی کہ یونان کے علم و فضل کے مقابلے میں دنیا میں کہیں کا علم و فضل ہیچ

بہ یقین اُسکے دل میں تا مرگ قائم رہا۔ اِس خیال میں اُسنے ایشیا کے تمام ملکوں میں یونانی طرزِ زندگی کو شائع کرنا اپنی فتوحات کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا ایشیا میں جہاں کہیں قیام ہوا وہاں کے لوگوں کو یونانیوں کی عادات اور مشاغل کا نمونہ دکھا کر حیرت زدہ کر دیا۔ جو موقع ملا وہیں موسیقی کے جلسے اور جسمانی ورزشوں کے مجمع یونانی طرز کے منعقد کیئے۔ یہ اوپر آچکا ہے کہ اسکندر نے اپنے معلم ارسطاطالیس سے سیکھا تھا کہ شہری زندگی اور یونانی زندگی ایک ہی بات ہے۔ اور یہ کہ بغیر سیاسی حس و حرکت و گرم جوشی کے شہری زندگی
(۱۲۴) انسانی نہیں بلکہ محض حیوانی رہجاتی ہے۔ اسیوجہ سے اُسنے اپنے تمام ممالک مفتوحہ میں یونانی طرز کی شہری ریاستیں قائم کرنے میں بہت عجلت سے کام لیا۔ یہ شہری ریاستیں بالخصوص ایشیا کے زیادہ مشرقی حصوں میں قائم کیں جہاں شہری زندگی کا وجود کم تھا۔ غرض جس راہ سے گذرا رہ گذر پر بیسیوں شہر قائم ہوتے چلے گئے اور اسکی تیرہ برس کی حکومت میں یونان اور مقدونیہ کے لوگ بکثرت ایشیا میں آباد ہو گئے۔ یہ واقعہ ہے کہ اسطرح شہروں کے آباد کرنے سے اسکندر کے فوجی اور ملکی مصارف میں بہت تخفیف ہو گئی۔ کیونکہ ہر ایک ایسے شہر کو اپنی حدود کے اندر اپنا کل سیاسی انتظام محصولوں کا جمع کرنا اہل شہر کے مقدمات کا تصفیہ کرنا اور اسی قسم کے تمام کام خود کرنے پڑے اور اسکندر ان چیزوں سے قطعی سبکدوش ہو گیا۔ ان سب کاموں کو لازمی قرار دینا ضروری تھا کیونکہ اُسوقت ایشیا میں ایک یورپین سلطنت قائم ہو رہی تھی اور اگر شہری ریاستیں اس شکل کی پیدا نہ کی جاتیں تو پھر اس نئی سلطنت کا انتظام ایک بیوروکریسی (دفتری حکومت) کے ذریعے سے کرنا پڑتا (یعنی فن حکومت میں ایک جماعت کو خاص تعلیم و تربیت دیکر سلطنت کے مناصب جلیلہ پہ مامور کرنا پڑتا) مگر بیوروکریسی کے ذریعے سے حکومت کرنی یونانیوں کا شیوہ نہ تھا۔ اسلیئے اسکندر کو ایسے طرز حکومت سے لگاؤ نہ ہوا۔ اسنے اپنے دل میں یہ تصور باندھ رکھا تھا کہ ایشیا میں جسکو فتح کر چکا ہے اور یورپ کے مغربی ملکوں میں جنکو فتح کریگا

ارادہ ہے جا بجا یونان کی شکل کثرت سے شہری ریاستیں قائم کی جائیں۔ ان میں ہر ایک ریاست بذات خود مکمل ہو۔ اور دوسری ریاست سے ایک جدا ہستی رکھتی ہو اور ہر ریاست کے بیچ میں ایک شہر ہو جو اسکا دارالریاست ہو۔ ہر ایسی ریاست میں ایک مجلس عام (اکلیسیہ) اور ایک کونسل (مجلس خاص) ہو۔ بہت سے مجسٹریٹ (عامل) ہوں جنکو شہر کے لوگوں نے خود منتخب کیا ہو۔ خود اُسی ریاست کے وضع کئے ہوئے یا دوسروں سے مستعار لئے ہوئے (۱۳۵)
قوانین جاری ہوں۔ اور ہر ایک ریاست آزاد لوگوں کی ریاست ہو جسمیں یونانی زبان بولی جاتی ہو۔ یونانی علم و ہنر کو ترقی دیجاتی ہو۔ اور لڑائی بھی جب ہو تو یونانی ہتیاروں اور یونانی فنون جنگ کے مطابق ہو۔ یہ منصوبہ بہت اچھا تھا۔ لیکن اسمیں پوری کامیابی نہ تو اسکندر کی زندگی میں ہو سکی اور نہ اُسکے بعد ہوئی مگر ایک نمونہ ضرور ایسا پیدا ہو گیا جسکے مطابق آیندہ کی نسلوں نے پانچ سو برس تک ایسی ہی ریاستیں قائم کرنیکی ہمیشہ کوشش کی۔

یہ ظاہر ہے کہ اسکندر کے اس خیال میں کہ یونان کا علم و ہنر سب میں بڑھکر ہے کبھی فرق نہ آیا اور جو منصب تمام شہری ریاستوں اور اُنکے باشندوں پر ایک حکومت لا انتہا ہی رکھنے کا اسنے اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا وہ اُس عاقل و زیرک کا منصب تھا جسیں اُسکے اُستاد ارسطاطالیس نے سب سے زیادہ سیاسی قابلیت رکھی تھی۔ اس امر سے کہ ارسطاطالیس ہر شہری ریاست کیلئے ایک عاقل کے ذریعہ سے حکومت پسند کرتا تھا اور اُسکندر تمام ریاستوں پر ایک مختار کل بادشاہ کی حکومت پسند کرتا تھا اُستاد اور شاگرد کے خیال میں کوئی بڑا اختلاف پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن اسکندر نے ارسطاطالیس کے خیال کو ایک اجنبی ملک میں جس قسم کے سیاسی طریقے قائم کرکے ایک عملی صورت دینی چاہی وہ طریقے یونانیوں کے دستور اور عادت کے خلاف تھے۔

بہر کیف غیر ملکوں میں خاص یونانی طرز سیاست کو جاری کرکے اسکندر نے خیال کیا کہ وطن سے باہر یونانی زندگی اور یونانیوں کے خیالات کی

حفاظت کیلئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے۔ مگر وہ یہ نہ سمجھتا تھا کہ اسمیں یونان کی جن اصلی خوبیوں کو محفوظ رکھنا مقصود ہے وہ ہی معرض زوال میں آجائیں گی۔

اسمیں ہرگز شبہ نہیں کہ ارسطاطالیس نے ایشیا کے لوگوں کو جیسا نااہل اور طبقہ ادنیٰ سے سمجھ رکھا تھا اسکندر نے اُنکی نسبت ایسا خیال نہیں کیا۔ اہل مصر اور اقوام سامیہ کی نسبت اسکا کیا خیال تھا اسکا حال معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ اُسنے اُن لوگوں کو قدرتی طور پر غلامی کے لائق سمجھا ہو اور اُنکی نسبت یہ ہی فیصلہ کیا ہو کہ جہاں کہیں یہ لوگ یونانیوں کے بسائے ہوئے شہروں میں آباد ہوں وہاں یونانیوں کی خدمت میں ہمیشہ لکڑیاں کاٹنے اور پانی کھینچنے والے رہیں۔ لیکن میڈیا (شمالی مغربی ایران) اور خاص ایران کی نسبت یا ایشیا کے زیادہ مشرقی حصوں میں جو ایرانی نسل کی قومیں تھیں اُنکی نسبت اسکندر کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی اور یہ تبدیلی اُسوقت ہوئی جبکہ اُن قوموں کو تسخیر کرنیکے بعد اُنکا پورا علم اور تجربہ حاصل ہو گیا اور اُنکی ترقی کیلئے جو بڑا کام پیش نظر کر رکھا تھا اُس کی اہمیت کو سمجھنے لگا۔

اسکو معلوم ہوا کہ اِن ایرانی قوموں میں قابلیت کے وہ جوہر موجود ہیں جنکا مقابلہ یونانیوں اور مقدونیوں کی قابلیت سے کیا جا سکتا ہے۔ اُنکی صورت و شکل سے اسکو کسی قسم کا اکراہ پیدا نہیں ہوا بلکہ اُن ہی میں سے ایک قوم کی شہزادی سے اُسکو عشق پیدا ہوا اور اُس سے اپنا عقد کیا۔ اُسکا خیال تھا کہ اگر ایرانیوں کو یونانی زبان سکھا دی جائے اور نو آباد یونانیوں سے ایشیا میں نئے شہر آباد کرکے جو یونانی نظم حکومت قائم کیا ہے اگر اس نظم حکومت میں ایرانیوں کو پورا حصہ دیا جائے اور مقدونیہ کے ہتھیار بھی اُنکو دئے جائیں۔ اور مقدونی طریقے پر اُنکو فوجی قواعد بھی سکھائے جائیں اور مقدونی فوجوں میں اُنکو بھرتی بھی کیا جائے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اُنکے رئیسوں اور شریفوں کو حکومت کے بڑے بڑے منصب

اور عہدوں پر مقرر کیا جائے تو بالکل ممکن ہے کہ تھوڑے زمانے میں ایشیا کے جدید اور قدیم ممالک باہم شیر و شکر ہو کر ایک ایسی نئی قوم پیدا کر دیں جسکو کسی خاص ملک کا نہیں بلکہ تمام دنیا کا باشندہ سمجھنا درست ہو۔

اس مسلکِ سیاسی کو باوجود اختلاف کے اسنے مصمم ارادے کیساتھ عمل میں لاتا جاتا۔ ہندوستان میں فتوحات کے بعد سوسہ (شوستر کے قریب) واپس آیا اور یہاں خود آرائی اور خود ستائی کیلئے یہ اچھا موقع نکالا کہ ایک شادی رچائے جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ یورپ اور ایشیا کی ممتاز قوموں کو بالکل آمیز کرنا چاہتا ہے۔ مورخ آریان اپنی کتاب اناباسیس میں ارسٹوبولوس کا قول نقل کر کے جسنے اس تقریب کو بچشم خود دیکھا تھا لکھتا ہے کہ "اسکندر نے خود تو بارسینی سے (غالباً استاتیرا سے مراد ہے) جو دارا کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور دارا سے پہلے بادشاہ ایران اوکس کی چھوٹی بیٹی پری ساتس سے شادی کی۔ (ان سے پہلے وہ رُوسینی (روشنک) بنتِ اوکزایرتس بادشاہ بخارا کی بیٹی سے بھی شادی کر چکا تھا) اور اپنے دوست ہفستیون کا عقد درائی پیتس سے کرا دیا۔ یہ دارا کی بیٹی تھی اور بہن تھی بارسینی کی جس سے اسکندر نے ابھی شادی کی تھی۔ اپنی بیوی کی بہن سے اپنے دوست کی شادی کرا دینے سے یہ غرض تھی کہ اسکندر اور ہفستیون کی اولاد میں قریب کا رشتہ ہو جاوے۔ اپنے ایک دوسرے جرنیل کراتیرس کی شادی اماستری نی سے کرا دی جو دارا کے بھائی اوکزاتریس کی بیٹی تھی۔ اپنے ایک دوسرے جرنیل پہ وتیکاس کی شادی اترو پاتیس صوبہ دار میدیا کی لڑکی سے کرا دی۔ اسیطرح اپنے نائب بطلیموس اور اپنے معتمد خاص یومینز کا عقد ارتابازوس کی بیٹیوں سے کرا دیا۔ بطلیموس کا عقد ارتاکاما سے اور یومنیز کا عقد ارتونس سے ہوا۔ نیارکس کی شادی بارسینی اور منتور کی لڑکی سے کر دی۔ سیلیوکس کا عقد اسپی تامنیز باختری کی بیٹی سے کرا دیا۔ اور اسیطرح اپنے اسی درباریوں کی شادیاں میدیا اور ایران والوں کی لڑکیوں سے جو حسن و جمال میں شہرت رکھتی تھیں کر دیں۔ یہ شادیاں

ایرانی طریقے سے ہوئیں۔ پر تکلّف تخت بچھائے گئے جن پر اسکندر کے یہ
درباری نوشہ بنکر بیٹھے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آریان کا قطع کلام کر کے
درباری نقیب کاریوس کی عبارت نقل کریں جسکے اہتمام سے اس تقریب
میں آرائش کے سامان کئے گئے تھے۔

کاریوس لکھتا ہے کہ بڑا شامیانہ لگا کر ایک نہایت عالیشان ایوان
آراستہ کیا جسمیں سو تخت چاندی کے اسطرح رکھے گئے کہ ہر تخت پر دو دو آدمی
آرام سے بیٹھکر میزوں تک پہنچ سکیں۔ ہر ایک تخت میں ۲۰ مینا (تقریباً
۹۰۰ روپیہ) کی چاندی لگی تھی۔ بادشاہ کیلئے جو تخت تھا اُسکے پائے سونے (۱۳۸)
کے تھے۔ اسکندر کے ایرانی احباب اس تقریب میں مدعو تھے۔ اس
ایوان کے سامنے جسمیں بادشاہ اور اُسکے مصاحبین نوشہ بنکر بیٹھنے
والے تھے ایک دوسرا شامیانہ مہمانوں کی نشست کیلئے تھا۔ بیچ کے
صحن میں برّی و بحری لشکر کے سپاہی غیر ملکوں کے سفیر اور ہر درجے کے
مہمان جمع ہوئے۔ ایوان خاص نہایت پر تکلف طریقہ پر سجایا گیا تھا۔
نہایت قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ جا بجا خوبصورت رنگ برنگ کے
کپڑے جن پر زری کا کام تھا لٹکائے گئے تھے۔ جس شامیانہ کے نیچے
یہ پر تکلف سامان تھا اُسکے ستون دس دس گز اونچے سونے اور چاندی
سے منڈھے اور جواہرات سے مرصع تھے۔ شامیانے میں ہر طرف دروازے
تھے جن پر زرتار کے پردے سونے اور چاندی کی سلاخوں سے لٹکے
ہوئے تھے۔ ان پردوں پر زری اور منقش سے تصویریں بنائی گئی تھیں۔
پورے احاطے کا دور نصف میل کا تھا۔ ہر ایک کام قرناء
کی آواز پر شروع ہوتا تھا۔ اگر دعوت میں لوگ بیٹھے تو قرناء بجایا گیا۔
اگر شادی کی رسم شروع ہوئی تو قرنا بجا۔ اگر بتوں پر پھول پانی چڑھایا گیا
تو قرناء کی آواز بلند ہوئی۔ غرض ہر کام کو شروع کرتے ہی تمام لشکر کی اطلاع
کیلئے قرناء کی صدا بلند ہوتی تھی۔ دعوت ختم ہونیکے بعد ایک ایک عروس
ایوان میں داخل ہو کر اپنے اپنے نوشہ کے تخت کے قریب آتی۔ نوشہ عروس کا

ہاتھ پکڑ کر اسکو تخت پر بٹھاتا اور اسکے ہاتھ کو بوسہ دیتا ۔ یہ طریقہ سب سے پہلے اسکندر سے شروع ہوا...... اسکے بعد ہر ایک نوشہ اپنی عروس کو لیکر چلا گیا ۔ ان تمام بیویوں کا مہر ادا کر دیا گیا تھا ۔ اسکے علاوہ جسقدر مقدونیوں نے ایرانی عورتوں سے شادیاں کیں انکے نام ایک کتاب میں درج کر لئے گئے ۔ بیان ہوا ہے کہ ایسے مقدونیوں کی تعداد دس ہزار تھی ۔ ان لوگوں کو بھی ضیافت کے وقت تحائف دیئے گئے تھے ۔ (۱۳۹)

اس تقریب کے بعد پانچ دن تک برابر ناچ ورنگ کی محفلیں جمی رہیں ۔ ہر ملک کے گانے بجانے کھیل تماشہ دکھانے والے حاضر ہوئے اور ہر قوم کے لوگوں کو انکے مذاق کے مطابق اپنا اپنا ہنر دکھاتے رہے ۔ اگر صرف یہ ہی چیزیں ہوتیں تو یونانی بے لطف ہو جاتے مگر یونانی ناٹک اور موسیقی کے بڑے بڑے استاد بھی حاضر تھے جو بیچ میں اپنا اپنا فن دکھاکر سب کو محظوظ کرتے تھے ۔

ان واقعات سے اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ اسکندر کا یہ مقتضائے طبیعت تھا کہ اپنے اصولوں کو ایسے کاموں سے ظاہر کرے جو بڑے اہتمام سے اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے مجمع میں کئے جاویں ۔ اب ہم افریقہ میں علاقہ سایرینی سے ہیکل ایمون کو اسکے عجیب وغریب سفر کا حال لکھتے ہیں ۔ پہلے تو مصر سے سمندر کے کنارے کنارے مغرب کی سمت میں ایک سو چھتر میل کا سفر کرنا پڑا ۔ پھر وہاں سے جنوب میں تقریباً سات دن کے سفر کے بعد منزل مقصود تک پہنچنا ہوا ۔ اسوقت اسکندر کا ایک ایک دن نہایت قیمتی تھا ۔ لیکن ایسی حالت میں پورا ایک مہینہ اس سفر میں ضائع کرنا اس مطلب کے مقابلے میں بڑی چیز نہ تھا کہ ایمون کے ہیکل میں قدم رکھتے ہی سب لوگ فرزند زیوس کے لقب سے اسکو پکار پکار کر مبارکباد دیں ۔ لیکن اب اسپر غور کرنا چاہیئے کہ زیوس کا فرزند بننے میں اسکندر نے کیا فائدہ سوچا تھا ۔

اس قسم کی شہرت سے نہ تو مصر میں اسکو کوئی فائدہ پہنچتا تھا اور نہ

ایشیا کی قوموں میں ہیکل سیوہ کا دیوتا ایمون کوئی بزرگی رکھتا تھا۔ اس سے
ثابت ہوا کہ محض یونانیوں کی نظر میں اپنا درجہ بڑھانے کیلیئے یہ سفر اختیار
کیا تھا۔ کیونکہ سیوہ کے ہیکل میں غیب سے جس بات کا حکم دیا جاتا تھا وہ
(۱۴۰) ارباب حکومت کیلیئے خواہ کیسا ہی پریشان کرنیوالا ہو مگر خوش عقیدہ
لوگوں کے دلوں پر اسکا بڑا اثر ہوتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ غیب سے جس سوال
کا جواب ملتا تھا اسکا تعلق محض سائل سے ہوتا تھا۔ غیر لوگوں کو ایسے
جواب سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ لیکن اسکندر نے اسکی گنجایش نہ رکھنی چاہی
کہ کوئی متنفس بھی اس خبر سے لاعلم رہے کہ وہ زیوس دیوتا کا فرزند ہے۔
اسمیں ہرگز شبہ نہیں کہ لوگوں میں اس معاملے پر بہت کچھ رد و قدح رہا اور
جہانتک یونان سے تعلق تھا یہ معاملہ یہیں تک پہنچکر رک جاتا مگر اس
واقعہ کے سات برس کے بعد جسوقت سوسہ کے شہر میں ضیافت ہو رہی
تھی تو اسکندر نے ایک تاکیدی فرمان یونان کی تمام شہری ریاستوں کے
نام اس مضمون کا جاری کیا کہ اسکو دیوتا مانا جاوے۔ اس لیئے اس
معاملے نے اور بھی پیچیدہ صورت اختیار کرلی۔

کسی بادشاہِ وقت کا اپنے تئیں دیوتا منوانا ہم لوگوں کو ایک
عجیب بات معلوم ہوگی کیونکہ ہمارے ہاں (یعنی عیسائیوں کے ہاں)
دینیات اور معاملات ملکی کے صیغے بالکل جدا ہیں۔ ہمارے مذہب کی
بنیاد ایک آسمانی کتاب ہے۔ جس کے معنی سمجھنے میں اختلاف ہو جاوے
لیکن اس میں کوئی نئی چیز بطور ضمیمہ کے اضافہ نہیں ہو سکتی۔ مگر یونان میں
کسی بادشاہ کے دیوتا بننے کا مسئلہ اس قسم کا ہوتا تھا کہ اس کا
مجلس عموم کے سامنے فیصلے کیلیئے پیش ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اور
اسوقت یونانیوں کی بالخصوص اہل ایتھنز کی حالت یہ تھی کہ ان کے
دروازے پر غیر ملکوں کے بہت سے دیوتا گویا حالتِ انتظار میں بیٹھے
رہتے تھے کہ غیر ملک والے یا خاص ایتھنز کے لوگ جو انکے معتقد و
پرستار ہیں مجلس عموم کے سامنے انکا دعویٰ پیش کرکے انکا نام بھی اپنے

دیوتاؤں کی فہرست میں درج کرادینگے۔

(۱۴۱) جن ملکوں میں کثرت سے دیوتا مانے جاتے ہیں وہاں دیوتاؤں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں ہوتی۔ اسلیئے ایکایک ایسے دیوتاؤں کے ظہور کا احتمال رہتا تھا جو ابھی تک کسی قوم پر ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ ان قوموں کا یہ اعتقاد تھا کہ آکاش پر کسی قسم کی بدانتظمی و بے ترتیبی کی اجازت نہیں تھی اسلئیے ہر ایک قوم نے اپنے اپنے دیوتاؤں اور دیبیوں کو انکی طاقت اور قوت عمل کے مطابق دیوتاؤں کی بزم میں جگہ دے رکھی تھی۔ اور سب سے کم درجے کے دیوتاؤں یا نیم دیوتاؤں۔ یا سورماؤں میں انسان سے کچھ زیادہ فرق نہیں رکھا تھا۔ یونانیوں کے بہت سے دیوتا ایسے تھے جن سے یونانیوں کا برتاؤ ایسی ہی موانست و بے تکلفی کا تھا جیسے آیندہ عیسائیوں کا برتاؤ بعض بزرگان دین عیسوی سے رہا تھا۔ اسکندر کے بزرگوں میں ہفیسیوس اور ہرکلیز کے زمانے میں ان کم درجے کے دیوتاؤں میں سے بعض انسان تھے جو زیوس کی مہربانی سے اولمپیوس کے دیوتائی دربار میں اسوجہ سے شامل کرلیئے گئے تھے کہ انھوں نے انسان کی بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ یہ سب زیوس کی اولاد میں شمار ہوتے تھے۔ مگر اب تو زیوس نے اسکندر کو اپنا فرزند بنالیا تھا پھر اسکا شمار دیوتاؤں میں کیوں نہ کیا جاتا۔

لیکن اس امر میں مذہب یا اُس طریقے کے اعتبار سے جس سے زمانۂ سابق میں انسان کو دیوتائی کا درجہ ملا کرتا تھا جو مشکل تھی وہ یہ تھی کہ اسکندر ابھی تک بقید حیات تھا۔ اور یہ مشکل وہ تھی جسکا حل کرنا سخت دشوار تھا۔ یونانیوں میں کوئی مذہبی دلیل ایسی موجود نہ تھی جس سے کسی زندہ بادشاہ کی پرستش کہ وہ دیوتا ہے بطور نتیجے کے نکل سکتی ہو۔ اور در اصل ایتھنز میں اسکندر کے دیوتا بنانے کے مسئلہ میں جسقدر اختلاف ہوا وہ مذہبی دلائل کی بنیاد پر مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے ہوا۔ بہرکیف اسکندر کو دیوتا ماننا پڑا لیکن جو لوگ مذہب میں پختہ تھے وہ

اسکندر کی دیوتائی پر اسطرح رضامند ہوئے جیسے کوئی شخص حالات سے مجبور اور اپنی بے بسی سے معذور ہو کر کسی بات پر سر جھکا لے۔ (۱۴۲)

اسکندر کو دیوتا بنانے کی دلیل مذہب پر نہیں بلکہ فی الحقیقت لامذہبی پر رکھی گئی تھی جس سے ظاہر تھا کہ لوگوں کو اُمور فوق الفطرت کا یقین نہ تھا اسکندر کا زمانہ اِس لامذہبی کیلئے مخصوص خیال کیا گیا ہے۔ یہ بڑے انقلاب وطوفان کا زمانہ تھا جس میں یونان کا قدیم مذہب اپنا تمام سرمایہ کھو بیٹھا تھا۔ جو لوگ اپنے تئیں نئی روشنی کا کہتے تھے وہ بے شمار تھے۔ اور اُنکے نزدیک دیوتاؤں کی کوئی ہستی نہیں رہی تھی۔ بلکہ اپنے پُرانے لوگوں کی روحوں کی مثل جنکو پولیسیز نے خون پلا کر خواب عدم سے جگا لیا تھا ان دیوتاؤں کا عدم وجود محض انسان کی توجہ و مہربانی پر موقوف تھا۔ اگر انسان کی نظر انکی طرف سے ہٹ گئی اور انکی خدمت اسنے ترک کر دی تو انکو لوگ فراموش ہی نہیں کر دیتے تھے بلکہ وہ قطعاً معدوم ہو جاتے تھے۔ یہ محض اُس زمانے کے بت پرستوں کا احساس شکر گذاری تھا کہ انھوں نے بہت سی رسوم سے جنکو مذہبی رسوم کہا جاتا تھا اپنے محسنوں کی یاد کو زندہ و قائم رکھا۔ یہ ضرور تھا کہ کسی وقت میں یہ دیوتا واقعی زندہ ہستیاں تھے لیکن یہ اُسوقت تھا جبکہ وہ انسان کی شکل میں دنیا میں زندہ و آباد تھے اور ابھی تک مرے نہ تھے۔ انسانی حالت میں انھوں نے انسان کی بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں۔ بڑے بڑے شہر آباد اور بڑے بڑے ملک فتح کئے تھے۔ قوانین وضع اور علم و ہنر ایجاد اور طرح طرح کے اناج اور پھل پیدا کئے تھے۔ اور جانوروں کو انسان کے لئے کام کرنے سکھائے تھے۔ یہی وہ باتیں تھیں جنکو اُس زمانے میں بھی دنیا کے بڑے بڑے عالی دماغ سکھایا کرتے تھے۔ مگر اسکے پچاس برس بعد یعنی ۳۰۰ ق م میں ایک شخص یوہیمورس نے جو مسینی کا رہنے والا تھا ایک کتاب لکھی تھی۔ جسمیں اُس خیال کو ذہن نشین کرتا کہ انسان کی خدمت کرنے سے انسان بھی دیوتائی کے درجے کو پہنچ جاتا ہے حقیقت میں

اُسی مصنّف کا حصّہ تھا۔ یوہیمورس نے قصّہ نویس ڈیفو کی طرح اپنے مضامین میں
ایک فرضی واقعہ نگاری کا ڈھنگ اختیار کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے کہ وہ بحری سفر (۱۴۴)
میں مصروف تھا کہ اسکا جہاز یمن کے سمندر سے جنوب کیطرف بہکر بحر ہند کے ایک
جزیرہ پنکیا کے کنارے ٹھیر گیا۔ جہاں اسکو ایک قوم ملی جو مجموعہ اوصاف تھی۔
یہاں مصنّف نے اس قوم کی معاشرت و سیاست کے حالات اسی قسم کے بیان
کئے ہیں جو افلاطون نے کتاب ریپبلک (جمہوریہ) میں ایک فرضی قوم کے لکھے ہیں
اس جزیرے میں مصنف کو ایک عجیب چیز ہاتھ لگی۔ یہ سونے کی تختیوں پر مصری زبان
میں ہرمنبر لکھی ہوئی ایک تحریر تھی جسمیں کرونس اور زیوس کے کارنامے اور
دیوتاؤں اور دیبیوں کے حالات جنکا شمار یونان کے دیوتاؤں میں تھا لکھے تھے۔
یہ تمام دیوتا اپنے اپنے زمانہ میں جزیرہ پنکیا کے انسانی بادشاہ رہے تھے۔
اور ان میں سے بعض مثلاً زیوس اور ڈائیونیسوس وہ دیوتا تھے جنکا شمار دنیا کے
فاتحوں میں ہوتا تھا۔ انمیں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے اخلاقی اعتبار سے
مشکوک و مشتبہ کام کرنے پر بھی اپنے حق میں دنیا سے اچھی رائے حاصل کی
تھی۔ یہ مصنّف لکھتا ہے کہ افرودیتی دیبی دنیا میں سب سے پہلی زانیہ تھی۔
اور ڈائیونیسوس کا دادا کیڈموس بادشاہ سیدیا کا باورچی تھا جو ایک نوجوان
بانسری بجانے والی عورت ہارمونیہ کو بھگا لے گیا تھا۔

یہ مذہبی تحریر "بت پرستی کی سب سے اخیر اور مستند کتاب ہے۔
کلیمنٹ لکھتا ہے یہ تحریر (اُسکے نزدیک) دہریت کے الزام سے اسوجہ سے
بچ گئی کہ اسمیں سچی دیوتائی کا رتبہ اجرام فلکی کو دیا گیا تھا جنکو ازلی و معصوم تصوّر
کیا جاتا تھا۔ اور جسقدر پرانے دیوتاؤں کا درجہ کم کیا تھا اسیقدر اجرام فلکی
کا درجہ بڑھایا تھا۔ کرونس دیوتا کا سب سے بڑا کام یہ بتایا ہے کہ اس نے
پنکیا کے جزیرہ میں کواکب پرستی کا چرچا کر دیا۔

کواکب پرستی کے اعتبار سے یوہیمورس کی کتاب ان خیالات کے مطابق
ہے جو اس زمانے سے پہلے لوگوں میں مذہب کی غرض سے مانے جاتے تھے۔
اس زمانہ کے اکثر لوگ چند فوق الفطرت قوتوں کے معتقد تھے منجملہ انکے

(۱۴۴)

ایک قوت تائیدی تھی یعنی "بخت و اتفاق"۔ یونانی اس قوت کے بڑے قائل تھے۔ دنیا کے معاملات میں "اتفاق" کا دخل اس قسم کا مانا گیا تھا کہ جس سے آجکل کے لامذہب بھی انکار نہیں کر سکتے۔ یونان میں یہ زمانہ ایسا آیا تھا کہ لوگ بالعموم ان دیوتاؤں اور دیبیوں کے قائل نہ رہے تھے جنکے لئے بڑے بڑے شہر و نیز ہیکل و بتکدے بنے ہوئے تھے اور اُنکی مقبوضہ املاک کا انتظام جاری تھا۔ جن میں پوجا کیلئے پروہت مقرر تھے۔ جہاں قربانیاں کیجاتی تھیں اور تہوار اور میلے جبا کرتے تھے۔ اب تو دیوتاؤں اور دیبیوں کا جو کچھ اثر مانا جاتا تھا وہ اُنکے اُن کاموں سے متعلق تھا جو اس دنیا میں مردوں اور عورتوں کی شکل میں زندہ رہکر اونھوں نے کئے تھے۔

زیادہ سے زیادہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ دیوتا گویا عالم بالا پہ دیوتائی کا اصلی نمونہ تھے اور عالم پستی میں اسکندر انکی ایک نقل تھا جسنے بڑے بڑے شہر آباد کر کے انکا طرز حکومت قائم اور اُنکے قوانین وضع کئے تھے۔ اور ان تمام ملکوں کو مسخر کیا تھا جنکو دائیونیسوس دیوتا کسی زمانہ میں فتح کر چکا تھا۔ اور جسکا ارادہ تھا کہ ایک شاہ راہ افریقہ کے شمالی ساحل پر منارہ ہرقلس تک جسکو دنیا کی انتہا سمجھا جاتا تھا تعمیر کرے۔ اور جسکی بڑی تمنا یہ تھی کہ اپنے عہد میں یورپ اور ایشیا کی قوموں کو ملا جلا کر ایک ہی قوم بنا دے اور دنیا کی معاشرت اور سیاست کے و ضعہ کو اپنی ہی قوت بازو سے سنبھالے رکھے۔

بت پرستوں کے مذہب میں اب یہ قوت نہ رہی تھی کہ وہ ایک زندہ انسان کو دیوتائی کے رتبہ پر پہنچا دے۔ مصر میں جو جانور متبرک مانے جاتے تھے انکا متبرک ہونا بھی بحیثیت متبرک جانور ہونے کے مرنے کے بعد ستر دن سے زیادہ قائم نہ رہتا تھا۔ اسکے بعد دیوتاؤں میں انکا شمار ہو جاتا تھا لیکن جو لوگ اسوقت لامذہب سمجھے جاتے تھے انھوں نے دیوتاؤں کو انکے درجے سے گرا کر انسان کے درجے تک پہنچا دیا تھا اور اُنکے نزدیک کوئی وجہ نہ تھی کہ جو تعظیم عدم رفتہ بزرگوں کی کیجاتی تھی وہ زندہ بزرگوں کی نہ کیجاوے۔ انسان بادشاہوں کو دیوتا ماننے کے جواز میں جو سب سے پہلی تحریر دستیاب ہوتی ہے اس پر

(۱۴۵)

ریاست ایتھنز کی مہر موجود ہے۔ چنانچہ ۲۹۰ ق م جسوقت مقدونیہ کا نوجوان بادشاہ دیمی تریوس جو ایتھنز کا بھی بادشاہ تھا ایتھنز کو واپس آیا ہے تو لوگوں نے اس عبارت میں اسکی مدح سرائی کی تھی۔

"دیکھو بادشاہ آرہا ہے۔ آزاد ہے۔ سب سے بے نیاز ہے۔ خوبصورت وخندہ پیشانی ہے۔ جیسے کوئی دیوتا ہو۔ درباری حلقہ میں اسکی صورت سے کیسی شاہانہ عظمت ظاہر ہورہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آفتاب ہے اور اہل دربار آسمان کے تارے ہیں۔ مبارک ہے تیرا ورود اے پوسیدون اور افرودیتی کے قوی ہیکل فرزند۔ تو دیوتا ہے۔ بلکہ دیوتا تو بہت دور بستے ہیں۔ نہ وہ کان رکھتے ہیں اور نہ کوئی وجود۔ اور نہ انکو ہماری پروا ہے مگر تجھکو ہم اسطرح دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے سامنے ہے اور ہم تیرے سامنے۔ سچا دیوتا تو ہی ہے۔ لکڑی اور پتھر کا بے جان بت نہیں ہے۔" اس عبارت کو پڑھکر جو خوش عقیدہ بت پرستوں کے نزدیک کفر تھی اس ماخذ خیال تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا جہاں سے یونانی بادشاہوں کو دیوتا ماننکر اونکی پرستش کا عقیدہ پیدا ہوا تھا۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ہی دیوتاؤں کو بیکار مان رہے تھے انھوں نے ایک ایسے دیوتا کا بوجھ خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں ڈال لیا جسکی طاقت محض برائے نام نہ تھی بلکہ اصلی طاقت تھی اور بہت تھی۔ اور تالاب کے مینڈکوں کی طرح لکڑی کے ایک ٹکڑے کو بادشاہ ماننے سے انکار کر کے اوکی جگہ لمبی چونچ والے لق لق کو اپنے اوپر حکومت کرنے کیوں بلا لیا۔ مگر یہ ہی نکتہ ہے جسپر آجکل کے نکتہ سنج اختلاف رکھتے ہیں ان میں ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ اسکندر کو یونانیوں نے دیوتا ماننے میں فی الحقیقت اسکی عجیب وغریب لیاقت وقابلیت کی داد دی تھی۔ انکا یہ فعل اس تعظیم و بزرگی کیوجہ سے تھا جو ایک بڑا آدمی لوگوں کے دلوں میں ازخود پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن اس خیال میں جس شد و مد سے اسکندر پہلے ہی سے تعریف کا مستحق ہو جاتا ہے۔ وہ ان جملوں سے نہیں نکلتی جو اِس خیال کی اشاعت کے وقت یونان میں بعض جگہ

لوگوں کی زبان سے نکلے تھے ۔ اور جن سے صاف صاف حقارت ظاہر ہوتی تھی ۔ مثلاً جسوقت اسپارٹا میں اسکندر کا پیغام پہنچا کہ حکومت کی طرف سے اسکا دیوتا ہونا مشتہر کیا جاوے اور دامس اس تحریک کیلئے کھڑا ہوا تو اسنے اسپارٹا
(۱۴۶) والوں سے صرف اتنا ہی کہا کہ "اگر اسکندر اپنے تئیں دیوتا کہنا چاہتا ہے تو اسکو کہنے دو" اسی طرح ایتھنز میں دیموس تھنیز نے اپنے ہموطنوں سے کہا کہ اگر اسکندر کی یہ ہی تمنا ہے کہ اسکو زیوس بلکہ پوسیدون کا بیٹا کہا جاوے تو تم بھی ایسا ہی کہنے لگو ۔ "مگر انکے علاوہ اور مقامات پر اسکا واقعی دیوتا ہونا فوراً تسلیم کر لیا گیا ۔ اور اس سے فی الحقیقت اس جوش رضامندی کا اظہار کیا گیا جو اسکندر کی ان خدمات کی وجہ سے جو ابتک اس سے عمل میں آئی تھیں یا آئندہ آنے کی امید کیجاتی تھی لوگوں کے دلوں میں موجود تھا ۔ اس سے پہلے یونانی اور یونانیوں کے ساتھ اور قومیں بھی اسکندر کی اسی طرح شکر گذار ہو چکی تھیں اور ان سے بھی کچھ کم غلامانہ عجز و انکسار ظاہر نہیں ہوا تھا مگر انھوں نے اسکندر کو دیوتا نہیں مانا تھا ۔ اسلئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعریف یا اظہارِ شکر و بندگی نے یہ شکل کیوں اختیار کی تھی کہ اسکندر کو دیوتا مانا گیا ۔

یہ واقعہ ہے کہ اسکندر نے تمام شہری ریاستوں کو حکم دیا کہ اس کو دیوتا مانا جاوے اور جسوقت ۳۲۴ق م میں سوسہ کے شہر سے اس نے یہ حکم بھیجا تو اسکے جواب میں یونان کی ریاستوں نے اپنے سفیر اسکندر کی خدمت میں اس طرح نہیں بھیجے جیسے کسی بادشاہ یا ریاست کو بھیجے جاتے ہیں بلکہ ایسی بندگی و اظہار اطاعت کے ساتھ روانہ کئے کہ گویا وہ کسی دیوتا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ۔ یہ سفارت ۳۲۳ق م کے موسم بہار میں اسکندر کی موت سے چند روز پہلے اسکے پاس پہنچی اور اسکندر کے ملاحظہ کیلئے وہ احکام پیش کئے جو ریاستوں نے خود اسکندر کے ایما سے اسکے دیوتا ہونے کے بارے میں اپنے ہاں جاری کئے تھے ۔ لیکن اِس سوقت تو یہ کارروائی اسکندر کے ایما سے ہوئی تھی مگر اسکے مرنے کے

پچاس برس بعد شاہانِ وقت کو دیوتائی کا اعزاز باوجودیکہ وہ انکار کرتے تھے انہی ریاستوں کی تحریک سے ملتا رہا۔ پس ہم کو یقین کر لینا چاہئیے کہ بادشاہ کو دیوتا ماننا ایسی چیز تھی جسکی ضرورت اسکندر ہی کو نہ تھی بلکہ ان ریاستوں کو بھی تھی جو اسکندری قلمرو میں شامل تھیں۔ اور اس چیز سے جو کام نکالنا مقصود تھا اسکے سمجھنے میں کسی کو بھی کوئی شبہ نہ تھا۔

اس عزت سے اسکندر کو شہری ریاستوں کی دنیا میں جسکا از سر نو انتظام (۱۴۷)
اسنے اپنے ذمہ لیا تھا ایک قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ارسطاطالیس سے اسکو تعلیم ملی تھی کہ سیاسیات میں جو شخص سب سے بڑھکر قابلیت رکھتا ہو۔ جیسے کہ اسکندر سے خود ظاہر ہوئی تھی تو ایسے شخص کو اس کے ملک کی ریاستوں میں سب لوگوں کے برابر سمجھنا بے انصافی ہے۔ پس اگر وہ ریاست میں محض ایک شہری تصور کیا گیا تو پھر سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں کہ وہ سب کے برابر سمجھا جاوے۔ ماسوا اسکے اسکندر نے اپنے تئیں تمام ایسی آئینی اور دستوری قیدوں سے آزاد کر لیا تھا جو مقدونیہ کے شاہانِ سابق پر عائد رہی تھیں۔ اور ایسے عہد ناموں کی پابندی سے بھی آزاد ہو چکا تھا جو اسنے اپنے شروع زمانہ حکومت میں یونانی شہروں سے کئے تھے۔ اسوجہ سے اگر وہ زمین پر دیوتا نہ مانا جاتا تو جیسا خود ارسطاطالیس نے اس مسئلہ میں اشارہ کیا تھا ممکن تھا کہ کوئی اسکو ہلاک کر دیتا۔ یا قانون کی پناہ اسپر سے اٹھالی جاتی یا وہ ملک سے خارج کر دیا جاتا۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جاوے تو جسوقت ہر ایک ریاست نے اسکندر کا شمار اپنے اپنے دیوتاؤں کے زمرہ میں کر لیا تو پھر وہ ایک بادشاہ مطلق العنان ہو گیا۔ اور اسکو حق حاصل ہو گیا کہ وہ اپنی قلمرو کے لوگوں کو جو حکم چاہے دے۔ اسکے ساتھ ہی ریاستوں کو یہ نفع پہنچا کہ کسی حاکم غیر کی حکم برداری انپر لازم نہ رہی اور اسی شکل میں کل ریاستیں رضامند ہو گئیں کہ اسکندر انپر حکومت کرے اور انھوں نے اپنے ارادے اور قصد کو مطلقاً اسکندر کا پابند کر دیا۔

پس کسی فرمانروا کو دیوتا بنانا شہری ریاستوں کے حق میں گویا اسکے سامنے زمین بوس (پروسکائی نیسس) ہونے کے برابر تھا۔ جسکا نتیجہ بادشاہوں کی

اِس مطلق العنانی میں ظاہر ہوا جسکو یورپ نے تو کیا ایشیا نے بھی پہلے نہ دیکھا تھا
اور جسکا دیکھنا اُس زمانے سے آجتک بند نہیں ہوا ہے۔ حاکم کو دیوتا بنانے میں
یہی ایک قبیح اور افسردہ کن پہلو نکلتا ہے جسنے اسکی اصلی خدمت پر تاریک پردہ ڈالدیا
(۱۴۸) ہے۔ وہ اصلی خدمت یہی تھی کہ تمام شہری ریاستوں میں دائمی اتفاق و اتحاد پیدا
کر کے ایک تنہا سلطنت ملکی کا قائم ہونا حیطۂ امکان میں آجاوے۔

پانچواں باب

بطلیموسیوں کی شہنشاہی

اسکندر اعظم کے مرنے پر کچھ دنوں شدت کی بدنظمی رہی۔ جب حالت کسی قدر (۱۴۹)
بہتر ہوئی تو سرکاری طور پر مشتہر کیا گیا کہ اسکندر مرا نہیں ہے بلکہ محض دنیا کی زندگی سے
رخصت حاصل کی ہے۔ اس خبر سے اتنا ضرور ہوا کہ مرنے کے بعد لوگوں نے اسکو
بری طرح یاد نہیں کیا اور جس دنیا کا اسنے قلب ماہیت کر دیا تھا اسمیں اسکا موجود
ہونا ایک طرح پر تسلیم ہوتا رہا۔ مگر یہ کسی واقعی صورت میں نہیں۔ شہنشاہی سکہ جہاں
کہیں مسکوک ہوا اسپر کچھ زمانے تک اسکندر کا چہرہ مثل زیوس ایمون دیوتا کے چہرے کے
نقش کیا گیا۔ لیکن کوئی شہنشاہی مذہب ایسا جاری نہیں ہوا جس سے لوگوں میں
یہ اعتقاد پھیلایا جاتا کہ اسکندر مرنے کے بعد اولیپیا کے دیوتاؤں میں جگہ رکھتا
ہے۔ یہ امر کہ اسکندر کے کام ایک بانی مذہب کے کاموں کیطرح جائز تصور کئے
گئے اسکے جانشینوں کی مرضی اور کوشش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ تاریخی واقعات نے آگے چلکر
ایسی شکل اختیار کی کہ اس خیال کو پختگی ہو گئی۔

اسکندر گو دیوتا بنکر انسانی قرابتوں سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ مگر اس کے
اقارب بہرکیف شاہی خاندان مقدونیہ کے لوگ تھے جن میں کچھ تو اس وقت
مقدونیہ میں تھے اور کچھ شاہی فوجوں میں جو اسوقت سلطنت کے مختلف مقامات
پر تھیں موجود تھے۔ کچھ لوگ خاص بابل میں تھے جہاں اسکندر کا انتقال ہوا تھا۔
ان عزیزوں نے جو بابل میں تھے کل قوم کی جانب سے سلطنت کا کاروبار اپنے
قبضے میں کر لیا اور اسکندر کے سوتیلے بھائی فلپ ارہی دیوس اور اسکندر کے (۱۵۰)
لڑکے کو جو ملکہ روشنک کے بطن سے پیدا ہونے والا تھا وارث سلطنت قرار دیکر
انکے ولی بنگئے۔ اور سلطنت کے مغربی حصوں سے جس ولایت کی حکومت کسی سپہ سالار
نے پسند کی اس سے انھوں نے اتفاق کر لیا۔

اسکندر نے اپنی زندگی میں فتوحات کے بڑے بڑے منصوبے باندھے تھے۔ مگر جو لوگ اسکی سلطنت کے منتظم بنے انھوں نے ان منصوبوں کو آگے نہ چلایا۔ اسکندر کے کاغذات سے دریافت ہوتا ہے کہ وہ فینیشیا۔ سریا۔ سیلیسیا۔ اور قبرس میں ایک ہزار جنگی جہاز تیار کرنیکا قصد رکھتا تھا تاکہ قرطاجنہ کے لوگوں سے اور بحر متوسط کے کنارے کنارے لبیہ اور آیبریا (اسپین) سے لیکر جزیرہ صقلیہ تک جسقدر قومیں آباد ہیں اُنسے مصروف جنگ ہو اور ایک سڑک سمندر کے کنارے کنارے علاقہ سایرینی سے لیکر منارہ ہرکیولیز (ہرقلس) تک بنوائے اور مناسب موقعوں پر جہازوں کیلئے قیام گاہ اور بندرگاہ تعمیر کرائے چھ بڑے عالیشان بت خانے سوا سینتالیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار کئے جاویں۔ اور کثرت سے مردوں اور عورتوں کی سکونت ایشیا سے یورپ میں اور یورپ سے ایشیا میں منتقل کیجاوے تاکہ باہمی ارتباط و ازدواج سے انمیں اور انکی اولاد میں محبت اور قرابت کے تعلقات پیدا ہوکر ایشیا اور یورپ میں ایک قریب کا واسطہ ہوجاوے۔ ایشیا و یورپ کو آمیز کرنیکا کام اسکندر نے خود ہی شروع کیا تھا اور سمجھا تھا کہ یہ کام ابھی ادھورا ہے۔ لیکن اس کے مرنے پر مقدونیہ والوں نے سمجھا کہ اس کام کیلئے جو کچھ کرنا تھا وہ سب ختم ہوچکا ہے۔ اب تو جو نئے ملک ہاتھ آئے ہیں اُنسے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

یہی خیال اراکین اسکندر میں بطلیموس پسر لاگوس کا بھی تھا۔ اسکا عقد ایران کی ایک شہزادی سے ہوا تھا لیکن اسکندر کے مرنے پر اسنے اس شہزادی سے قطع تعلق کرلیا اور ایتھنز کی مشہور حسینہ تھائیس کو جس سے پہلے سے تعلق چلا آتا تھا ساتھ لیکر مصر چلا آیا جہاں کی حکومت اُسکے سپرد ہوئی تھی۔ اس ملک میں (۱۵۱)
بطلیموس نے چالیس برس تک نہایت شان و شوکت و دبدبہ و دانشمندی سے سلطنت کی اور دو مقدونی شہزادیوں سے یکے بعد دیگرے عقد کرکے ایک خاندان شاہی کا مورث بنا جسمیں آخری ملکۂ مصر کلیوپترا کے علاوہ دس[1] بادشاہ

[1] اس تعداد میں بادشاہ یوپیتر۔ فلوپیتر اور الکزانڈر ثانی کو جو برائے نام تھوڑی مدت کیلئے بادشاہ ہوئے تھے

اور ہوئے جن میں ہر ایک کا نام بطلیموس ہوا۔ انھوں نے دو سو اکھتر برس حکومت کی مگر کل خاندان کا زمانہ حکومت فی بادشاہ ۲۲ برس سے کچھ زائد ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں بعض بادشاہوں نے حکومت سے معزول ہونیکے بعد پھر تخت حکومت حاصل کیا اور بعض موقعوں پر دو دو نے ملکر حکومت کی۔ (اوسط نکالنے میں ہر ایک کا زمانہ حکومت جوڑا گیا ہے) انہیں سے نو بادشاہ ایسے گذرے ہیں جنکا بادشاہ رہنے کی حالت میں انتقال ہوا۔ دنیا کی تاریخ میں غالباً کسی اور خاندان شاہی کی مثال ایسی نہیں ہے جسکے اتنے بادشاہوں نے اسقدر عرصہ تک سلطنت کی ہو۔

بطلیموس اوّل اور اسکی اولاد سے دس بادشاہوں کے حالات دریافت کرنے انسان کی بڑی بڑی اولوالعزمیوں اور سیاہ کاریوں کا ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ لیکن ان حالات کی تفصیل بے سود ہے کیونکہ جس ضخامت کی کتاب لکھنے کی اجازت ملی ہے وہ ختم ہو جائے گی اور مقصود اصلی حاصل نہو گا۔ اس بارے میں صرف اسقدر بتانا کافی ہوگا کہ ملوک بطالمہ کی تاریخ کے تین بڑے زمانے ہیں۔ پہلا زمانہ (۳۲۳ - ۲۰۲) ایک سو بیس برس کا چار بادشاہوں کا ایسا گذرا ہے جسمیں سلطنت کی حیثیت ایک شہنشاہی کی تھی یعنی مصر کے باہر کے بھی چند ملک اور علاقہ اسکے تخت میں تھے۔ اسکے بعد دوسرا زمانہ (۲۰۰ - ۸۰) بھی ایک سو بیس برس کی مدت کا تھا۔ مگر اسمیں سلطنت کا دائرہ زیادہ تر ملک مصر پر محدود رہا۔ اسی زمانہ میں مصر کے اصلی باشندوں نے یہ دیکھکر کہ بیرونی ممالک محروسہ میں بطالمہ کی قوت میں ضعف آچلا ہے اور غیر ملک والے جو مصر میں آباد ہیں انکے ملکی اور فوجی گروہوں میں سخت
نا اتفاقی ہے رفتہ رفتہ ایسے اختیارات حاصل کرنے شروع کیئے جن سے بادشاہوں (۱۵۲)
کے اقتدار میں فرق آیا۔ اسکے بعد تیسرا زمانہ پچاس برس کا وہ آیا جسمیں دولت روما کی سینات (مجلس سیاسی) نے نہیں بلکہ رومانی امرائے لشکر نے جنکو اختیارات شاہی حاصل ہو چلے تھے جسطرح چاہا مصر پر اپنی حکومت کا ڈنکا بجایا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ چھوڑ دیا ہے۔

مصر کا آخری بادشاہ بطلیموس جسنے (نے نوازی میں کمال حاصل کرکے) "شہنائی نواز" کا لقب اختیار کیا تھا علاوہ ولد الحرام ہونیکے عقل و ذہانت سے بھی محروم تھا۔ یہ بادشاہ اٹھائیس برس تک یعنی سنہ ۸۰ ق م سے سنہ ۵۲ ق م تک تختِ مصر پر متمکن رہا۔ اسراف سے خزانہ خالی کرکے رعایا کی نظروں میں خوار ہوا۔ اور جب موت سر پر پہنچی تو سوائے اسکے کچھ بن نہ پڑا کہ سترہ برس کی ایک نوجوان بیٹی کے سر پر اپنا زنگ خوردہ تاجِ شاہی رکھکر خود دنیا سے چلتا ہو۔

اس نوجوان شہزادی کا نام کلیوپترا (نازِ پدر) تھا جو کلیوپترا ہشتم کے لقب سے تاریخ میں بیان کیجاتی ہے۔ باپ کی تقدیر میں جسقدر حماقت و چاپلوسی اتری تھی اسیقدر بیٹی کو حسن خداداد کی دولت ملی تھی مگر زمانۂ شباب ہی سے اُسکو اسبات کی غیرت نہ رہی تھی کہ جہاں مطلب نکلتا ہو وہاں اپنی عفت و عصمت کو برباد کرنے اور اپنے حسن و لیاقت و شائستگی کو داغ لگانے سے پرہیز کرے۔ گو ہماری نظروں میں اس شہزادی کی کچھ عزت نہیں ہے کیونکہ اُس نے رومانی لشکر کشوں کی خوشنودی و خوشامد میں اپنی کسی چیز کو اپنا نہ رکھا مگر پھر بھی یہ ہی کہینگے کہ جو کچھ اُسنے کیا محض اس نیت و کوشش سے کیا کہ اپنے ملک کو روما کے غارتگروں سے بچالے اور مصر کی ملکہ ہوکر بجائے غلامی کا طوق گردن میں پڑنے کے اُس قیصر کی ملکہ بن جائے جو عنقریب ملک میں آنیوالا تھا۔ اور اپنے پائے تخت کو رومۃ الکبریٰ کے درجہ کا شہر بنادے جو اُسوقت بحر متوسط کے گرد جسقدر قومیں رہتی تھیں سب کا سرتاج تھا۔

یولیوس قیصر نے جسوقت مصر میں قدم رکھا ملکہ کلیوپترا سر سے پاؤں تک اُسکی ہوگئی۔ یولیوس سے ایک لڑکا بھی اُسکے ہاں پیدا ہوا۔ اور شوق یہانتک دامنگیر ہوا کہ جب یولیوس مصر سے چلا گیا تو اُسکی ملاقات کو روما گئی اور یہاں قیصر کے باغ میں ٹھیرو اُسکی خدمت میں حاضر رہا مگر یہی ڈر تا رہا کہ کہیں یہ آفتِ روزگار قیصر کی ملکہ نہ بن بیٹھے۔ اسی زمانے کی بعض تحریرات میں یولیوس کی نسبت بیان ہوا ہے کہ "وہ عالم آبادان کو مصیبت سے بچانے والا اور فائدہ پہنچانے والا تھا" اور اپنی عمر کے آخری سال میں اس کوشش میں سرگرم ہوا کہ

کسی طرح ایک رومانی شہنشاہی ایسی پیدا کرے جو کل دنیا پر محیط ہو اسکا قصد تھا کہ
جو علاقے اسوقت روما کے قبضہ میں نہیں ہیں انکو روما کی سلطنت میں شامل کرے
اور گیتی و سینتھیا اور پارتھیا کی قوموں کو مغلوب کرے۔ مگر جن ملکوں کی فتح کا (۱۵۳)
قصد تھا انمیں مصر کو شامل نہ رکھا۔ حالانکہ یہ ملک وہ تھا جسپر خود حکومت
کرنے کیلئے بیس برس تک کوشش کی تھی۔ مگر یہ کوشش اُسوقت کی تھی جبکہ ملکہ
کلیوپیترا سے اسکی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اب یہاں سوال یہ ہے اپنے قتل
ہونے سے کچھ پہلے جن ملکوں کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا ان میں مصر کیوں شامل
نہ تھا۔ میرے نزدیک اسکی وجہ غالبًا یہ تھی کہ مصر کے معاملہ کو اُسنے ملکہ کلیوپیترا
کی رائے پر چھوڑ دیا تھا اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس معاملہ میں کلیوپیترا جو کچھ
فیصلہ کریگی وہ ہی اسکا فیصلہ بھی ہوگا۔

لیکن اسکے دس برس بعد جو عجیب وغریب منظر مصر میں پیش آیا وہ بیان
کرنے کے قابل ہے۔ ایک نہایت پُرتکلف دربار میں چاندی کے فرش پر سونے کے
دو تخت بچھے ہیں۔ ایک تخت پر انتونی (سپہ سالار روما) دائیونیسوس دیوتا کے
لباس میں اور دوسرے تخت پر کلیوپیترا وینس دیبی کے لباس میں جلوہ گر ہے
انکے قدموں کے پاس سیزیرون یعنی کلیوپیترا کا لڑکا جو یولیوس قیصر سے تھا اور
اسکے قریب ہی کلیوپیترا کا سب سے بڑا لڑکا الکزانڈر جو انتونی سے تھا بیٹھے ہیں۔
الکزانڈر ایرانی لباس پہنے اور سر پر شاہان ایران کا تاج رکھے ہے۔ ان
دونوں شہزادوں سے نیچے الکزانڈر کی بہن کلیوپیترا اسیلینی جو الکزانڈر کے
ساتھ توام پیدا ہوئی تھی اور اسکے پاس ہی اسکا چھوٹا بھائی فلادلفیوس
شاہان مقدونیہ کا سا لباس اور تاج پہنے رونق بزم ہیں اس جشن وجلوس
عجیب کا مطلب خود انتونی نے اسطرح بیان کیا کہ اس کے حکم سے کلیوپیترا ملکۂ
مصر و قبرس و کیلی سریا تو گویا "ملکاؤں کی ملکہ" ہے اور اسکا لڑکا سیزرون "بادشاہوں کا
بادشاہ" بنایا گیا ہے۔ اور الکزانڈر ملک آرمینیہ اور ان علاقوں کا فرمانروا
قرار پایا ہے جو دریائے فرات اور ہندوستان کے درمیان واقع ہیں اور (۱۵۴)
شہزادی کلیوپیترا اسیلینی افریقہ کے علاقہ لیبیہ و سائرینی کی ملکہ مقرر کیگئی ہے۔

غرض اس جشن کے معنی یہ تھے کہ آج انتونی خاندان بطلیموس کو وہ تمام ملک پھر واپس دے رہا ہے جو بطلیموسیوں کی سلطنت میں پہلے کبھی شامل رہ چکے تھے اور موقع جشن پر انتونی کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ ایطالیہ کا بادشاہ گویا وہ خود ہے۔ اگر انتونی سپہ سالار روما جسکو کلیوپترا نے اپنے دام الفت میں گرفتار کیا تھا اس قابل رہتا کہ ایطالیہ میں اپنے اقتدار کو قائم رکھ سکتا تو کچھ شبہ نہ تھا کہ کلیوپترا اپنے اس دعوی کو کہ ایک دن روما کے قصر کیپیتول میں بیٹھکر جہاں بانی کریگی صحیح ثابت کر دیتی۔ لیکن انتونی ایکٹیم کے معرکہ پر گیا اور وہاں سخت شکست کھائی اور رومانی سپہ دار اگستوس (اوکٹے ویان) مصر پر اسطرح چڑھ آیا جیسے کسی زمانہ میں یولیسز کانوں میں روئی بھر کر گمراہ کرنیوالوں کے ساحل پر وارد ہوا تھا۔

پاسکل لکھتا ہے کہ "اگر کلیوپترا کی ناک کسیقدر اور چھوٹی ہوتی تو دنیا کا چہرہ بدل جاتا۔" مگر پاسکل نے یہ فقرہ ایک فلسفی کی طرح کہدیا ہے۔ شاید اسکو معلوم نہ تھا کہ کلیوپترا کی ناک چھوٹی نہیں بلکہ ابھروال اور خوبصورت تھی اور اسکا علم تو اسکو یقینی نہ تھا کہ کلیوپترا کی موت سے ملک مصر کی ترکیب سیاسی میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ بلکہ ایک طرح پر یہ سمجھنا چاہیے کہ اگستوس جسنے انتونی کو ہزیمت دی اور جو انتونی اور کلیوپترا دونوں کی موت کا باعث ہوا درحقیقت کلیوپترا کی پالسی کا تعمیل کرنیوالا تھا۔ کیونکہ جسوقت اُسنے رومانی شہنشاہی کا جدید انتظام ختم کرلیا تو سیاسی حالات نے وہ شکل اختیار کی جسکی نسبت موسن نے خوب لکھا ہے کہ "جسقدر یہ دعوے صحیح ہے کہ جمہور روما کا سردار وادی نیل پر حکومت کرتا تھا اُسیقدر یہ دعوی بھی درست ہے کہ شاہان مصر روما پر حکومت کرتے تھے"۔

بہرکیف یہ جو کچھ بھی ہو مگر ایک عورت کے حسن و جمال کا افسوں بطالسہ کی گئی گزری شان و شکوہ کو پھر زندہ نہ کر سکا۔ کیونکہ جسوقت ہم حکومت مصر کے دور ثانی پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکومت ایک قدرتی انحطاط کے بعد موت کو پہنچی اور اسکی ترکیب میں پہلے ہی سے ایسی خرابیاں مضمر تھیں جنھوں نے رفتہ رفتہ اسکا کام تمام کردیا گویا پیدائش ہی سے ایسے امراض چمٹے ہوئے تھے جو لاعلاج تھے۔ (۱۵۵)

مگر باوجود اسکے اپنی زندگی کی پہلی حد ہی میں اُسنے بڑا جاہ و حشم دکھایا۔ اور جب اسکے فرمانروائے ثانی بطلیموس فلادلفیوس کا زمانہ (۲۸۵-۲۴۶) آیا تو اسکندریہ کا شہر پرانی دنیا کا لندن ہوگیا۔ اسکندریہ سے مغرب میں صرف قرطاجنہ کا شہر افریقہ میں ایسا تھا جو تجارت و حرفت میں اسکا حریف مقابل کہا جاسکتا تھا۔ سلطنت بطلیموسی کا بہترین زمانہ افریقہ کی سلطنت قرطاجنہ کے دور سے مطابق ہوتا ہے اور تاریخ عالم میں افریقہ کیلئے یہ ہی ایک زمانہ ایسا آیا تھا جسمیں وہ دولت و تمول جہازی طاقت و اولوالعزمی میں اور علوم و فنون و سامانِ معاشرت اور ہر قسم کے کاروبار تجارت میں سب سے بازی لے گیا تھا۔ اور جب آزمائش کا وقت آیا تو سیاسی اثر و اقبالمندی میں بھی سب سے آگے رہا۔ قرطاجنہ کے قارون وقت تاجروں اور اسکندریہ کے دانشمند و مطلق العنان بادشاہوں نے بحر متوسط کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا صقلیہ سے مشرق میں اس سمندر کا جسقدر حصہ پڑتا تھا وہ قرطاجنہ والوں کے قبضہ میں تھا۔ کسی غیر ملک والے کی ہمت نہ تھی کہ اپنا جہاز سمندر کے اس حصہ میں لے آئے اور اگر کسی نے ایسا کیا تو پھر وہ اپنی سلامتی کا خود ہی ذمہ دار ہوتا تھا۔ اسیطرح علاقہ سائرینی سے لیکر جزیرہ کورسائرا تک جسقدر بڑے بڑے بندرگاہ بحر متوسط کے اس حصہ میں پڑتے تھے اسپر شاہان بطلیموس قابض رہنا چاہتے تھے مصر کے شمالی ساحل اور یونان و مقدونیہ کے مابین جسقدر سمندر پڑتا تھا اور جن ساحلوں تک یہ سمندر پہنچتا تھا اور جو جزیرے اس میں پڑتے تھے وہ سب دولت بطلیموسی کی خارجی پالسی کا مضمون تھے۔

بطلیموسیوں کے خاندان کا بانی ایک بڑا مرد آزمودہ کار تھا جسکے مزاج میں غایت درجہ احتیاط تھی۔ بار بار خشکی کی لڑائیوں سے مصلحت وقت سمجھکر اپنی سرحد کو لوٹ آیا۔ اور اپنے ہی ملک یعنی مصر کی سرحدوں پر بھروسا کیا جہاں مدافعت کا سامان خود قدرت نے پیدا کر رکھا تھا۔ کارزار بحری میں اسکو چنداں دستگاہ نہ تھی پھر بھی کئی مرتبہ امیر البحر بنکر معرکہ آرائی کی۔ اور تین بڑی بڑی لڑائیوں میں جو سنہ ۳۰۸-۳۰۶ و سنہ ۲۹۵-۲۹۴ و سنہ ۲۸۸-۲۸۷ ق م میں پیش آئیں فتوحات حاصل کیں۔ اور مصر سے باہر جس قدر ممالک بطلیموسیوں کے مقبوضات سے آیندہ

تصور کیئے گئے وہ ان ہی معرکوں میں فتحیابی سے حاصل ہوئے تھے ۔ یہ تمام مقبوضہ ممالک اُسکے فرزند فلاد لفیوس کو ورثہ میں ملے جسکی طبیعت کو جنگ و پیکار سے زیادہ مناسبت نہ تھی ۔ ہرکیف خاندان بطلیموسی کا مورث اعلیٰ اور بطلیموسی شہنشاہی کا پیدا کرنیوالا ایک ہی شخص یعنی بطلیموس اوّل تھا ۔

فلادلفیوس بطالمہ میں اپنے وقت کا نہایت جلیل القدر بادشاہ تھا ۔ صقلیہ کے ایک شاعر کو جسکا نام تھیوکرائیٹس تھا جس وقت تلاش ہوئی کہ کسی کو اپنا مربی و سرپرست بنائے تو وہ اسکندریہ میں آیا اور فلادلفیوس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جسکے چند اشعار کا مضمون حسب ذیل تھا ۔

"تین سو شہر ۔ نہیں نہیں ۔ تین ہزار ۔ بلکہ تین لاکھ شہر اس بادشاہ نے اپنی آنکھوں بنتے دیکھے ہیں ۔ اور انہی شہروں پر وہ حکومت کرتا ہے ۔ بطلیموس ۔ (فلادلفیوس) سرداروں کا سردار ہے ۔ نصف فنیشیا ۔ نصف عرب ۔ شام ۔ لیبیا اور حبش کا مالک ہے ۔ پمفائلیا اور سلیسیہ کے بادشاہوں پر حکم چلاتا ہے لائشیہ اور کاریا اور اور بہت سے جزیروں کے لوگوں کو لڑائی کے فن کیں اُسنے یگانۂ روزگار بنادیا ہے ۔ جیسا بیڑا جہازوں کا اسکے پاس ہے سمندر نے کبھی ایسا بیڑا اپنی سطح پر چلتے نہیں دیکھا ۔ زمین اور سمندر اور دریا سب بادشاہ بطلیموس کا خیر مقدم کرتے ہیں "۔

ان اشعار کا موضوع یعنی فلادلفیوس اسی زمانہ میں (۲۷۲) علاقۂ سائرینی میں اپنے بھائی سے اور ایشیا میں ایک زبردست حریف سے ایک لڑائی جیت چکا تھا ۔ اُسکا جنگی بیڑا نہایت زبردست تھا جسنے اسکے کل زمانہ بادشاہی میں سوائے چار برس کے اور کبھی (۲۵۳-۲۴۹ ق م) سمندر سے اپنا قبضہ اٹھنے نہ دیا ۔ لیکن باوجود اسکے فلادلفیوس لڑنے والا بادشاہ نہ تھا ۔ تمام عمر کسی لشکر یا بیڑے کو بذات خود لڑائی پر نہیں لے گیا ۔ قیصر آگستوس کی طرح جس سے فلادلفیوس کا اکثر مقابلہ کیا جاتا ہے اُسنے بھی ایسے کمزور قوا پائے تھے کہ لڑائی کی زحمتوں و صعوبتوں کی برداشت نہ کرسکتا تھا ۔ لیکن نہایت عاقل و زیرک تھا ۔ تعلیم و تربیت نے اسکے ذہن کو اور بھی روشن کردیا تھا ۔ روما کے شہنشاہ ہیدریان کی طرح اسکو نادر اشیاء فراہم کرنیکا (۱۵۷)

بے حد شوق تھا۔ کوئی نئی کتاب یا پرانی تصویر یا کوئی عجیب جانور۔ یا لکار آمد ایجاد دیکھتے ہی اسکو حاصل کرنے کیلئے بیقرار ہو جاتا تھا۔ غالباً یہ ہی عجائب پرستی دیکھکر ایک عجیب شہزادی نے جو اسکی حقیقی بہن تھی اسکی عیش پسند طبیعت کو اپنی طرف مائل کرلیا۔ اور یہ شہزادی اسکی بیوی بنگئی۔ سگے بہن بھائی میں عقد ہونا اسوقت مصر میں ایک عام بات تھی۔ یہ شہزادی فلادلفیوس کی ملکہ بننے کے بعد چھ برس زندہ رہی (۲۷۵ - ۲۷۰) عقد کے وقت اسکی عمر چالیس برس سے اور شوہر کی عمر ۳۲ برس سے زائد نہ تھی۔ معاملات ملکی میں بادشاہ نے اِس ملکہ کی تدبیر کو ہمیشہ پسند کیا تھا اور جب وہ مرگئی تو برسوں اسکو محبت سے یاد کیا (چنانچہ اسکا ثبوت بادشاہ کے لقب فلادلفیوس سے بھی ملتا ہے جسکے معنی محب خواہر کے ہیں)

جب یہ شہزادی ملکہ ہوگئی تو بادشاہ نے اسکو ایک دیبی قرار دیا تاکہ اسکے اعمال زندگی پر کوئی حرف گیر نہو۔ جب بیوی دیبی ہوگئی تو شوہر کو بھی دیوتا بننا پڑا۔ چنانچہ اسکندر اعظم کے بعد مصر کا سب سے پہلا خود ساختہ دیوتا یہ ہی بادشاہ گذرا ہے۔

فلادلفیوس فطرتاً عیش پرست تھا۔ دار الحکومت اسکندریہ میں جسقدر سامان ہوائے نفسانی کے بجھانے کے لیئے فراہم کرنے ممکن تھے فراہم کیئے۔ بیوی کے مرنے پر جو حقیقی بہن تھی حرموں کا ایک غول ساتھ کرلیا۔ اِن عورتوں کو عالیشان مکانات اور بازیوں میں دوڑنے کے گھوڑے دیئے۔ انکی شکل کے بت ایسے لباس میں جسکو دیکھنے سے شرم آئے شارع عام پر جابجا نصب کیئے۔ ان میں سے بعض حرموں کو دیبیاں بننے کی بھی عزت بخشی گئی۔ اسکندریہ کے شہر کو نہایت پر رونق کردیا۔ نئے نئے محلے اور کوچے۔ بڑی بڑی سرکاری عمارتیں خاص دار الحکومت (۱۵۸ اور سلطنت کے اور بڑے بڑے شہروں میں تیار کرائیں۔ علوم و فنون کی ترقی کیلیئے بڑے بڑے وظائف مقرر کیئے۔ درسگاہ میوزیم کے نادر ذخیروں اور کتب خانہ کی بے مثل کتابوں کی شہرت اور میلوں اور تہواروں کی کثرت اور بادشاہ وقت کی دریادلی اور قدر دانی کا شہرہ سنکر جو اسکندریہ کو ایتھنز کے رتبہ کو پہنچانا چاہتا تھا بڑے بڑے عالم و ادیب اور ماہران موسیقی اسکندریہ میں جمع ہونے لگے۔

لیکن باوجود ان نعمتوں کے فلادلفیوس جیسے تجربہ کار بادشاہ کی زندگی بھی بے اطمینان اور طبیعت ناساز رہنے لگی۔ طبیبوں کو چھوڑ کر جاہل علاج کرنے والوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تکلیف اور موت کا خوف ہر وقت دل میں رہنے لگا اور ایسی دوائیاں کھانی شروع کیں جنکی نسبت کہا جاتا تھا کہ وہ موت کو نہ آنے دینگی۔ تعجب ہے کہ دیوتا بن جانے کے بعد بھی زندگی دوام کیلئے معجونوں کی ضرورت پڑی۔ بہرکیف مرض نقرس کی تکلیف نے ایسا عاجز کیا کہ غریب کسانوں کی زندگی پر رشک آنے لگا۔ ایک دن محل کی کھڑکی سے دیکھا کہ چند غریب کسان دھوپ میں ریت پر بیٹھے اپنا سوکھا ٹکڑا مزے لے لیکر کھا رہے ہیں۔ انکی اس خوش حالت کو دیکھکر بے اختیار کہنے لگا کہ "اے مفلس غریبو۔ کاش میں بھی تم ہی میں سے ہوتا۔"

فلادلفیوس کا مشہور مخالف اینٹی گونس مقدونی ایک جگہ لکھتا ہے کہ "فلادلفیوس اپنے محل کے زرنگار پردوں کے پیچھے بیٹھا بڑی مشاقی اور ہوشیاری سے حکومت و حکمت کی چالیں چلا کرتا تھا۔ دریائے گنگا سے لیکر دریائے ٹائبر تک جسقدر ملک پڑتے ہیں انکے دارالخلافوں میں اس بادشاہ کے ایلچی اور گماشتے اشرفیوں کی تھیلیاں اور قیمتی تحائف لیئے حاضر رہتے تھے۔ "تھیوکراٹیس لکھتا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں اور بڑی بڑی ریاستوں کو بادشاہ مصر سے روپیہ پہنچتا رہتا تھا۔ مگر اسکے ساتھ ہی یہ انتظام بھی تھا کہ اسکندریہ کے بندرگاہ میں کثرت سے جنگی جہاز ہر وقت لڑائی کیلیئے تیار کھڑے رہیں تا کہ صرف تدبیریں سوچنے ہی کی قوت نہیں بلکہ انپر عمل کرنیکی قدرت بھی لوگوں پر ظاہر ہوتی رہے۔ اور جو لوگ روپیہ لیکر اپنا کام شروع کریں انکو مدد پہنچانے میں کبھی کسی طرح کا التوا نہو۔

اس طرح بادشاہوں اور حاکموں کا منہ بھر کر فلادلفیوس نے تمام وہ راستے کھلوائے رکھے جو خشکی اور تری سے گذر کر اسکندریہ کو آتے تھے۔ مصری مقبوضات کے ایک کم عرض اور طولانی قطعہ کی وجہ سے جو سلاطین سلوقیہ کی وسیع ایشیائی سلطنت
اور بحر شام میں حائل تھا اس سلطنت کا گذر سمندر پر نہ ہونے دیا۔ (۱۵۹)

اور یونان کو مقدونیہ کے بادشاہوں سے جو اسوقت یونان کے مالک تھے ایسا برگشتہ و باغی بنائے رکھا کہ مصر کو مقدونیہ اور یونان کی طرف سے بھی

کوئی خطرہ نہ رہا۔

فلادلفیوس نے اپنے باپ سے جسقدر سلطنت پائی تھی اسمیں آیونیا کا علاقہ فتح کرکے شامل کیا اور یہ توسیع اسوقت عمل میں آئی جبکہ یومنیز اوّل بادشاہ برگامم سلوقیہ کی اطاعت سے منحرف ہوگیا اور اسکی قوت ایشیاء کوچک سے بالکل زائل ہوگئی (۲۶۳-۲۶۱ ق م)۔ جو نفع فلادلفیوس کو اسطرح حاصل ہوا تھا وہ اسوقت ہاتھ سے جاتا رہا جبکہ اسکے "لڑکے" نے ایفی سوس و لقع لائدیا میں ہنگامہ برپا کرکے ایک ملکی انقلاب پیدا کیا۔ (۲۵۹-۲۵۵ ق م) اسکے بعد جب فلادلفیوس نے مقدونیہ اور سوریہ (شام) کی متحدہ قوتوں سے لڑائی شروع کی تو ایشیا میں اور زیادہ نقصانات اوٹھانے پڑے۔ لیکن اسکے لڑکے یورگیتس نے تخت نشین ہونے پر ان نقصانات کی بہت جلد تلافی کردی۔ (۲۴۶-۲۴۲)۔ آیونیا اور درداینال میں بھی جدید علاقے حاصل کئیے۔ اور یہ جملہ مقبوضات بیس برس تک یعنی جب تک موت آئے یورگیتس ہی کے قبضہ میں رہے۔ لیکن سمندر پر فلادلفیوس نے اپنے باپ کی سی ہمت و الوالعزمی نہیں دکھائی۔ جسوقت ۲۵۳ ق م میں مقام کوس پر انٹی گونس مقدونی نے فلادلفیوس کو شکست دیدی تو پھر بحر ایجین سے اسکا قبضہ اٹھگیا۔ مگر اس شکست کے بعد وہ ایک دن بھی چین سے نہ بیٹھا۔ اور چار برس نہ گذرنے پائے دیکھے کہ پھر ایجین پر لڑکر قبضہ کرلیا۔ اور جزیروں کی ریاستیں جو اپنا ایک لیگ بناکر اس لڑائی کا سبب ہوئی تھیں وہ سب فلادلفیوس کے افسرانِ بحری کے تابع ہوگئیں۔ مگر انٹی گونس بڑا آزمودہ کار سپہ سالار تھا۔ ۲۴۲ ق م میں فلادلفیوس کے لڑکے یورگیتس کو ایسی سخت شکست دی کہ اسنے مجبور ہوکر جزائر سائکلیڈیز
سے ہاتھ اٹھایا۔ اس شکست کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورگیتس پسر فلادلفیوس نے اپنے (۱۶۰)
بحری سامان جنگ میں تخفیف کردی۔ کیونکہ سہ درجہ جنگی جہازوں کے بنانے اور انکو لڑائی کیلئیے ہر وقت تیار رکھنے میں روپیہ زیادہ صرف ہوتا تھا اور فائدہ بہت کم تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں سب کو انکی ایک مثال بھی نظر آچکی تھی۔ قرطاجنہ کی سلطنت نے بڑے صرف کثیر سے جہاز بناکر لڑائی کیلئیے تیار کئیے تھے۔ اور رومانیوں سے انکا پہلا معرکہ اسی زمانہ میں ختم ہوا تھا لیکن اس معرکہ میں ثابت ہوا کہ

قرطاجنہ والے رومانی بیڑے کی تاب نہیں لا سکتے۔ پس قرطاجنہ اور مصر دونوں نے اپنے اپنے بحری سامان میں کمی کر دی جس سے بحر متوسط میں وہ اپنے اپنے مقبوضات سے دشمن کو دور رکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ تخفیف دونوں کے حق میں ایک غلطی تھی۔ کیونکہ تیسری صدی قبل مسیح کے آخر میں جس وقت مقدونیہ اور سوریہ کی حکومتیں جو مصر کی مدت سے جانی دشمن تھیں اس قابل ہو گئیں کہ ملکہ مصر کا مقابلہ کر سکیں تو پھر بطلیموسیوں کی شہنشاہی جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ مگر اسکی داد کہ اس نازک وقت میں بطلیموسی خاندان کو مٹنے نہ دیا روما کی سلطنت کو ملنی چاہیئے۔

شروع کے بطلیموسی بادشاہوں نے مصر سے باہر ملکوں پر قبضہ رکھنے کیلیئے جسقدر کوشش کی اسکے چند در چند اسباب تھے۔ پہلا قدرتی سبب تو ظاہر ہے یہ ہی تھا کہ "ازان من است" کہنے کا فخر ہاتھ سے نہ جائے۔ چنانچہ درباری شاعر کیلی مکوس نے فلادلفیوس کی ملکہ ارسینوی کے مرثیہ میں وسعت سلطنت کے مضمون کو اسطرح ظاہر کیا ہے کہ "ملکہ کے مرنے کی جانکاہ خبر ایک مقام سے دوسرے مقام پر اور دوسرے مقام سے تیسرے مقام پر شعلۂ جوالہ کی طرح چمکتی و تڑپتی جزیروں جزیروں سلطنت کی انتہائی حد یعنی شہر لنتوس تک پہنچی۔" غیرت قومی انسان کی کوشش اور کاوش عمل کا بڑا قوی سبب ہوا کرتی ہے۔ یہ غیرت بسا اوقات اس خوف سے حرکت میں آتی ہے کہ اپنی کوئی چیز غیر کے قبضہ میں نہ چلی جاوے۔ کسی نئی چیز کے حاصل کرنے کیلیئے اس غیرت کو کم حرکت ہوتی ہے۔ پس شروع کے دو بطلیموسی (۱۶۱)
بادشاہوں نے جنکو تدبیر مملکت میں غایت درجہ دستگاہ تھی جن وجوہ سے بیرونی علاقوں پر قبضہ کر کے ملک مصر کے گرد اپنی قوت و سطوت کی ایک دیوار کھینچنی چاہی تھی ان وجوہ کو نہایت غور و تجسس سے دریافت کرنا چاہیئے۔

مورخ پولی بیوس نے جو وجوہ اسکی بیان کی ہیں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ بطلیموسیوں کو سوریہ اور ایشیائے کوچک اور تھریس و مقدونیہ کے بادشاہوں کی نقل و حرکت اور لڑائیوں کا اندیشہ رہتا تھا۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ بحر متوسط کے مشرقی حصہ کے جسقدر بڑے بڑے شہر یا مقامات یا بندرگاہ تھے انپر بطلیموسی

اپنا قبضہ کیئے ہوئے تھے۔ پولی بیوس کے اِس خیال کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں کہ
اِن بادشاہوں کی نیت میں خلل ضرور تھا۔ اسمیں بھی کلام نہیں کہ یہ بادشاہ سازش
و تدبیر یا غضب کا ملکہ رکھتے تھے۔ لیکن پولی بیوس ایک ایسے ضلع میں رہتا تھا
جو مصر سے دور تھا مگر اُن مقامات سے قریب تھا جو مصری فوجوں یا مصری بیڑوں
کے قیام سے متاثر ہو رہے تھے۔ پس اُسکو مصر کی خارجی پالسی کا اندازہ انہی
مقامات کے تعلق سے کرنا پڑا اور اِسلئے زیادہ کوئی اور چیز اسکو اپنی طرف متوجہ
نہ کر سکی۔ آجکل کے مورخ بھی اس مضمون میں محض اقتصادی حالات پہ توجہ کر کے
ایک ہی بات کہے ہو رہتے ہیں۔ انکا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ بطلیموسیوں کیلیئے
بحری طاقت کا بڑھانا اور ایشیا اور یورپ میں جن مقامات پر اسکندریہ کی ترقی
تجارت کیواسطے قبضہ کر چکے تھے اُن پر قبضہ قائم رکھنا ضروریات سے تھا۔
بطلیموس اوّل نے جو روشنی کا منارہ دھانۂ نیل کے قریب آٹھ سو ٹیلنٹ یعنی
تقریباً ۲۵ لاکھ روپیہ کی لاگت کا بنوایا تھا وہ دنیا کے ہفت عجائبات ہی میں نہ تھا
بلکہ وہ تمام تجارتی جہازوں اور کشتیوں کے حق میں جو ماتحت ریاستوں سے (۱۶۲)
مال بھر کر یا خالی آتی تھیں خیر و سلامتی کا پیغام دینے والا تھا۔ کہ وہ اسکندریہ میں
آئیں اور اسکے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں یا مصر کے کھیتوں کا غلّہ یا عرب
و ہند و ارض سومالی و حبشہ کا تجارتی مال بھر کر جو دریائے نیل کے راستہ سے
آتا تھا یونان کے صرف کیلیئے لیجائیں۔ یہ روشنی کا منارہ ایک علامت تھی جسکے
معنی تھے کہ سمندر اوس پار کے مصری مقبوضات اسکندریہ کی ترقی تجارت میں
جاہے خود انسے تجارت کی ابتدا نہ ہوئی ہو ہمیشہ مساعد رہینگے۔ اور فی الواقع
اگر غور کیجیئے تو تجارت کی ترقی کا ثبوت اس سے اور بھی ملتا ہے کہ سو برس کے
عرصہ میں اسکندریہ کے شہر کی آبادی بڑھتے بڑھتے دس لاکھ تک پہنچگئی۔
لیکن اِن اقتصادی مورخوں نے بھی وہ ہی غلطی کی ہے جو پولی بیوس
نے کی تھی۔ پولی بیوس نے تو بطلیموسی شہنشاہی کے قائم ہونے کا سبب دول خارجہ
کی طرف سے زیادتی کا خطرہ رفع کرنا قرار دیا تھا اور اقتصادی مورخوں نے
اسکا اصلی سبب ترقی تجارت قرار دیا۔ لیکن شہنشاہی قائم کرنیکا ایک بڑا سبب

یہ بھی تھا کہ ملک مصر کی اندرونی حالت اصلاح پر رہے۔ ہم کو اس سبب پر بھی
پورا غور کرنا چاہیئے۔

بطلیموس اول کو اسکندر کی موت پر اسبات کی عزت ملی کہ وہ فراعنہ
مصر کے تخت پر بیٹھے۔ بطلیموس نے اہل مصر سے اطاعت کی توقع محض اِس
استحقاق پر رکھی کہ وہ فاتح ہے اور اہل مصر مفتوح۔ لیکن اہل مصر نے اپنی اطاعت
کو کسی ایسے استحقاق پر مبنی نہ سمجھا۔ بلکہ ہم کو یقین کر لینا چاہیئے کہ جسطرح انھوں نے
اسکندر کی نسبت یہ قصہ ایجاد کر لیا تھا کہ وہ حقیقت میں فیلقوس کا بیٹا نہ تھا بلکہ
خاص ملک مصر کے آخری فرعون نکتانیبوس کا بیٹا وہی اولیمپیاس کے بطن سے تھا
یا یہ کہ وہ مصر کے سب سے بڑے دیوتا امون کا فرزند تھا جس نے اسکندر کو
پیدا کرنے کیلئے نکتانیبوس کا قالب اختیار کیا تھا یا جیسے آیندہ زمانہ میں انھوں
نے یولیوس قیصر اور انتونی کی نسبت یہ قصہ بنا لیا تھا کہ یہ دونوں انسان کے (۱۶۳)
روپ میں امون دیوتا تھے تاکہ جو حرام کی اولاد ان دونوں سے کلیوپترا کے
ہاں پیدا ہوئی تھی وہ صحیح النسب فرعونوں میں شمار ہو سکے۔ اسی طرح انھوں نے
بطلیموسیوں کی نسبت بھی ایک قیاس قائم کر رکھا تھا۔ اور یہ قیاس وہی تھا جسکے
ذریعہ سے وہ ہزارہا برس سے اسبات کے عادی چلے آتے تھے کہ فرعونوں کے سلسلہ
نسب میں جہاں کہیں کوئی کڑی نہ ملے تو فوراً جوڑ لگا دیں۔

ایسا جوڑ لگانا اہل مصر کیلئے ضروری تھا۔ کیونکہ انکے اعتقاد میں جسقدر دیوتا
تھے وہ کسی زمانہ میں اسی دنیا میں آباد تھے۔ لیکن جسوقت یہ دیوتا اس دنیا سے
اٹھکر آسمان کو یا تحت الثرٰی کو جانے لگے تاکہ اپنے اپنے مقام کو پہنچ جائیں تو
اپنے گروہ سے ایک دیوتا کو دنیا میں چھوڑتے گئے تاکہ وہ دنیا پر حکومت کرتا رہے
ظاہر ہے کہ "دنیا" سے انکا مطلب ملک مصر تھا۔ غرض اسی دیوتا سے جو دنیا
پر حکومت کرنے کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا مصر کے کل فرعونوں کا سلسلۂ نسب چلا۔
اور چونکہ تمام دیوتاؤں میں صرف فرعون مصر ہی وہ دیوتا تھا جو زمین پر سکونت
رکھتا تھا اسلیئے وہ آکاش و دھرتی کے دیوتاؤں اور دیبیوں میں اور انسان میں
ایک واسطہ قرار پایا۔ پس فرعون اپنی رعایا کا دیوتا بھی تھا اور بادشاہ بھی۔

اور انکا سب سے بڑا کاہن بھی وہ ہی تھا۔ مصر کی کل زمین اور مصر کے تمام لوگ اسی کا مال تھے۔ اہل مصر سمجھتے تھے کہ اگر فرعون زمین پر موجود نہ رہا۔ یا اس کا انتظام کرنا اسنے چھوڑ دیا تو کل زمین خراب اور شورہ زار ہو جائیگی۔ زن و مرد اور بچے سب ہلاک ہو جاوینگے۔ اسلیئے مصر کیلیئے ضروری تھا کہ ایک صحیح النسب فرعون جسکا سلسلہ دیوتاؤں سے چلا آتا ہو اسپر مسلط ہو۔ پس جسطرح اسکندر کو ایمون کا فرزند قرار دینا اسکے لیئے آسان ہوا تھا ایسا ہی بطلیموس کو بھی ایمون کا فرزند قرار دینا آسان ہو گیا۔ لیکن اسکے لیئے کیا خاص رسوم عمل میں آئیں اسکا کسی کو علم نہیں۔

بطلیموس جسوقت مصر میں پہنچا ہے تو دیکھا کہ علاوہ مصریوں کی ریاست کے ملک مصر میں دو اور ریاستیں بھی ہیں۔ انمیں ایک تو شہر نوکریتیس کی پرانی یونانی ریاست ہے اور دوسری شہر اسکندریہ کی ریاست ہے جو نئی قائم ہوئی تھی۔ ایک تیسری شہری ریاست اسوقت قائم ہوئی جبکہ خود بطلیموس نے تلمائیس کا شہر آباد کیا جسکو جنوبی مصر سے وہی نسبت تھی جو اسکندریہ کو شمالی مصر سے تھی۔ مصر کا یہ حصہ یونانیوں کے سود و مفاد کا اصلی مرکز تھا۔ جسوقت بطلیموس نے اپنے خاندان کیلیئے مصر سے باہر کے ملکوں پر حکومت قائم کی تو ان تین ریاستوں کے علاوہ اور بہت سی یونانی ریاستیں بحر متوسط کے کنارے یا اسکے جزیروں میں قائم کیں۔ ان تمام ریاستوں کی بہتری اسی میں تھی کہ مذہبی پرستش کی مضبوط گرہ سے اپنا واسطہ بطلیموس کے ساتھ مستحکم کرلیں۔ چونکہ بطلیموس کا لقب سوتر یعنی پناہ دینے والا تھا اسلیئے اسکا شمار ان دیوتاؤں میں ہونے لگا جن کو اکثر یونانی ریاستیں مانتی تھیں۔ اسکا مجھکو کامل یقین ہے کہ شہر اسکندریہ میں اسکے بانی اسکندر اعظم کو دیوتائی کی عزت شروع ہی میں مل چکی تھی۔ اور اسکندر کے مرنے کے بعد جسطرح ہر دیوتا کا ایک کاہن ہوتا تھا اسیطرح اسکندر کی پرستش کرنے کیلیئے بھی ایک کاہن ہر سال مقرر کیا جاتا تھا۔ بلکہ اسکندر کی زندگی ہی میں جسوقت سے وہ دیوتا قرار پایا تھا اسکندریہ کے لوگ اسکا ایک کاہن اسطرح مقرر کیا کرتے تھے جیسے زیوس یا اپولو کا کاہن مقرر کیا جاتا تھا۔ بہرکیف

(۱۶۴)

۳۱۱ء اور ۲۸۹ء ق م کے درمیان کسی سال میں غالباً ۳۰۶ ق م میں جب بطلیموس
اول نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تو اُسنے اسکندریہ کی یونانی ریاست کا کل انتظام
اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اُسوقت سے اسکندریہ کے دیوتا اسکندر کا کاہن وہ خود مقرر
کرنے لگا۔ اور اسطرح اسکندر اعظم کو ایک "شہنشاہی دیوتا" بنا دیا گیا۔ بطلیموس
کے فرزند فلادلفیوس نے ۲۸۳ء ق م میں جسوقت اپنے متوفی ماں باپ کو جن کا
شمار "رکشک دیوتاؤں" میں ہوا انفاسرکاری طور پر دیوتا بنا دیا تو اسوقت
اونکی پرستش کو اُس طریقہ میں اضافہ نہ کیا جو شہنشاہی دیوتا اسکندر کے پوجنے کو
قائم ہوا تھا۔ لیکن ۲۷۰ء ق م میں جسوقت اسنے اپنی اور اپنی متوفیہ بیوی کی
پوجا "بھائی دیوتاؤں" کی پوجا کے نام سے رعایا میں جاری کی تو اس پوجا کو
اسکندر دیوتا کی پوجا کے ساتھ شامل کر دیا۔ فلادلفیوس کے بعد ہر ایک بادشاہ
اور اُسکی بیگم نے تا اختتام خاندان اِسی مثال کی پیروی کی۔ بطلیموس چہارم
نے البتہ رکشک دیوتاؤں کو اسکندر کے بعد اُنکے صحیح درجہ پر قائم کیا۔ پس
دار الحکومت شہنشاہی کے دیوتاؤں میں آخر کار متوفی بادشاہوں کے طولانی
سلسلہ کو بھی صدر میں جگہ مل گئی اور چوٹی پر زندہ بادشاہ اور اُنکی ملکہ کا درجہ رہا۔ (۱۶۵)
اسکندریہ سے باہر سلطنت کی شہری ریاستوں میں جیسے کہ رومانی شہنشاہوں
کے ماتحت علاقوں میں دستور تھا صرف بادشاہِ وقت کو دیوتا بنایا جاتا تھا۔
بطلیموس زندہ اپنے بزرگوں کی دیوتائی کو تسلیم کر کے انکے جملہ افعال کے جائز و صحیح
ہونیکی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا تھا۔ ان شاہانِ متوفی نے اپنی زندگی میں
احکام و فرامین بحیثیت دیوتا کے نافذ کیئے تھے اور جب تک اُنکی دیوتائی حیثیت
قائم تھی اُنکے احکام کی تعمیل سب پر فرض تھی۔ مگر شہری ریاستوں کو اس سے
کچھ بحث نہ تھی۔ اُنکا کام صرف یہ تھا کہ بادشاہ زندہ جو احکام اُسکے نام جاری کرے
اُنکو وہ قانون بنا دیں۔ اسطرح شاہانِ زندہ کی جانب سے قانون بنتے ہی
یہ ریاستیں اُن تمام احکام کی پابندی کی ذمہ دار ہو جاتی تھیں جسکو شاہانِ
متوفی جاری کر گئے تھے۔ رومانیں بعض شہنشاہوں کو بری طرح یاد کیا جاتا تھا۔
اور اُن سے کے احکام منسوخ کر دیئے گئے تھے۔ لیکن وہاں یہ بات اِسوجہ سے

ممکن تھی کہ اصولاً شہنشاہ روما جمہور کا ایک مقرر کردہ اہل کار ہوتا تھا۔ شاہان
معزول کے کاموں کو ناجائز قرار دینے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ انکو مرنے کے بعد
دیوتاؤں کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اسکندریہ کے لوگوں کو اس
قسم کا کوئی اختیار تمیزی حاصل نہ تھا۔ ۳۰۶ ق م کے بعد سے وہ بطلیموسی بادشاہوں
کے آقا نہیں رہے تھے بلکہ انکی رعایا بن گئے تھے۔ انکے شہر کا زندہ بادشاہ خود
اپنے تئیں دیوتا مقرر کرتا تھا۔ اور وہ اپنے سے پہلے بادشاہ کو دیوتائی کی عزت
سے صرف اس حالت میں محروم رکھ سکتا تھا کہ اس بادشاہ نے خود اپنی زندگی
میں اپنے تئیں دیوتا نہ بنایا ہو۔ جسکی صرف ایک مثال بطلیموس اول کی تھی۔ (۱۶۶)
چونکہ بادشاہ زندہ کا حکم ناطق تھا اسلیئے تعجب کا مقام نہیں کہ بعض صورتوں میں
ایسا بادشاہ اپنے خاندان کے کل لوگوں کو یعنی بیوی۔ بہنوں بچوں اور حرموں
کو بھی اپنے ساتھ اولمپیوس کے دیوتائی دربار میں جگہ دیتا ہو۔ بہرکیف اس کل
اہتمام میں ایک بات جو سب سے عجیب تھی وہ یہ تھی کہ فلادلفیوس اور اسکے
بعد چار بادشاہوں نے اس بات کی تو سخت تاکید رکھی کہ رعایا انکی پرستش
دیوتاؤں کی پوجا کیطرح کرے لیکن خود انھوں نے اپنی حیثیت ایک بادشاہ
سے زیادہ نہ سمجھی اور اس بات کی سخت احتیاط رکھی کہ کسی سرکاری تحریر میں
انکے نام کے ساتھ دیوتا کا لفظ نہ لکھا جاوے۔ یہاں قیاس یہ چاہتا ہے کہ
بطلیموسی بادشاہوں کو کوئی مذہبی دلیل اپنے تئیں دیوتا بنانے کی بجز اس کے
نہیں مل سکتی تھی کہ وہ مصریوں کی طرح مسئلہ اوتار کے قائل ہو جاتے۔ لیکن
شروع کے بطلیموس بہت مغرور تھے۔ انکو اپنی رعایا کے ایک عام عقیدہ کو
ماننا گوارہ نہ ہوا اور انھوں نے اس عقیدہ کو ماننے سے قطعی انکار کیا۔ مگر
باوجود اس انکار کے جس دیوتائی عظمت و وقار کے وہ درحقیقت اپنی رعایا سے
متمنی رہتے تھے اسکو حاصل کرتے رہے۔ اگر اسطرح قیاس کیا جاوے
تو ایک اور واقعہ کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ بطلیموسیوں
میں جس بادشاہ نے سب سے پہلے اپنے نام کے ساتھ تھیوس یعنی دیوتا کا لقب
اضافہ کیا وہ یورگیتیس ثانی تھا مگر یہ لقب قصداً اسوقت اختیار کیا گیا تھا جبکہ

اسکو اپنے تخت کی سلامتی کیلیئے رعایا سے مدد لینے کی ضرورت پڑی تھی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ جب تک کوئی حیلۂ قانونی ایجاد نہیں کر لیا جاتا کوئی شہنشاہی قائم نہیں ہوا کرتی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ محض اسی حیلۂ قانونی پر کوئی شہنشاہی زیادہ کیا چند روز بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ مقدونی سپاہی جو بطلیموس اوّل کو مصر میں ملے یا جنکو وہ اپنے ساتھ مصر میں لایا انتظام حکومت کے ضروری رکن تھے۔ جبتک اسکندر اعظم کا فرزند زندہ رہا بلکہ اسکے مرنے کے چار برس بعد تک بطلیموس ان سپاہیوں کا محض ایک افسر رہا۔ لیکن اسکے بعد وہ انکا بادشاہ ہو گیا اور اس بات کو ثابت کرنے کیلیئے کہ سلطنت اسکندریہ پر بطلیموسوں کا قبضہ غاصبانہ نہ تھا یہ قصہ ایجاد ہوا کہ بطلیموس اوّل لاگوس کا بیٹا نہ تھا بلکہ اسکندر کے باپ فیلقوس کے نطفہ سے تھا۔ یہ امر بطلیموس کی شرافت پر ایک دلیل ہے کہ وہ اپنی ماں کی نسبت اس قسم کی بہتان بندی میں خود ہرگز (۱۴۶)
شریک نہوا۔ اور اسنے ایک ولد الحرام فرزند ہونیکی جگہ ایک غاصب بادشاہ ہونیکو بہتر سمجھا۔ بطلیموس کو مقدونیہ کے شاہی خاندان سے قرابت ضرور تھی اور ایک یا دو پشت اوپر جاکر اسکا سلسلۂ نسب شاہانِ مقدونیہ سے جو زیوس دیوتا کی اولاد سے مانے جاتے تھے مل جاتا تھا۔ بطلیموس کی ماں کا مقدونیہ کے شاہی خاندان سے ہونا لا کلام تھا اور اس قرابت پر بطالمہ نے ہمیشہ زور بھی دیا تھا۔

پس بطلیموسی شہنشاہی کا قائم کیا جانا تین قیاسوں پر مبنی ہے جو سب ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔ ایک یہ کہ قیام کیوجہ اہل مصر کی بہی خواہی تھی۔ دوسرے یہ کہ قیام کیوجہ شہری ریاستیں تھیں۔ تیسرے یہ کہ قیام کیوجہ مقدونیہ والوں کی عزت و شہرت کا پاس تھا۔

ملکہ کلیوپیترا کے مرنے کے دو سو برس بعد مورخ اپیان اسکندریہ کا رہنے والا کاغذات شاہی کی سند سے لکھتا ہے کہ خشکی پر لڑنے کے تئیے فلادلفوس کے پاس دو لاکھ پیدل اور چالیس ہزار سوار اور تین لاکھ آدمیوں کو مسلح کرنے کیلئے ہتھیار موجود تھے۔ اسکے علاوہ تین سو لڑائی کے ہاتھی اور

دو ہزار لڑائی کے رتھ تھے۔ بحری معرکوں کیلئے دو ہزار باربرداری کی کشتیاں ڈیڑھ ہزار جنگی جہاز جنہیں تین سے لیکر پانچ تک کشتی بانوں کی صفیں ہوتی تھیں موجود تھے۔ ڈانڈ اور پتوار یا بادبانوں کی رسیاں اس سے دوگنی تعداد کے جہازوں کیلئے موجود رہتی تھیں۔ یہی مورخ لکھتا ہے کہ اس ساز وسامان کے علاوہ آٹھ سو پرتکلف شاہی کشتیاں تھیں جنکے روکار اور پشت پہ سونے اور چاندی کی قلعی تھی فلادلفیوس کے خزانہ میں سات لاکھ چالیس ہزار مصری ٹیلنٹ موجود تھے جنکے تخمیناً نواسی کروڑ شلنگ ہوئے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے خزانہ میں اسوقت جو سونا اور چاندی ہے اسکی (۱۶۸
قیمت فلادلفیوس کے متذکرۂ بالا سرمایہ کا تہائی حصہ سمجھنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں مال و دولت کا تخمینہ کرتے ہیں جو جو حماقتیں کیگئی ہیں انکی تاریخ ابھی لکھنی باقی ہے۔ اور جب کبھی اسکا موقع آئیگا تو بطلیموس کے خزانہ کا یہ سرمایہ بھی اسمیں درج کرنا مناسب ہوگا۔ مصری فوجوں کا تخمینہ بطلیموس ثانی کے زمانہ میں اسی ہزار آٹھ سو نفر کیا گیا تھا۔ یہ تعداد البتہ واجبی معلوم ہوتی ہے۔ بطلیموس چہارم کے زمانہ میں مصری سپاہیوں کو چھوڑکر جنکی تعداد چھبیس ہزار تھی کل فوجیوں کا شمار چار لاکھ ستانوے ہزار تھا۔ یہ سیر اتنی بہت بھاری معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ معلوم کرلیا جاوے کہ اسقدر کثرت سے سپاہی کہاں سے بھرتی ہوتے تھے تو پھر بطلیموسی حکمت عملی کے بہت سے عقدے حل ہوجاتے ہیں۔

پہلی بات غور کرنیکی یہ ہے کہ باشندگانِ مصر سے اس سپاہ کی بھرتی ممکن نہ تھی کیونکہ اس سپاہ کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ مصر کے اصلی باشندوں کو قابو سے باہر نہ ہونے دے۔ مصر کی آبادی نہایت کثیر تھی جسکو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ اسکندریہ گو خصوصیت کے ساتھ یونانی شہر تھا مگر اسمیں بھی مصر کے اصلی باشندے شہر کے ایک بڑے حصہ میں بکثرت آباد تھے۔ باقی دو یونانی شہر نوکراتیس اور تلمائیس اور انکے علاقے مصر کے کثیر الآباد ملک میں ریگستان کے چند ذرے معلوم ہوتے تھے۔ تمام وادی نیل میں مصریوں کے گاؤں اور قریے شمال سے لیکر جنوب تک چلے گئے تھے۔ تھیوکریتوس نے

انکی تعداد ۳۲۳۳۲۳ لکھی ہے۔ ان میں ستر لاکھ آدمی بستے تھے جن کا آب و دانہ مصر کی زمین سے تھا۔ اس کثیر مخلوق کو یونانی بنانے کا خواب اسکندر کو نظر آتا تو آتا مگر بطلیموس کو اسکا خیال تک نہ گذرا۔ چنانچہ بطلیموسی خاندان کے دور حکومت میں بلکہ اسکے زوال کے دو سو برس بعد تک نوکراٹیس اور ٹلمائیس کے یونانی شہروں میں یہ قانون موجود تھا کہ ان شہر والوں میں اور مصریوں میں شادی بیاہ نہ ہو۔

مصر کی زمین کا مالک بادشاہ تھا۔ کل وادی نیل اُسکی ذاتی جائداد تھی۔ بجز چند قطعات کے جو خاص غرض سے علیحدہ رکھے گئے تھے جنکا حال ہم ابھی لکھینگے مصری مواضع کے متصل جسقدر قابل کاشت زمین تھی وہ بادشاہ کی آسامیوں کے قبضہ میں تھی یہ آسامیاں فی ایکر تقریباً ساڑھے سات بشل (پانچ من کے قریب) غلہ کے حساب سے بادشاہ کو لگان ادا کرتی تھیں۔ اور زمین کی کاشت کے متعلق جو قواعد دربار سے مقرر تھے اُن کی پابند تھیں کھیتی کیلئے بیج بادشاہ کی طرف سے ملتا تھا۔ بادشاہ کو اختیار تھا کہ جب چاہے ان کاشتکاروں کو زمین سے بیدخل کردے لیکن کاشتکاروں کو یہ اختیار نہ تھا کہ کھیت بونے اور کاٹنے کے زمانہ میں خصوصاً اپنے گاؤں سے بلا اجازت (بجز ایک قلیل مدت کے) غیر حاضر ہو جائیں۔ ان کاشتکاروں کو زمین کی پیمائش آبپاشی۔ باربرداری۔ ڈاک وغیرہ کے متعلق بہت سی بیگار کرنی پڑتی تھی۔ بادشاہ کو یہ بھی اختیار تھا کہ کاشتکاروں کے بڑے بڑے گروہ ایک جگہ سے دوسری جگہ زبردستی اس غرض سے منتقل کردے کہ گاؤں میں جو اراضی خشک یا زیادہ مرطوب بلا کاشت پڑی ہے اسکو قابل کاشت بنائیں یا اُسمیں کھیتی کریں۔ یہ کاشتکار ہر آدمی اور گھر پیچھے بادشاہ کو محصول دیتے تھے۔ اور اگر ان کے پاس انگور اور سیب کے باغ ہوتے تھے تو پیداوار کا چھٹا حصّہ مندروں اور بت خانوں کے منتظموں کی نذر کرتے تھے جنکا تقرر بادشاہ کی جانب سے ہوا کرتا تھا۔ یہ کاشتکار ہر قسم کی چیزیں۔ شراب۔ تیل۔ مچھلی۔ شہد۔ کپڑا۔ سجی۔ مٹی۔ اینٹیں۔ لکڑی۔ کاغذ یا اور روزمرہ کے استعمال کی ضروری چیزیں یا تو بادشاہ سے جو سب چیزوں کا بنانے اور بیچنے والا تھا مول لیتے تھے

یا معمولی دکانداروں سے خرید کرتے تھے۔ لیکن ان دکانداروں پر اتنا محصول لگادیا گیا تھا کہ وہ بادشاہی قیمت سے کم قیمت پر اپنا مال فروخت نہ کرسکتے تھے کھیتوں پر سرکاری محافظ نگرانی کیلئے مقرر تھے کہ کسیطرح کا سرکاری نقصان نہ ہونے پائے۔ سپاہ تمام ملک میں گشت لگاتی رہتی تھی تاکہ سڑکوں اور جنگلوں پر نظر رہے کہ کوئی آدمی مال بلا محصول ادا کئے کسیطرف نہیں لیجاتا۔ گاؤں گاؤں محرر و محاسب مقرر تھے جو کاشتکاروں کے خاندانوں یا جمع بندی کے رد و بدل کو اپنے کاغذات میں درج کرتے تھے۔ اور ہر رقم کی ادائیگی کے وقت رقم کی (۱۶۰)
جانچ کرتے تھے۔ ہر گاؤں میں سرکاری کاغذات رکھنے کا دفتر اور مالگذاری کا روپیہ رکھنے کا مکان اور اناج کا گنج ہوتا تھا۔ دریائے نیل پر بادشاہی کشتیاں مال و اسباب سے بھری ہوئی ادھر سے اُدھر آتی جاتی نظر آیا کرتی تھیں پیداوار میں جو توفیر ہوتی تھی وہ ان ہی کشتیوں میں اسکندریہ کو بھیجی جاتی تھی یا بادشاہی کارخانوں کی تیار کی ہوئی چیزیں شاہی گوداموں کو روانہ ہوتی تھیں جہاں وہ سب کے ہاتھ فروخت کیجاتی تھیں۔ غرض یہ سمجھیے کہ بادشاہ مصر دنیا کا سب سے بڑا دکاندار اور مال کا تیار کرنیوالا تھا۔ ہر چیز کی قیمت وہ ہی مقرر کرتا تھا یہانتک کہ جزیرہ ڈیلوس میں بھی جو مصر سے بہت دور تھا کاغذ اور گوند (مُر) اور اور چیزوں کی قیمت بادشاہی کی مقرر کی ہوئی ہوتی تھی۔ بازار میں ہر چیز کی قیمت کا بادشاہ کی مرضی اور اسکے منافع سے مقرر ہونا اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سنہ ۲۹۶ ق م میں کاغذ کے ایک تختہ کی قیمت اگر ایک آنہ کے قریب تھی تو سنہ ۲۷۹ سے سنہ ۲۵۰ ق م کے درمیان بدرجہ اوسط اسکی قیمت گیارہ آنہ کے قریب رہی۔

مگر اس حال میں بھی کہ سرکاری اہلکاروں کا ایک بے شمار غول رعایا کا خون چوسنے کو ہر وقت لپٹا رہتا تھا اور تمام چیزوں پر محصول و لگان اسقدر تھا کہ مشکل سے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا نصیب ہوتا تھا مورخوں کا بیان ہے کہ مصر کے کاشتکار خوش رہکر صبر و محنت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن ضرور ہے کہ انکے دل میں اس شکایت کی آگ سلگتی رہتی ہوگی کہ محنت اور مصیبت تو

ہم اٹھائیں اور اسکندریہ میں بیٹھے عیش کریں ہمارے آقا اور مالک۔ ایسی حالت میں اِن لوگوں کو سوائے اسکے کیا چارہ تھا کہ اسکندریہ کے حق میں منہ سے فال بد نکال کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے رہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ "وہ دن آنیوالا ہے کہ اسکندریہ جو پانی کے کنارے آباد ہے غارت ہوکر ماہی گیروں کے جال پھیلانے اور جال سکھانے کی جگہ ہو جائیگا۔ اور جتنے دیوتا اسکندریہ میں رہتے ہیں وہ شہر چھوڑکر ہمارے قدیم پایۂ تخت ممفس میں جا رہینگے"۔

پس ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے اسکندریہ کی فوجیں تیار نہیں ہوسکتی تھیں البتہ جنگی جہازوں پر جہاز کھینے کی خدمت انکو دیجاتی تھی۔ یا بار برداری کے کاموں میں بھی انکو نوکر رکھ لیا جاتا تھا۔ اور بعض وقت جب ایسی ہی سخت ضرورت پیش آتی تھی تو اِن میں کچھ لوگوں کو سپاہی بھی بنا دیا جاتا تھا۔ مگر اس بات کو
(۱۷۱) تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ مصر سے باہر یہ لوگ لڑائی میں اچھا کام کرتے تھے یہ ہی کہنا پڑتا ہے کہ خاص مصر میں انکا شمار دشمنوں میں تھا جن سے ابتدار کے شاہانِ بطلیموس ہمیشہ خائف و پریشان رہے تھے۔

مصر میں اسکندریہ اور نوکراٹس اور تلمائی خصوصیت کے ساتھ یونانی شہر تھے۔ انکے رہنے والے یونانی کسی کی رعایا نہ تھے بلکہ آزاد شہری تھے۔ اور آزاد شہری ہونیکی وجہ سے وہ بظاہر فوجی خدمتوں سے مستثنیٰ تھے۔ پس ایسی صورت میں قومی حفاظت اسطرح نہیں پیدا ہوسکتی تھی کہ اگر مصر میں جنگ نکلتی تو اِن تینوں شہروں کی مثل اور شہر آباد کردیئے جاتے۔ اور نہ قومی حفاظت کی سبیل یہ تھی کہ کسی اور قسم کے شہر مصر میں بسائے جاتے۔ کیونکہ اگر بطلیموس کو اسکا یقین بھی ہوتا کہ ایک یونانی یا مقدونی آبادی کے گرد مصریوں کو ایک شائستہ اور شہری جماعت بناکر آباد کرنا ممکن ہے جیسا کہ اسکندر ایسے موقع پر کوشش کرتا یا جیسا کہ آگے چلکر ۲۰۲ء میں رومانیوں نے واقعی ایک ایسا ہی انتظام کردکھایا تو بھی قوم فاتح کیلئے ایک غیر ملک میں قومی حفاظت کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی کیونکہ اسوقت تک مصر میں کوئی یونانی یا مقدونی آبادی جسمیں بڑھنے یا پھیلنے کا مادہ ہوتا موجود نہ تھی۔ پس ضرور ہوا کہ حفاظت کا سامان باہر سے

لایا جاوے ۔ یہ سوال کہ مشرقی بحر متوسط کی ریاستوں سے تعلق رکھنا ضروری تھا۔ جہاں سے حفظ سلطنت کیلئے لائق آدمی اور فوجوں کیلئے سپاہی میسر آتے تھے شاہان بطالمہ کیلئے معمولی سوال نہ تھا بلکہ موت اور زندگی کا سوال تھا۔

تھیوکریتوس کی ایک نظم میں ایک کاشتکار دوسرے کاشتکار سے کہتا ہے :-

تھیونیکوس ۔ اگر تمہارا یہی ارادہ ہے کہ دریا کا سفر کر کے کہیں باہر روزی تلاش کرو تو بطلیموس سے بڑھکر کوئی آدمی کھری مزدوری دینے والا نہ ملیگا۔

اسکی نیز اسکے سوا اور خوبیاں بھی تو اسکی بیان کیجئے ۔

تھیونیکوس ۔ بطلیموس بڑا شریف ہے ۔ بڑا دانشمند اور طبیعت کا نفیس ہے ہر ایک صحبت میں سب کا سردار معلوم ہوتا ہے ۔ عورتوں کے حق میں وفادار ہے ۔ دوست کو خوب پہچانتا ہے اور اس سے بھی بڑھکر دشمن کو تاڑ تا جاتا ہے ۔ بڑی داد و دہش کا آدمی ہے پورا بادشاہ ہے ۔ انعام واکرام دینے میں ذرا ہاتھ نہیں روکتا ۔ اگر تم اس بات پر تیار ہو کہ فوجی قبا کا تکمہ داہنے شانہ پر لگا کر میدان میں ٹانگیں چیر کے کھڑے ہو جاؤ اور دشمن جسوقت ڈھالیں سامنے کئے دھاوا کرے تو جی توڑ کر اُس کا مقابلہ کرو تو پھر کیوں دیر کرتے ہو فوراً مصر چلے جاؤ ۔" فینیشیا اور اسکے مشرقی علاقوں پر تصرف رکھنے کی بطلیموسیوں کو فی الواقع ضرورت تھی ۔ کیونکہ یہاں بڑے بڑے جنگل تھے جنمیں جہاز بنانے کیلئے لکڑی بہت عمدہ پیدا ہوتی تھی ۔ مصر میں اس چیز کی قلت تھی ۔ سمندر پار کے اور جسقدر علاقے تھے انپر قبضہ رکھنا یا پانا بھی ضروری تھا کیونکہ بطلیموسی فوجوں میں ان ہی علاقوں سے آدمی بھرتی کئے جاتے تھے ۔ اور وہ ایسے سپاہی بنتے تھے جن پر بادشاہوں کو پورا بھروسا ہوتا تھا ۔ مصر میں ایسے آدمی میسر نہ تھے ۔ پس جیسا کہ اوپر آچکا ہے شروع زمانہ کے بطلیموسیوں نے مصر سے باہر اپنی شہنشاہی اسلئے رکھنی چاہی کہ مصر کا اندرونی انتظام خوش اسلوبی سے ممکن ہو ۔ اُنکی خارجی پالیسی درحقیقت داخلی پالیسی کا نتیجہ تھی ۔ اور مصر کو وہ ایک غیر ملک سمجھکر اُسپر اپنی حکومت رکھنی چاہتے تھے ۔ (۱۷۲)

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ بطلیموسیوں کے پاس جسقدر سپاہی موجود تھے

یا ہمیشہ بھرتی ہوا کرتے تھے ان کے ساتھ بطلیموسیوں کا کیا سلوک تھا۔ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مصر کی زمین کے بعض حصے چند خاص اغراض کیلئے علیحدہ رکھے گئے تھے۔ ان میں ایک حصہ بت خانوں کی آمدنی کیلئے مخصوص کر دیا گیا تھا جس سے انکا خرچ چلتا تھا۔ یہاں اتنا اور کہا جا سکتا ہے کہ بطلیموسی بادشاہ گو کاہنوں کو خود مقرر کرتے تھے اور ان کو اپنے قابو اور تحت میں رکھتے تھے مگر وہ انکو طرح طرح سے خوش بھی کرتے رہتے تھے۔ اور صرف یہی نہ تھا کہ انکو بڑے بڑے وظائف حاصل رکھنے کا موقع دیا گیا تھا بلکہ خاص مقررہ رقوم بھی انکو سالانہ دیجاتی تھیں۔ نئے ہیکل اور بتخانے بادشاہ اپنے صرف سے بنوا دیتے تھے یا اس قسم کی پرانی عمارتوں کی مرمت بھی کرا دیتے تھے۔ اور انکو اسکی اجازت بھی ملی ہوئی تھی کہ بادشاہی دکانوں سے جو چیزیں گراں قیمت پر ملتی تھیں ان کو وہ بطور خود اپنے استعمال کیلئے تیار کر لیا کریں۔ علاوہ اسکے کاہنوں کو زمین دیگئی تھی اسمیں یہ بھی رعایت نہ تھی کہ زمین تفویض کر دی گئی تھی بلکہ زمین کے متعلق خود انتظام کرنیکا جو حق بادشاہوں کو حاصل تھا اس سے بھی بادشاہ دست بردار ہو جاتے تھے۔ کاہنوں کے ساتھ یہ شرائط اس قسم کی ہوتی تھیں جنمیں زمین پر بادشاہ کا حق مالکانہ تو قائم رہتا تھا لیکن قبضہ واپس لینے کا حق جاتا رہتا تھا۔ (۱۰۳)

ایسی ہی علیحدہ کی ہوئی زمینوں میں وہ بڑے بڑے قطعات معہ انکے مواضعات کے تھے جو بادشاہ نے بلا مالگذاری یا محصول اپنے درباریوں کو بطور جاگیر یا معافی دوام کے دے رکھے تھے۔ یہ لوگ شاہان بطلیموس کے دوستوں اور جان نثاروں میں سمجھے جاتے تھے۔ انکی سکونت تو اسکندریہ میں ہوتی تھی لیکن دیہات میں وہ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار ہوتے تھے اپنے علاقوں میں انکی سکونت نہ تھی بلکہ دار الحکومت میں بڑے تکلف و عیش سے انکا ان کی وافر آمدنی پر جو مصر کی آسامیاں ادا کرتی تھیں زندگی بسر کرتے تھے۔ معمولی سپاہیوں کو اسکی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بطلیموسیوں کی ملازمت میں رہکر کبھی جاگیرداری کے رتبہ کو پہنچ جائینگے۔ کیونکہ یہ حضرت بادشاہوں نے

اپنے اراکین دربار اور بڑے بڑے عہدہ داروں کیلئے مخصوص کر دی تھی۔
لیکن معمولی سپاہیوں کو بھی تمام ملک مصر میں زمینیں ملی ہوئی تھیں۔ فوج خاصہ اور سوار ۵ ــ کے سپاہیوں کو ۹۵ اور ۴۵ ایکڑ والے اور پیدلوں کو ۲۰ ایکڑ والے قطعے دئے جاتے تھے۔ مصر کی حالت پر غور کیا جاوے تو یہ عطیات بہت بیش بہا تھے۔ سپاہیوں میں تفویض اراضی کا طریقہ فلادلفیوس نے مکمل کر دیا تھا اسکے زمانہ میں پیدل فوج کی تعداد ۵،۶۰۰ اور سواروں کی تعداد ۲۳۲۰۰ تھی۔ اگر اس تعداد میں تنخواہ دار سپاہی شامل نہ تھے اور
(۱۷۴) زمینیں بھی ایسی تفویض کیجاتی تھیں جو دریائے نیل سے سیراب ہوتی تھیں تو سمجھنا چاہیے کہ مصر کی جملہ قابل کاشت اراضی کا چوتھائی حصہ فوج کی نذر ہو چکا تھا۔ مگر اسمیں شبہ نہیں کہ فوجوں میں بہت لوگ ایسے ہوتے تھے جو تنخواہ پر ملازمت کرتے تھے۔ اور باقی فوجیوں کو بالعموم ایسی خشک یا زیادہ مرطوب زمینیں دیجاتی تھیں جنکو اپنے پاس سے روپیہ لگا کر اور محنت و مشقت کر کے درست کرنا پڑتا تھا۔ اس قسم کی اراضی کا بہت سا حصہ بطلیموسیوں نے ایرانیوں سے ترکہ میں پایا تھا جنکی حکومت چوتھی صدی قبل مسیح میں مصریوں کی بغاوتوں سے اس قابل نہ رہی تھی کہ قائم رہ سکتی۔

فوجیوں کو اختیار تھا کہ اپنی کل زمین یا اسکا کوئی ٹکڑا دوسروں کو ٹھیکے پر دیدیں اور خود اسکندریہ میں یا کہیں اور سکونت رکھیں۔ انکو یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ پٹہ داروں کے قبضہ سے اپنی زمین نکال کر خود کاشت کریں۔ ملک کے ہر حصہ میں فوجوں کو تقسیم و مقیم کرنیکی آسانی کیلئے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ سپاہیوں کے رہنے کیلئے ایسی اراضیات کے متعلق جا بجا چھاؤنیاں قائم کر دی تھیں۔ یہ چھاؤنیاں اکثر مصریوں کے موضعوں میں پڑتی تھیں۔ مصری اپنے دیہات میں فوجوں کے آباد ہونے سے خوش نہ تھے۔ اسکا ثبوت ایک پرانے خط سے ملتا ہے جو داروغہ چھاؤنی نے ایک سرکاری عہدہ دار کے نام روانہ کیا تھا۔ خط میں لکھتا ہے کہ "ہم کو معلوم ہوا ہے کہ کروکوڈائلوپولس کے شہر میں بعض مکان داروں نے جنکے مکانوں میں پہلے فوج کے لوگ

رہتے تھے اپنے مکانوں کی چھتیں اتار دی ہیں اور دروازوں کو چن دیا ہے اور
انہیں ملا کر قربان گاہ بنا دئے گئے ہیں۔ یہ کارروائی اسلئے کیگئی ہے کہ ان مکانوں
میں پھر کوئی آباد نہ ہو سکے۔ فوج کیلئے مکانات کی سخت قلت ہے اسلئے اگر آپکو
اتفاق ہو تو اجینور کو لکھئے کہ وہ مکان داروں کو حکم دے کہ قربان گاہ دروازوں
سے ہٹا کر پہلے سے بھی بہتر شکل کے نمایاں موقعوں پر یعنی مکانوں کی چھتوں پر قائم (۱۷۵)
کریں تاکہ ہم مکانوں پر قبضہ کر سکیں"۔ اس تحریک میں ظاہر ہے کہ مکانوں میں
دروازے بھی بنا دئے جاتے تھے اور چھتیں بھی جو گرا دی گئی تھیں درست
ہو جاتی تھیں۔ اور بجائے دروازوں کے اب چھتوں کی احتیاط نہ ہونا ضروری
ہو جاتی تھی۔ جو ویسے بھی بڑی ضروری چیز تھی۔ رہا قربان گاہوں کا پہلے سے
بہتر شکل میں تیار ہونا تو انہیں مالکان مکانات کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ حقیقت
میں یہ پرانے وقتوں کے داروغہ صاحب اپنے کام میں بہت ہی ہوشیار تھے۔
ظاہر ہے کہ مصر کے تمام اضلاع میں ہر جگہ تھوڑی تھوڑی فوج کا
مقیم رکھنا گورنمنٹ کے مقاصد کیلئے بہت مفید تھا۔ ان فوجوں میں تربیت یافتہ
سپاہی افسر ضلع کی ماتحتی میں اپنے اپنے علاقہ میں حاضر رہتے تھے۔ افسر ضلع
افسر فوج بھی ہوتا تھا۔ اضلاع میں ان مقیم فوجوں کے سپاہی ہمیشہ مقدونی
یا یونانی قوم کے نہ ہوتے تھے بلکہ ان میں بعض ایرانی ہوتے تھے جو بطلیموس اول
کے آنے کے وقت مصر میں موجود تھے۔ بعض یہودی ہوتے تھے یا لیبیہ۔
تھریسیا۔ مائسیا اور گلاتیہ کے باشندے ہوتے تھے۔ غرض یہ سب ان ملکوں
کے لوگ تھے جن سے بطلیموسیوں کی سلطنت سوراخ کر کے کچھ نہ کچھ کھینچ چکی تھی۔
ان فوجیوں کی زمینوں پر کسی قسم کا لگان نہ تھا اور نہ آدمیوں پر محصول تھا۔
باغات کی پیداوار کا حصہ بھی بجائے دسویں حصے کے صرف چھٹا حصہ دینا ہوتا
تھا۔ نہروں اور بندرگاہوں میں بیگار پر کام کرنا انکا فرض تھا۔ مگر یونانیوں
کی طرح یہ بھی بیگار کے بدلے کچھ روپیہ دیکر جان چھڑا لیتے تھے۔ لیکن ان رعایتوں
سے قطع نظر کر کے ان پر دیگر محصولات کی وہ سختی تھی کہ بادشاہی اسامیوں پر
بھی نہ تھی۔ ان کے ذمہ بادشاہ نے خاص رقوم کا ادا کرنا لازمی کر دیا تھا۔

یہ رقوم امدادی کہلائی جاتی تھیں۔ اگر یہ رقمیں ادا نہ کیجاتی تھیں یا دیگر مدّات
انکے ذمہ باقی رہ جاتی تھیں تو پھر وہ زمین سے بے دخل کر دئے جاتے تھے۔ پس
وہ مجبور تھے کہ جو زمین ملی ہے اور جو بالعموم بلا کاشت ہوتی تھی اسکو درست
(۱۷۶) کر کے عمدہ پیداوار حاصل کریں تاکہ سرکاری محصول ادا ہو سکے۔ پس بطلیموسی مصر میں
فوجی لوگ ترقی و فلاح کے پیش رو تھے جنہوں نے اپنی محنت و مشقت سے
قابل کاشت زمینوں کا رقبہ بڑھا دیا اور زراعت کے متعلق جو سخت نقصانات
ایرانیوں کی حکومت میں ملک کو پہنچ چکے تھے انکو رفع کر کے فائدہ کی صورت نکالی۔
جسوقت کوئی سپاہی مرجاتا تھا یا فوج چھوڑ کر چلا جاتا تھا تو اسکی زمین
ضبط کر لی جاتی تھی۔ اس صورت میں بادشاہ کو اختیار تھا کہ وہ ایسی زمین کو اپنی
مملوکہ اراضی میں شامل کر لے یا دوسرے سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ جس
زمانہ میں کہ بطلیموسی سلطنت کی شکل شہنشاہی کی تھی اس زمانہ میں ایسی زمینیں
بالعموم بادشاہی اراضی میں شامل کر لیجاتی تھیں بشرطیکہ اُن سے لگان اور
محصول کی رقم نکلنی ممکن ہو۔ مگر اسکے ساتھ ایک طریقہ یہ بھی مدّت سے جاری
تھا کہ متوفی یا بڈھے سپاہیوں کے لڑکوں کو اگر یہ لڑکے فوجی خدمت کیلئے
تربیت پا چکے ہیں انکے باپ کی متروکہ زمین یا کوئی اور زمین بادشاہ کیطرف
سے تفویض کر دیجائے۔ جن لوگوں کو اس طور پر زمینیں ملتی تھیں اُن کو
"توفیری" کہتے تھے۔ اور وہ اپنے باپ کی متروکہ زمین پر قابض ہوتے ہی
فوجوں میں بھرتی کر لئے جاتے تھے۔ اس طریقے سے بطلیموسیوں نے فوجیوں
کی ایک نئی نسل تیار کر لی تاکہ رفتہ رفتہ ایسے سپاہیوں کی ضرورت کم ہوتی جائے
جو سمندر پار کے علاقوں سے تنخواہ پر بھرتی کئے جاتے تھے۔ اور جس طرح
زمانہ قدیم میں فراعنہ کے دور حکومت میں "مخومیوں" یعنی لڑنے والوں کا
خاص گروہ پیدا ہو گیا تھا اسیطرح بطلیموسی بادشاہوں کے زمانۂ حکومت میں
اس نئی نسل کے سپاہیوں نے ملک میں لڑنے والوں کی ایک نئی جماعت
پیدا کر دی۔
اگرچہ فوجوں کے لوگ قومی اعتبار سے مختلف تھے مگر سب یونانی زبان

لیتے تھے۔ انکے مقدمات و معاملات ایسے قوانین کے مطابق فیصلہ کئے جاتے تھے
(۱۷۷) جو اُنکی قوم کا لحاظ کر کے خاص انکے مفاد کیلئے نافذ کئے گئے تھے جیساکہ
ترکیوں کی سلطنت میں ابتک طریقہ رہا ہے کہ غیر ملک کے لوگ اپنا اپنا قانون
معہ اُسکے حقوق و فرائض کے اپنے ساتھ لاتے ہیں اسیطرح بطلیموسی مصر میں
ہر قوم و جماعت کیلئے اُسی قوم و جماعت کا قانون جاری کیا گیا تھا۔ اور بطلیموسی
عدالتوں کیلئے اقوام غیر کے قوانین جدا جدا مجموعوں کی صورت میں نافذ
تھے۔ قانونوں کے یہ مجموعے یا تو یونانی زبان ہی میں مرتب ہوئے تھے
یا قانون موسوی کیطرح جنکے یہودی پابند تھے یونانی زبان میں مدّت سے
ان کا ترجمہ چلا آتا تھا۔ ان مختلف اقوام غیر کو سیاسی آزادی کس حد تک
حاصل تھی اس کا بتانا مشکل ہے۔ لیکن اتنی بات بالعموم پائی جاتی ہے
کہ جہاں جہاں آبادی کی کثرت تھی مثلاً ممفس یا سب سے زیادہ اسکندریہ
میں وہاں شاہان بطلیموس کی مطلق العنانی میں کسیقدر اعتدال پیدا کر دیا
گیا تھا۔ باقی مقامات میں بلاشبہ قوی گروہ زیادہ تر غیر مصری سپاہیوں کے تھے
جو ملک کی حفاظت کرتے تھے اور جنکو کلیروک بھی کہتے تھے۔ ان لوگوں کے
شہری حقوق اسوقت سلب ہو جاتے تھے جب وہ بادشاہ کے حکم سے کسی
لڑائی پر بھیجے جاتے تھے۔ ان لوگوں میں سیاسی شورش بااثر اسی وقت
ہو سکتی تھی جب کہ وہ فوجی غدر کی شکل اختیار کرے۔

یونانی یا غیر ملکوں کے لوگ جنہوں نے یونانی معاشرت اختیار کر لی
تھی بہت سی عجیب و غریب باتیں اپنے ساتھ اس ملک میں لائے تھے۔
مگر ان میں سب سے عجیب چیزیں وہ تھیں جن کو یونانیوں کے جمناشیا سے
تعلق تھا۔ جہاں طرح طرح کی ورزشوں اور کھیل کود سے لیکر شعر و شاعری کا
بھی عمدہ سبق ملتا تھا۔ جمناشیا کے بعض مشغلے ایسے تھے جنکو شروع زمانہ
سے اور اس کے بعد مدّت تک مصر کے لوگ حیرت بلکہ کراہت سے دیکھتے
رہے۔ پلاسٹری میں جسکو اکھاڑا کہنا چاہئے اور جسمیں کشتی کا فن اور فوجیوں
(۱۷۸) کو فوجی کرتب سکھائے جاتے تھے جب یونانی مادر زاد ننگے ہو کر دوڑتے ہوئے

بھلانکتے یا کودتے تھے یا کشتیاں لڑتے تھے تو یونان کے ہرکلیز اور مصر کے بوسیرس کا پرانا قصہ ہمیشہ پیش آیا کرتا تھا۔ مگر جب بوسیرس کو پتہ چلگیا کہ جس طاقت کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتا وہ کیونکر پیدا ہوتی ہے[عہ] تو پھر یہ قصہ پیش آنا بند ہوگیا۔ جمناشیا یونانیوں کی اعلیٰ تعلیم کا بھی ایک طور پر درسگاہ تھا۔ اسی کی بدولت انھوں نے اپنی اولاد میں فلسفہ اور شاعری کے وہ خیالات پیدا کئے جبکو سوائے یونان کے کوئی دوسرا ملک نہ پیدا کر سکتا تھا۔ مصر کے ہر ایک ضلع میں یونانی تعلیم و تربیت کا مرکز یہ ہی جمناشیا ہوتا تھا۔

غیر ملک والے اپنا اپنا مذہب بھی اس ملک میں اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور اگر وہ یہودیوں کی طرح خدائے واحد کے ماننے والے نہوتے تو پھر خاص مصر کے ہزارہا قسم کے معتقدات کا انکو بہ آسانی اعتقاد ہو جاتا تھا۔ اسیطرح باشندگان مصر اور باہر والوں کے مذہب میں ایک تعلق پیدا ہو چلا اور یونانی اور مصری مذہبوں کے میل سے ایک دیوتا سراپیس سب کا مشترک دیوتا بن گیا۔ یہ دیوتا آدھا یونانی اور آدھا مصری تھا۔ بطلیموس اول نے سینوپی کے مقام میں اسکی پرستش دیکھکر مصر میں بھی اسکی پوجا کا رواج کردیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں سراپیس کو بزرگی اور کرامات میں وہ درجہ دیا گیا جسکا دینا مصر پیرانہ سال ہی کی قدرت میں تھا۔ اس دیوتا کے جو بت بنائے گئے ان میں یونانی صورت کا حسن خاص طور پہ دکھایا گیا۔ غرض سراپیس اور دیوتاؤں اور دیبیوں کے ساتھ جنکے نام آئی سیس۔ انوبیس ہارپوکرائیس تھے

عہ ہرکلیز یونان کا مشہور پہلوان تھا۔ اس نے مصر کے ایک پرانے بادشاہ بوسیرس کو کشتی میں قتل کیا تھا۔ یہ مصری بادشاہ جب زندہ تھا تو کسی غیر ملک والے کو جہاں کہیں اپنے ملک میں دیکھتا تھا فوراً گرفتار کرکے ایمون کے مندر میں قربانی کروا دیتا تھا۔ مصنف کے اس فقرہ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ شروع شروع میں مصری یونانیوں سے ہمیشہ کشتی میں ہار جاتے تھے لیکن جب انکو یونانیوں کی کشتی کے گر معلوم ہوگئے تو وہ بھی کامیابی سے انکا مقابلہ کرنے لگے۔

مترجم

مصر کے سب سے بڑے دیوتاؤں میں شمار ہونے لگا۔ اور بطلیموسی سلطنت کے ہر گوشہ میں وہ ایک بڑی مذہبی طاقت مانا گیا۔ شروع زمانہ کے بطلیموسی بادشاہوں
(۱۷۹) نے ایسی باتوں کا ارادہ کیا جنکو عمل میں لانا ممکن نہ تھا۔ انکی کوشش یہ رہی کہ خاص اہل مصر کے مذہبی طریقوں اور دیوتاؤں اور بتوں کو تو یونان اور مصر کے ملے جلے مذہب میں سب سے بڑا محرک رکھا جائے اور جو دو تمدن مصریوں اور یونانیوں کے جداجدا سلطنت میں موجود ہیں انہیں جس حد تک مذہبی خیالات۔ مذہبی اعمال، مذہبی امیدیں اور آرزوئیں اجازت دیسکیں صرف اسی حد تک باہمی ارتباط پیدا رہے۔ باقی تمام باتوں میں مصری اور یونانی ایک دوسرے سے بالکل علٰحدہ نظر آئیں اور یونانی فاتحوں کی فضیلت مصری مفتوحوں پر ایسی قائم رہے کہ مصریوں کو یونانیوں کے قریب آنے تک کی جرأت نہ ہو۔

اسمیں شبہ نہیں کہ مصر قدیم کے مذہب کو تسلیم کرنا اور اسکو محفوظ رکھنا بطلیموسیوں کیلئے لازمی تھا کیونکہ وہ فرعون مصر کے جانشین تھے۔ مگر انکی یہ کوشش عجیب تھی کہ اس پرانے سال خوردہ مذہب کا پیوند یونانیت کے نئے درخت میں اسطرح لگایا جائے کہ اس درخت کے پھل کا جو ذائقہ یونان میں تھا اسمیں فرق نہ آئے۔ اگر یہی کوشش تھی تو پھر اسمیں کامیابی کی صورت صرف اس طرح ممکن تھی کہ اسکندریہ - نوکراتیس - تلمائیس کے یونانی شہروں اور مقدونی یونانی قوموں کے صدر مقاموں کو جو سب مصر میں واقع تھے اپنی مقدونی یونانی شہنشاہی کا ایک حصہ سمجھ لیتے جسکی انتہائی حد بحر ایجین کے شمالی سرے تک گئی تھی۔ اس طریقہ سے مصر کی حکومت کو مستحکم رکھنے کا ذریعہ بہت اچھا حاصل رہتا۔ مگر بطلیموس ثالث نے اس ذریعہ کو اسطرح تلف کر دیا کہ جب ۲۴۲ سنہ ق م میں اسکا بیڑا غارت ہوگیا تو پھر اسنے اسکی جگہ دوسرا بیڑا تیار کرنیکی طرف توجہ نہ کی۔ اسکے علاوہ بیس برس تک اپنی فوجوں سے سوائے اسکے کچھ کام نہ لیا کہ وہ مصر میں بیٹھی کھیتی کیا کریں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجوں میں حس و حرکت کی قابلیت نہ رہی۔ حربی معاملات میں غفلت کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اسی زمانے میں بطلیموس ثالث کے دو حریف مقابل بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے کیونکہ

اسی بیس برس میں خانہ جنگی کی وجہ سے ایشیا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ اور یونان کی
سخت بغاوت نے مقدونیہ کے قومی اضمحل کر دئے تھے۔ مگر بطلیموس ثالث کی ان
غفلتوں کی سزا اُسکے لڑکے کو اٹھانی پڑی۔ اِس بادشاہ کو مجبوراً چھبیس ہزار مصریوں (۱۸۰)
کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا پڑا۔ انکو مسلح کیا اور مقدونی طریقے کے فوجی کام سکھائے
(۲۲۱–۲۱۷ ق م)۔ اور اِسطرح ایک سو ستر برس تک بطلیموسی شہنشاہی کی حفاظت کیگئی
لیکن جب مقدونیہ اور سوریہ کی سلطنتیں سنبھل گئیں اور انہوں نے ملکر حملہ کیا تو پھر
بطلیموسیونکی شہنشاہی گرداب فنا میں آگئی۔ مصریوں کو جرأت ہوئی کہ مصر کے انتظام
حکومت میں یونانیوں سے حصہ لینے کیلئے بزور شمشیر دعویٰ کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسے
دعوے کو یونانی کیونکر منظور کر لیتے۔ لیکن اب شہنشاہی ہاتھ سے جا چکی تھی اور
باہر کے لوگوں کا مصر میں آنا بند ہو گیا تھا۔ سلطنت صرف مصر پر محدود رہ گئی تھی۔
ایسی حالت میں بطلیموسیوں کو سوائے اسکے کیا چارہ تھا کہ مصریوں کے دعوے
کو انصاف پر مبنی سمجھکر تسلیم کرلیں۔

اب بطلیموسیوں نے اضلاع کی فوجوں میں مصریوں کو زیادہ بھرتی کرنا
شروع کیا۔ اور انکو پہلے کی بہ نسبت زمینیں بھی زیادہ دیں۔ غیر ملکی سپاہیونکی
زمینیں کم کرتے گئے۔ سپاہیوں کے مرنے یا بڈھے ہونے پر انکی زمینیں اُنسے
واپس نہ لیں۔ اور اگر اُنکے لڑکوں یا دیگر ورثائے ذکور نے فوجی خدمتیں قبول
کرلیں تو پھر ایسی زمینوں میں انکے موروثی حقوق مان لئیے۔ ان لوگوں کے
قبضہ میں جو اراضیات تھیں وہ خشک یا زیادہ مرطوب نہ تھیں بلکہ اچھی پیداوار
کی تھیں جن پر انکے باپ دادا اپنا سرمایہ اور محنت لگا چکے تھے۔ اب یہ سپاہی
وہ سپاہی نہ رہے جو لڑائی سے فرصت پاکر ریگزاروں کو شاداب یا زیادہ
مرطوب زمینوں کو بادشاہ کے فائدہ کیلئے قابل کاشت بنایا کرتے تھے بلکہ وہ
محض کسان اور کاشتکار رہ گئے جو فوجی خدمت سے بیزار رہتے تھے۔ اور
اس خدمت کو اپنے حق میں نقصان کا باعث سمجھتے تھے۔ یہ ہی اسباب تھے
جنھوں نے فوجوں کی حربی قوت زائل کر دی۔

یہ زمانہ مصر کی مالی خوشحالی کا نہیں بلکہ معاشی زوال کا تھا۔ شروع کے

(۱۸۱) بطلیموسیوں کی حکومت ضرور سخت تھی اور ملک کی آمدنی و خرچ سے جو کچھ بچتا تھا وہ شہنشاہی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔ لیکن واقعات نے ثابت کیا کہ اس سخت حکومت سے ملک کو جسقدر فائدہ پہنچا اس صرف سے اس قدر نقصان نہیں پہنچا۔ شہنشاہی میں جب ضعف آنے لگا تو حکومت کے انتظامی صیغوں اور پولیس کے محکمے اور فوجوں میں خاص مصری لوگ بکثرت داخل ہونے لگے جب اسطرح انکا رتبہ بلند ہوا تو پھر وہ یونانیوں میں جو ایک زمانہ میں انکے آقا اور مالک تھے شادی بیاہ کرنے لگے یہاں تک کہ ایک بڑا گروہ دوغلی نسل کا جو دو دو زبانیں بولتا تھا پیدا ہو گیا۔ اس دوغلی نسل کے لوگ ظاہری باتوں میں تو یونانی معلوم ہوتے تھے لیکن طبیعت و تعلیم کے اعتبار سے پولی بیوس انکی نسبت لکھتا ہے کہ یہ لوگ فلاحین مصر سے زیادہ رتبہ نہ رکھتے تھے۔ اس مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ " اسکندریہ کی آبادی کے تین طبقے ہیں۔ ایک طبقہ تو مصری اور ملک کے اصلی باشندوں کا ہے جو ذہین ہیں مگر (نا) شائستہ دوسرا طبقہ سپاہیوں کا ہے جو روزینہ لیکر ملازمت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بکثرت ہیں اور بڑے ظالم و جفاکار ہیں۔ ہتیار بند سپاہیوں کو روزینہ دیکر نوکر رکھنے کا طریقہ پرانے زمانے سے چلا آتا ہے۔ ان لوگوں نے بادشاہوں کی کمزوری کی وجہ سے حکم چلانا تو سیکھ لیا ہے لیکن حکم ماننا انکو نہیں آتا۔ تیسرا طبقہ اسکندریہ کے لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ بھی اُن ہی وجوہ سے جو اوپر بیان ہوئیں واقعی شائستہ نہ تھے لیکن پہلے دو طبقوں سے بہتر تھے۔ گو وہ دوغلی نسل کے تھے مگر انکے باپ دادا اصل یونانی تھے۔ ان میں وہ ہی باتیں چلی آتی تھیں جو یونانیوں کے ساتھ مخصوص تھیں۔ لیکن یہ لوگ اب بالکل ہی نظر نہیں آتے۔ بطلیموس یورگیتیس فسکن (۱۴۵-۱۱۶) نے (جسکے زمانہ میں پولی بیوس نے اسکندریہ کا سفر کیا تھا) انکو بالکل ہی غارت کر دیا۔ اس بادشاہ سے یہ لوگ باربار بغاوت کرتے رہے۔ یہانتک کہ بادشاہ نے اپنی فوجیں انپر چھوڑ دیں اور وہ سب ان فوجوں کے ہاتھ سے قتل ہو گئے۔ جب حالات کی صورت یہ ہو تو پھر ملک میں سیر و سفر کرنا ایک مدت تک خاک چھاننے کے برابر تھا جس سے

کچھ حاصل تھا نہ وصول " دوسری صدی قبل مسیح میں روما کی مجلس سینات
نے مصر کو بطلیموسیوں کے بیرونی دشمنوں سے بچائے رکھا۔ لیکن رومانیوں (۱۸۲)
کی یہ سرپرستی بجائے خود اسقدر خطرناک تھی کہ شاہانِ مصر کی ہمتیں پست ہوگئیں۔
اور اب انہیں ایسے تاجدار پیدا ہونے لگے کہ اگر زورِ بازو رکھتے تھے تو طبیعت
میں کوئی جوہر نہ تھا اور اگر طبیعت میں جوہر تھے تو زورِ بازو حاصل نہ تھا۔ یا
اونمیں چند عورتیں پیدا ہوئیں جو لائق اور حسین تھیں اور اکثر بھائی بہن کے باہمی
ازدواج سے پیدا ہوئی تھیں۔ مدتوں خاندانی فساد اور قومی نزاع رہا اور
ان سب کے بعد وہ عجیب و غریب زمانہ آیا جبمیں بطلیموس نے نواز اور کلیوپترا کبیر
نے تختِ مصر پر آخری جلوہ دکھایا۔

چھٹا باب

شاہانِ سلوقیہ (سلوکدی) کی شہنشاہی

اسکندر اعظم کے مفتوحہ ممالک زیادہ تر فارہ ایشیا میں واقع تھے جسوقت (۱۸۳)
سلطنت کے انتظام کیلئے اسکندر کے ورثا کی طرف سے چند ولی مقرر کئے گئے تو
اِن مفتوحہ ملکوں کو بیس ولایتوں میں تقسیم کرکے ہر ایک پر ایک حاکم مقرر کیا گیا۔ اس
انتظام کے دس برس بعد یعنی ۳۱۳ ق م میں ان ہی حاکموں میں سے ایک حاکم
تھا جسکا نام انتی گونس تھا اور جسکو تاریخ میں اکثر مون او فیتھلموس (یک چشم)
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ شخص اب دو برس سے کوہ ہمالیہ کی شمالی
مغربی شاخوں اور سمندر کے بیچ میں جسقدر ملک واقع تھے اُنپر حکومت کرتا تھا۔
اور بحر متوسط کا کل ایشیائی ساحل دردانیال سے لیکر مصر کی سرحد پر غزہ کے
مقام تک اسی کے قبضے میں تھا۔ اور اسکا جہازی بیڑا تمام سمندر پر حکومت
کرتا تھا۔

۳۱۲ قبل مسیح کا سال ایک نہایت نازک زمانہ تاریخ قدیمہ میں گذرا ہے
اُسوقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ انتی گونس کی ذات میں اسقدر اولوالعزمی اور تدبیر
و طاقت موجود ہے کہ کل اقلیم اسکندری پر اسکندر کی قائم مقامی فی الواقع
اُسکو زیب دینے والی ہے۔ انتی گونس کا لڑکا بھی جو اُسکا قوت بازو تھا ہر وقت
باپ کی مدد پر رہتا تھا۔ یہ بڑا جری و بہادر نوجوان تھا اور سب کو اپنی طرف
متوجہ کئے رہتا تھا۔ اسکا نام دیمی تریوس اور لقب پولی اور سیتیز یعنی "فاتح بلاد"
تھا۔ غرض تمام صورتیں ظاہر کر رہی تھیں کہ انتی گونس سے ایک خاندانِ شاہی کا
سلسلہ چلنا یقینی امر ہے۔

انتی گونس نے اس موقع پر ایک بڑا منصوبہ باندھا جسکی غرض ظاہر تھی اور جسکے
لئے حسب ضرورت پورا اہتمام بھی کر لیا گیا تھا۔ یعنی ایک سال پہلے سے یونان میں

شورش و بغاوت برپا کر کے انتی گونس نے اپنے بیڑے کو حکم دیا کہ دردانیال کی طرف کوچ کرے۔ اُدھر ایشیا کے ساحل پر لشکر پہلے سے ڈال رکھا تھا کہ بیڑے کے پہنچتے ہی یورپ میں اتر جائے اور تھریس اور مقدونیہ پر حملہ کر کے ان کو فتح کر لے۔ اس معرکہ میں سپہ داری کا کام انتی گونس نے اپنے ذمّے رکھا اور اپنے لڑکے دیمی تریوس کو تھوڑی سی فوج دیکر اس ہدایت کے ساتھ فلسطین روانہ کیا کہ خود کسی سے لڑائی نہ چھیڑے مگر اتنا انتظام رکھے کہ جبتک تھریس اور مقدونیہ کا معرکہ ختم نہ ہو لے بطلیموس کو مصر سے باہر قدم نہ نکالنے دے۔ انتی گونس نے سوچا تھا کہ اگر اس معرکہ میں خشکی پر شکست ہوگئی تو جبتک سمندر پر قبضہ قائم ہے اپنا کوئی بڑا نقصان نہیں اور اگر فتح ہوگئی تو پھر مصر پر کامیابی کے ساتھ حملہ کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا اور جب مصر پر بھی قبضہ ہوگیا تو گویا اسکندر کے تمام مفتوحہ ممالک اپنے ہاتھ آجائینگے اور اسکندر کی شہنشاہی جو اسوقت تقسیم ہوگئی ہے پھر یکجا ہو کر ایک سلطنت واحد کی صورت اختیار کر لیگی۔ یہ کل منصوبہ بڑی لیاقت اور عمدہ تدبیر سے سوچا گیا تھا اور افواج وعساکر کی تقسیم بھی مناسب موقعوں پر ایسی کی تھی کہ کامیابی کی پوری امید تھی۔

لیکن کامیابی تو درکنار یہ سب حسرتیں دل ہی میں رہیں اور کوئی بات وقوع میں نہ آئی۔ اسکی کچھ وجہ تو بطلیموس بادشاہ مصر ہوا کہ اُسنے خطرہ دیکھتے ہی مصریوں کو بھرتی کر کے اپنی فوج بہت بڑھائی اور کچھ وجہ دیمی تریوس ہوا جسنے باوجود کم فوج رکھنے کے اپنے باپ کی ہدایت اور فوجی افسرانِ ماتحت کی رائے اور مشورہ کے خلاف غزّہ کے مقام پر مصری فوجوں سے لڑائی چھیڑ دی اور اسمیں سخت شکست کھائی۔ پس انتی گونس کا یہ منصوبہ کہ پوری مملکت اسکندری کا تنہا تاجدار ہو جائے یونہی رہا اور اسکو ازسرِنو اختیار کرنے کیلئے سلوقس پسر انتی اوکس کی وجہ سے دوبارہ کوئی عمدہ موقع نصیب نہ ہوسکا۔ اِس واقعہ سے چار برس پہلے سلوقس جسکو ولایت بابل کی مسند حکومت ملی تھی انتی گونس کے خوف سے اپنا دارالحکومت چھوڑ کر مصر میں چلا آیا تھا لیکن جسوقت غزّہ پر انتی گونس کے لڑکے کو شکست ہوگئی تو سلوقس جو عمر میں کم مگر تجربہ میں پرانا ہوچکا تھا ایک ہزار سپاہ ہمراہ لیکر بابل کو واپس ہوا۔ اِن واقعات کے (۸۵
دس برس بعد یعنی سنہ ۳۰۲ ق م میں جب انتی گونس نے بطلیموس کو شکست دیکر مصر کی طرف ہٹا دیا تو پھر مقدونیہ اور تھریس کی فتح کا قصد کیا۔ مگر اسمیں بھی کامیابی نہوئی

اور اسکا سبب یہ ہوا کہ تھریس کے بادشاہ لائی سی میکس نے اپنی فوجیں پہلے سے ایشیائے کوچک میں پہنچادی تھیں اور سلوقس نے جو اسوقت انتی گونس کی عملداری کے عقب میں جس قدر ملک تھے انکا فرمانروا ہوگیا تھا اپنی فوجیں تیار کر کے لائی سی میکس کے لشکر سے جا ملائیں اور اسطرح سلوقس اور لائی سی میکس نے اپنے مجموعی لشکر سے ۳۰۱ ق م میں اپسوس کے مقام پر انتی گونس کو شکست دیدی۔

جب انتی گونس کی قوت ٹوٹ گئی تو سلوقس بابل سے اٹھکر بحر متوسط کے کنارے چلا آیا اور یہاں انطاکیہ کا شہر تعمیر کر کے اسکو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اور اسطرح اپنے مستقر کو ان علاقوں کے قریب کردیا جہاں سے یونان اور مقدونیہ کے لوگ ایشیا میں آباد ہونیکو آیا کرتے تھے۔ شاہان سلوقیہ اپنی سلطنت کی ابتدا اس زمانے سے قائم کرتے ہیں جبکہ سلوقس مصر سے واپس ہوکر بابل میں آیا ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سلوقیہ میں سلطنت اسوقت آئی کہ جنگ اپسوس میں انتی گونس کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ہرکیف اس خیال کی تائید میں بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

جنگ اپسوس کے بعد بیس برس تک (۳۰۱ - ۲۸۱) سلوقس کی خوش نصیبی تھی کہ وہ اپنی وسیع سلطنت پر جبکا اب وہ بادشاہ کہلایا جاتا تھا امن وعافیت سے قابض رہا۔ ۲۸۲ ق م میں بادشاہ تھریس سے کورو میدیون کے مقام پر ایک معرکہ ہوا جسمیں سلوقس کو پوری کامیابی ہوئی۔ لیکن اس فتح سے جو ملک ہاتھ آئے وہ اسکے مرتے دم تک قبضہ میں نہ رہ سکے۔ پھر بھی سلوقس نے ایک بڑی سلطنت اپنے لڑکے انتی اوکس اول کیلئے چھوڑی جبکا لقب سوتر (جہاں پناہ) تھا۔ اور ایسی ہی وسیع سلطنت انتی اوکس اول نے اپنے لڑکے انتی اوکس ثانی کیلئے چھوڑی جسکا لقب تھیوس (دیوتا) تھا۔ آخر زمانہ میں البتہ سلطنت کی سرحد پر بعض علاقے ہاتھ سے نکل گئے تھے مگر پھر بھی وسعت سلطنت بہت تھی۔ (۱۸۶)

جس صدی میں سلوقیہ کی شہنشاہی اپنے اوج کمال پر تھی اسوقت اس خاندان میں ایک عورت ایسی آئی جسنے سلطنت میں ضعف وانحطاط کی صورت پیدا کی۔ یہ عورت لاذقیہ (لایو ڈیکی) تھی جو بادشاہ انتی اوکس ثانی کی ملکہ اور اسکے جانشین سلوقس ثانی کی ماں تھی۔ سلوقس ثانی کا لقب کالی نیکس یعنی "فاتح کبیر"

تھا۔ (۲۴۶ - ۲۳۶ ق م) - تاریخ میں بہت سے حالات ایسے ملتے ہیں جن سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملکہ بڑی با اختیار اور اپنے شوہر انتی اوکس ثھیوس پر قابو یافتہ
تھی۔ چنانچہ سلطنت کے مختلف علاقوں میں جہاں ثھیوس بادشاہ وقت کی پرستش
کیجاتی تھی وہاں ملکہ کو بھی پوجا جاتا تھا۔ بلکہ بادشاہ کے حکم سے ملکہ کی پرستش کے واسطے
کاہنوں کی ایک مخصوص جماعت مقرر کیگئی تھی۔ مگر باوجود شوہر پر اسقدر اختیار اور
قابو رکھنے کے ملکہ لاذقیہ کو بادشاہ مصر بطلیموس فلادلفیوس کی بیٹی برنیس کیلئے اپنی
جگہ خالی کرنی پڑی۔ یہ واقعہ اسطرح پیش آیا کہ لاذقیہ کے شوہر ثھیوس نے مقدونیہ کے
بادشاہ سے پیمانِ دوستی کر رکھا تھا جو فلادلفیوس کے حق میں مضر تھا۔ فلادلفیوس
نے جو بڑا شاطر و چالاک تھا ثھیوس اور بادشاہ مقدونیہ کے باہمی اتحاد کو توڑنے
کیلئے یہ تدبیر نکالی کہ بہت کچھ ملکی رعایتیں کر کے اور بہت قیمتی جہیز دیکر اپنی بیٹی برنیس
کا عقد ثھیوس سے کر دیا۔ (۲۴۹) جب مصر کی یہ شہزادی ثھیوس کی ملکہ بنکر آئی
تو لاذقیہ ملکہ سابقہ انطاکیہ کو خیرباد کہکر ایشیا کوچک میں چلی آئی جہاں اسکی بہت بڑی
املاک تھی۔ یہ املاک کسی وقت میں بادشاہی صرف سے حاصل کیگئی تھی۔ یہاں پہنچکر
لاذقیہ بالکل شاہانہ کروفر سے رہنے لگی۔ اس علیحدگی کے تین برس بعد بادشاہ ثھیوس
قتل ہوگیا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ لاذقیہ کی سازش سے یہ قتل ہوا۔ مگر یہ خلاف
قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ثھیوس نے خود خاندانی معاملات کی پیچیدگیوں پر نظر
کر کے آخری وقت میں وصیت کر دی تھی کہ میرے مرنے پر میرا سب سے بڑا لڑکا
جو لاذقیہ کے بطن سے ہے اور جو اب جوان ہونیکو ہے میرا جانشین ہو۔ اس وصیت
سے صاف ظاہر ہے کہ اُسنے ملکہ برنیس کے لڑکے کو جو حال میں پیدا ہوا تھا اپنا (۱۸۷
جانشین نہیں بنایا۔ بلکہ یہ عزّت لاذقیہ کے لڑکے کیلئے مخصوص کی۔ پس کوئی وجہ
مخاصمت نہ تھی کہ اپنے شوہر ثھیوس کے قتل مین لاذقیہ شریک ہوتی۔ لاذقیہ کی نسبت
ایک الزام یہ بھی ہے کہ اسنے ملکہ برنیس اور اسکے بچہ کو قتل کروادیا تھا۔ مگر یہ الزام
کوئی الزام نہیں ہے کیونکہ اولاً تو لاذقیہ کو اپنی جان و مال کی حفاظت ضروری تھی
دوسرے یہ کہ سلطنت کی عزّت قائم رکھنے کا بھی پاس تھا کہ اگر برنیس کے نوزائیدہ
بچہ کو تخت مل گیا تو اسکے زمانہ نابالغی میں جو بڑی مدّت تک جاری رہتا شاہانِ مصر

دولت سلوقیہ کو اپنی ہی سلطنت کا ایک حصہ تصور کرتے تھے۔ لاؤدیقیہ اپنے لڑکے کیلئے کہ باپ کا جانشین رہے بادشاہ مصر بطلیموس ثالث سے برابر لڑتی رہی۔ شروع میں بہت نقصان اٹھائے مگر آخر کار کامیاب ہوئی۔ اس ہوشیار ملکہ کی یہ ہمت وتدبیر لایق اعتراض نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ البتہ جسوقت اسکا لڑکا باپ کے تخت پر بیٹھ لیا تو پھر وہ سیاسی و مادری جرائم کی ضرور مرتکب ہوئی۔ جسوقت اُسکا بڑا لڑکا سلوقس ثانی تخت نشین ہوا تو وہ پورا جوان نہ تھا۔ سلطنت کا کاروبار ماں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جب پوری جوانی کو پہنچا تو ماں کے ہاتھ سے کام نکالنے کی دھمکی دی۔ ماں کو بیٹے کی یہ حرکت ناگوار گذری اور اُسنے اپنے چھوٹے بیٹے کو اُسکے بڑے بھائی کا دشمن بناکر آخر کار ایشیاکوچک کی حکومت اسکو دلوادی۔ اس چھوٹے بیٹے کا نام انتی اوکس اور لقب ہائی رکس (طغرل) تھا۔ اب سلوقیہ کے خاندان میں نفاق نے گھر کر لیا۔ بیس برس تک (۲۴۲-۲۲۳) آپسمیں خانہ جنگی ہوتی رہی جسکی وجہ سے سلطنت میں ضعف آیا۔ اور دول خارجہ سے جو معاملات درپیش تھے انمیں غفلت کیوجہ سے سوئے تدبیر ظاہر ہوئی۔ سلطنت کے چند شمالی حصے بھی ہاتھ سے نکل گئے اور باقی علاقوں میں بغاوت وفساد نمودار ہوا۔ انتی اوکس ثالث کا زمانہ ایک غلطی سے شروع ہوا اور ایک خرابی پر ختم ہوا۔ غلطی شروع میں تو یہ ہوئی کہ سلطنت کے معاملات خانگی ابھی اچھی طرح سلجھے نہ تھے کہ معاملات خارجی کو طے کرنا چاہا اور آخر میں خرابی یہ ہوئی کہ ۱۹۰ ق م میں میگنیشیا کے مقام پر رومانیوں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ انتی اوکس ثالث کے آغاز جلوس اور اس شکست کے زمانے تک جو مدت گذری اسکی نسبت مورخ بیوان
اپنی کتاب "دودمان سلوقس" میں لکھتا ہے کہ "اس زمانے میں انتی اوکس ثالث نے (۱۸۸)
وہ تمام ملک جو سلطنت کی جان تھے اور سلطنت کی حدود سے باہر جسقدر علاقے شاہان سلوقیہ کے قبضہ میں پہلے کسی زمانے میں رہ چکے تھے اُن سب کو پھر حاصل کیا۔ سلطنت سے باہر جو علاقے ہاتھ سے نکل گئے تھے اُنکو دوبارہ اسطرح حاصل کیا کہ آرمینیہ۔ پارتھیا۔ باکتریا (بلخ) اور ہند کی ریاستوں سے بہت کامیابی اور اثر کیساتھ ہنگامہ کارزار گرم کیا۔ آرمینیہ میں اس وقت زرکسنز جو نام ہی سے ایرانی معلوم ہوتا ہے بادشاہی کرتا تھا پارتھیا میں ارساکینز کی حکومت تھی یہ دشت توران کے

ایک وحشی خاندانِ شاہی کا تیسرا بادشاہ تھا۔ یہ خاندان اِسوقت کچھ کم چالیس برس سے اِس ملک پر مسلط تھا۔ باکتریا (بلخ) میں اس زمانہ سے پچاس برس پہلے ایک یونانی خاندان جسکا بانی دیودوتس تھا حکمرانی کرتا تھا۔ اِس بانیِ خاندان کی نسبت بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ولایت بلخ میں ایک ہزار شہروں کا مالک تھا۔ لیکن اسوقت ایک دوسرا یونانی خاندان اِس ملک پر مسلط تھا جسکا بانی میگنیشیا کا ایک نووارد یونانی ہوا تھا جسکا نام یوتھی دمس تھا۔ ہند میں ایک شخص سفراگیسی نوس بادشاہ تھا جسنے لڑائی کے بعد شاہانِ سلوقیہ کی صولت وسطوت کو تسلیم کیا اور ارساکیز والیِ پارتھیا اور یوتھی دمس والیِ بلخ نے بھی اسکی مثال کی پیروی کی۔

بلادِ مشرق میں پانچ برس تک (۲۱۰۔ ۲۱۵) معرکہ آرائی کرنیکے بعد جبوقت انتی اوکس انطاکیہ کو واپس آیا تو فلسطین پر چڑھائی کرکے اسکو فتح کر لیا۔ یہ ملک اسوقت تک مصر کے بطلیموسی بادشاہوں کے قبضہ میں تھا۔ لیکن انکی گرفت اس ملک پر اب کمزور ہو چلی تھی۔ اس فتح سے انتی اوکس کی رسائی سمندر تک ہوگئی۔ اور یہ وہ چیز تھی جسکی کئی عرصہ سے چلی آتی تھی اور جسکی مدتوں آرزو کیگئی تھی اور جسکے لئے بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ اب سلوقیہ کی تاریخ میں سب سے پہلا موقع آیا کہ وہ ایک بیڑا جنگی جہازوں کا تیار کریں۔ مگر اسی زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ فیلقوس بادشاہ مقدونیہ کانوکفالی کے میدان میں رومانیوں سے شکست کھا گیا۔ (۱۹۷) یہ دیکھکر انتی اوکس اپنا بیڑا لیکر بحرِ متوسط میں اس غرض سے گیا کہ ایشیا ئے کوچک کے ساحل کے سامنے جو غیر ملک والے اپنے جہازوں کو گشت دیتے پھرتے ہیں اُنکو سمندر سے نکال دے۔ اِسی کوشش میں سرگرم تھا کہ ۱۹۲ ق م میں رومانیوں سے جھگڑا ہو گیا۔

انتی اوکس اعظم کو اسکے اچھے برے کاموں کا صلہ مورخوں کے ہاتھوں دیر میں ملا۔ (۱۸۹
دولت قرطاجنہ کا مشہور سپہ سالار ہنابعل جس نے رومانیوں سے بڑے بڑے معرکے کئے تھے اور آخر میں ناکامیاب رہا تھا دشمنوں کی عداوت سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ یہانتک کہ شام میں آکر انتی اوکس کی ملازمت اختیار کی انتی اوکس سے رومانیوں کا نزاع تو شروع ہو ہی چکا تھا ہنابعل نے بادشاہ کو صلاح دی کہ ایطالیہ کے قریب جاکر اس قوم سے لڑنا چاہیے۔ مگر بادشاہ نے اس مشورہ کو پسند نہ کیا

اور جنگی بیڑے کے ایک حصہ پر جو نہایت عجلت میں تیار ہوا تھا حنا بعل کو جو سمندر پر لڑنے کے فن میں یکتائے روزگار تھا امیر مقرر کیا۔ ان دونوں باتوں کا علم ہوتے ہی اس میں ذرا کلام نہیں رہتا کہ اس معرکہ میں انتی اوکس کی شکست اسی کی غلطی کا نتیجہ تھی۔ اس مضمون میں جسقدر تنقیحات قائم کرکے حالات تحقیق کیئے جاتے ہیں اُنسے معلوم ہوتا ہے کہ حنا بعل نے رومانیوں کی طاقت کا اندازہ بالکل صحیح کیا تھا اور یہ خیال بھی بالکل درست تھا کہ رومانیوں کی طاقت توڑنے کیلئے بحر متوسط کی جملہ ریاستوں کا متفق ہوکر مقابلہ پر آنا ضروری تھا لیکن اسکے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ان ریاستوں کا متفق ہونا ایک امر محال تھا۔ غرض جو صورت واقعات اسوقت تھی وہ ایسی تھی کہ انتی اوکس کو رومانیوں سے دست وگریباں ہونا پڑا اور اُسنے چند سرحدی علاقوں کے لالچ میں اور اس شوق میں کہ یونانی ریاستوں کی سرگروہی حاصل ہوجائیگی اپنا پورا سرمایہ اس بازی میں لگادیا۔ سلطنت روما کی طاقت کا اندازہ جسقدر وہ تھی اس سے کم کیا اور روما کی مجلس (سینات) جس سرگرمی کے ساتھ اپنے ارادوں میں پختگی و پامردی رکھتی تھی اسکو بھی اچھی طرح نہیں سمجھا۔ جسوقت یونان میں اسکی ہراول فوج کو رومانی فوجوں نے پسپا کردیا تو پھر ایشیا کوچک کے بچانے کیلئے سوائے جہازی بیڑے کے اور کوئی چیز انتی اوکس کے پاس نہ رہی۔ سمندر میں بیڑے کی افسری پر حنا بعل کا مامور ہونا نہایت موزوں و مناسب تھا۔ لیکن بیڑا بالکل نیا اور کمزور تھا اور جنگی جہاز جا بجا ایسے منتشر تھے کہ سب ملکر بھی رومانیوں کو یورپ ہی میں نہ روک سکے۔ اور جسوقت یہ رومانی محاربات قرطاجنہ کے سورما دردانیال عبور کرکے ایشیا میں اتر لیئے تو پھر ایشیا میں کوئی لشکر ایسا نہ تھا جو اُنکے سامنے ٹھیر جاتا۔

(۱۹۰) خاندان سلوقیہ کے دو بادشاہوں کو تھرموپلی اور میگنیشیا کے میدان جنگ میں سخت نقصانات اُٹھانے پڑے جنمیں سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ ایشیا کی قوموں نے ان بادشاہوں کی ذلت و ناکامیابی دیکھ لی اور انتی اوکس کو مجبور ہوکر رومانیوں کی سخت شرائط منظور کرکے صلح کرنی پڑی۔ ایشیا کوچک کے کل مقبوضات سے دست برداری کی۔ اور بارہ برس تک ہر سال ایک ہزار ٹیلنٹ (تقریباً بتیس ہزار روپیہ) زرتاوان دینے کا وعدہ کیا۔ اپنے کل جنگی جہاز رومانیوں کے حوالے کرنے منظور کیئے اور جہازی بیڑے میں صرف دس کشتیاں اور انکے چلانے کیلئے ایک قلیل جمعیت رکھنے کی اجازت ملی۔

لڑائی کے ہاتھی جسقدر تھے انکو خارج کرنے اور آیندہ کام میں نہ لانے کی شرط منظور کی۔ اور اسکا بھی وعدہ کیا کہ آیندہ ایطالیہ کے باشندوں کو تنخواہ دیکر فوجوں میں بھرتی نہ کیا جائیگا اور ریاست رودس کے سوداگروں اور تاجروں کو اپنے شہروں میں آنے سے نہ روکینگے۔ غرض اِن باتوں سے ایشیا کی قوموں کو معلوم ہو گیا کہ دُنیا میں اب مقدونی سطوت و اقتدار کے دن پورے ہوئے۔

انتی اوکس ثالث کے زمانے تک تو پھر بھی سلطنت کی شکل قائم رہی لیکن جب اسکے لڑکے انتی اوکس چہارم اپی فانیز (اوتار) کا زمانہ آیا تو ۱۶۴ء ق م میں سلطنت پر پوری تباہی آگئی۔ سلوقیہ کی شہنشاہی کو غارت کرنیکے لئے دو قسم کی زبردست قوتوں سے کام لیا گیا۔ انمیں ایک قوت کو اندرونی کہنا چاہئے اور دوسری کو بیرونی۔ بیرونی قوت کا ذکر ابھی ہو چکا ہے یعنی رومانیوں نے بلاد مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا اور روما کی مجلس (سینات) نے اپنا منشاء اصلی یہ قرار دے لیا کہ جسطرح ہو سلوقیہ کی طاقت اسقدر سلب کر لیجائے کہ پھر وہ کسی کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس مقصد کو رومانیوں نے طرح طرح کی چالوں اور ترکیبوں سے حاصل کرنا چاہا۔ انتی اوکس چہارم کے مرتے ہی رومانی مجلس (سینات) نے اپنے چند اراکین کو شام میں بھیجا۔ انھوں نے جنگ میگنیشیا میں جو شرائط ہوئی تھیں انکا مطالبہ کیا اور انہیں سے بعض شرائط کے ایفا نہ ہونیکی پاداش میں سلوقیہ کے تمام جنگی جہازوں کو جو فنیشیا کے ساحلی شہروں کے سامنے ابتک موجود تھے جلا دیا۔ اور لڑائی کے ہاتھی جسقدر شاہی فیل خانوں میں ملے انکو لنگڑا کر دیا۔ سلوقیہ کے فوجی محکموں اور سررشتوں میں جہانتک ممکن ہوا تخفیف و تنسیخ کرکے ہر طرح سے انکی قوت کو مٹایا۔ مگر دشمن کو اسقدر معذور کرنے پر بھی انکو صبر نہ آیا اور ملک میں جسقدر قومیں سلوقیہ سے منحرف تھیں انکو بغاوت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ سب سے بڑھکر مثال یہودیوں کی موجود ہے۔ ۱۶۴ء اور ۱۲۰ء ق م کے درمیان یہودیوں کے بادشاہوں یوداس اور یوناتان مقبی (میکابیوس) اور بادشاہ ہرقانوس اوّل نے شاہان سلوقیہ سے بار بار سرکشی کی اور ان موقعوں پر جب کبھی ان یہودی بادشاہوں نے روما سے امداد طلب کی روما نے بلا تامل امداد دی۔ اور سلوقیہ کے مقابلہ میں ہر طرح پر انکے حقوق کو تسلیم کیا۔ ان یہودی بادشاہوں کی بغاوت کی ایک وجہ قومی حمیت بھی ضرور تھی۔ اور مقابلہ کے وقت جان نثاری کیلئے مذہبی غیرت بھی ہر وقت دلوں کو

ادبھارتی رہتی تھی۔ مگر باوجود اسکے اگر پہلے سے انکو اسکا یقین نہ دلادیا جاتا کہ سلوقیہ کے اطاعت سے باہر ہونے میں جسقدر سرگرمی وہ دکھار ہے ہیں اسمیں رومانیوں کو اونکے ساتھ پوری ہمدردی ہے تو پھر یہ امر بہت مشتبہ تھا کہ یہودی اپنی کوششیں جاری رکھکر کامیابی کے ساتھ انکو ختم کرلیتے۔ سلوقیہ کی سلطنت کو غارت کرنے میں رومانی مجلس (سینات) نے ایک دشمنی یہ اور کی کہ جب سنہ ۱۵۲ ق م میں پرگامم اور مصر کی حکومتوں نے کوشش کرکے سلوقیہ میں خانہ جنگی کرادی تو روما کی مجلس (سینات) بھی ان دونوں حکومتوں کے ساتھ ہوگئی۔ اور اس خانہ جنگی کی آگ کو اپنی طرف سے بھی باربار تیز کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تا انقراض حکومت ۹۰ برس تک اس سلوقی خاندان میں لڑائیاں اور فساد برپا رہے اور وہ سلطنت جسکا پہلے کیا کچھ اقتدار تھا اب معلوم ہوتا تھا کہ ایک ٹوٹے ہوئے جہاز کیطرح قزاقوں کے سمندر میں پڑی ہے اور جہاز کے ملازم و ملاح تک اپنے ناخدا سے برگشتہ ہیں کہ اتنے میں روما کا سپہ سالار پومپی فتح کرتا ہوا موقع پر پہنچتا ہے اور اس ٹوٹے ہوئے جہاز کو گھسیٹ کر روما کے حیطہ پناہ میں لے آتا ہے۔

اب رہی بیرونی قوت جسنے سلوقیہ کی حکومت کو جو بڑی شان سے تسخیر ممالک پر کمر باندھ کر اٹھی تھی اس منزل ذلت وخواری کو پہنچا دیا وہ ایشیا کے انتہائے مشرق سے ایک طوفان بلاخیز کی صورت میں اٹھی۔ میں اس طوفان عظیم میں نہ تو اس واقعہ کو شامل کرتا ہوں کہ سنہ ۱۴۲ میں پارتھیا کی ریاست نے جو سلوقیہ کی محکوم تھی اپنے بادشاہ سے بغاوت کرکے اور اپنی مغربی سرحد کو رود فرات تک وسیع کرکے ایک یونانی طرز کی حکومت جس کو (۱۹۲)
مغربی ایران کی سلطنت کہا جاتا تھا سلطنت سلوقیہ کے عقب میں ایسی زبردست قائم کرلی تھی کہ جب رومانیوں نے ایشیا پر بادشاہی کا دعوی کیا تو وہ کسقدر کامیابی سے ان کے مقابلہ پر آئی اور نہ میں اس واقعہ کو شامل کرتا ہوں کہ آرمینیہ کی حکومت سلوقیہ کے تحت سے قطعی آزاد ہوگئی تھی اور اپنے بادشاہ تگرانیس اعظم کے دور میں اسنے کچھ مدت کے لئے (۸۳ - ۶۹ ق م) سلوقیہ کے پاس جسقدر ملک رہ گیا تھا اسکو بھی اپنی عملداری میں شامل کرلیا تھا کیونکہ یہ جسقدر واقعات ہیں انکو میں اندرونی فتنہ وفساد کے زمرہ میں جیسے کہ یہودیوں کی بغاوت بھی شمار کرتا ہوں۔ بیرونی قوت کا یہ طوفان دراصل ملک چین میں دریائے ہوانگ ہو کے کناروں سے اٹھا۔ دوسری صدی قبل مسیح کے شروع زمانہ میں

اِس سرزمین کی قومیں مغرب کی طرف بڑھنی شروع ہوئیں اور یہ اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں
ملک ایطالیہ کے دریائے ٹائبر سے رومانی سلطنت کی طاقت مشرق کی طرف رجوع ہوئی۔
مشرق سے جو گروہ اٹھے انہیں انڈو یورپین نسل کی بہت سی قومیں مخلوط تھیں جنکو اہلِ چین
یوچی کے نام سے پکارتے تھے۔ مغرب کی طرف بڑھنے میں قوموں کا یہ عظیم الشان قافلہ مشرقی
ترکستان کے اُس صحرا کے کنارے چلا جس میں بڑے بڑے ریگزار پڑتے ہیں اور جنہیں دریائے
ترِم جسکا منبع آجتک کسی کو دریافت نہیں ہوا بہتا ہے۔ یہ قومیں فتح کی غرض سے نہیں
بڑھی تھیں، بلکہ قوم ہوانگ نو یا ہونی کے خوف سے انھوں نے اپنا وطن چھوڑا تھا۔
ہوانگ نو دراصل یوچی کے ماتحت تھے۔ لیکن حال میں شمالی چین پر قبضہ رکھنے کیلیے
دونوں میں لڑائی ہوئی تھی جسمیں یوچی کو شکست ہوگئی اور اُنکو وطن چھوڑکر مغرب کی طرف
کوچ کرنا پڑا۔ یہ ہوانگ نو ہی کی قوم تھی جسکے خوف سے تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں
شہنشاہ چین چی ہوانگ اور فغفور وائی نے جو تسین اور ہان کے شاہی خاندانوں سے تھے (۱۹۳)
دشت گوبی کے مغرب میں وہ دیوار بنوائی جسکو لائمز یا چینی دیوار کہتے ہیں۔ ۱۵۹ ق م
میں یوچی صغدانیہ (بخارا و ترکستان) پر قابض ہوگئے۔ اسکے بیس برس بعد (۱۳۹
ق م) انھوں نے یونانی سلطنت باکتریہ (بلخ) کا قلع قمع کردیا۔ چنانچہ اسکے بعد
سوائے وادی سندھ کے اور کہیں اس وسیع اقلیم میں یونانی بادشاہیاں باقی نہ رہیں۔
اور یہ بادشاہیاں بھی ولادت مسیح کا زمانہ شروع ہوتے ہی یوچی کے قبضہ میں آگئیں۔
اب اس قوم کا نام یونانیوں نے اندوسِتھین رکھدیا تھا۔ صدیوں تک پہلے اس قوم
نے اور پھر ہوانگ نو نے جو پانچویں صدی قبل مسیح میں اندوسِتھین کے بعد آئے اور
پھر ترکوں نے جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوانگ نو کے بعد آئے، تجارت کے ان راستوں
کو کھلا رکھا جن سے یوچی یا اندوسِتھین قوم نے ہوانگ نو کے خوف سے شروع میں مغرب
کی طرف کوچ کیا تھا۔ یوچی کے بعد جو قومیں مشرق سے مغرب کی طرف آئیں انھوں نے
ایران کے مذہب مانویہ کو جو ایران میں بہت زور پکڑ گیا تھا سرحدِ چین تک پھیلا دیا۔ پھر
بودھ مذہب کو شائع کیا۔ اور صرف یہ ہی کام نہیں کیئے بلکہ اِن باتوں سے پہلے اور انکے
ساتھ ساتھ یونان کے فنون اور حرفوں کی خالص اور بگڑی ہوئی دونوں صورتوں سے
اہلِ چین کو آشنا کرادیا تھا۔ ڈاکٹر سٹائن حال میں ختا کے برباد شہروں سے بڑی بڑی نادر چیزیں

چن کر لائے ہیں۔ ان میں چند گلی مہریں ہیں جو تیسری صدی عیسوی کی چند دستاویزات پر آویزاں تھیں۔ یہ مہریں بنیا کے ضلع سے جو اسوقت چین کی عملداری میں شامل تھا دستیاب ہوئی ہیں۔ انکی نسبت قیاس کیا گیا ہے کہ وہ باکتریا (بلخ) کے پہلے یونانی بادشاہ دامودوتس
کیلئے تیار کیگئی تھیں۔ باقی مہروں پر اتھینا ایلکس وپیچا کی تصویر ہے کہ پرومکس اتھینا (194)
دیبی کیطرح سر پر خود رکھے کڑک بجلیاں گرا رہی ہے۔ اس تصویر کو مقدونیہ کے شاہان انٹی گونی اور ہندوستان کے یونانی بادشاہ اپنے سکوں پر بنایا کرتے تھے۔ آجکل یہ خیال کیا جاتا ہے اور اس خیال کی معقول وجہ بھی ہے کہ چین وجاپان کی صنعت یورپ اور امریکہ کی صنعت کی طرح یونانی الاصل ہے۔ مگر غور کیجئے تو یہ بھی ایک عجیب منظر ہوگا کہ یونان کی موج تمدن دونوں طرف بہکر ان چشموں تک پہنچ جاوے جن میں ایک نے مغرب میں ایطالیہ سے اور دوسرے نے مشرق میں چین سے ادبل کر شاہان سلوقیہ کی وسیع مملکت کو سیل فنا میں غرق کر دیا۔

سلوقیہ کی ملکی تاریخ اس حد تک بیان کرکے اب میں اس شاہی خاندان کے اندرونی مصالح ملکی اور بیرونی امور سیاسی کا ذکر کر کے اس باب کو ختم کر دونگا۔ اور یہ بھی بتانا پڑیگا کہ اسکندر اعظم نے جب کام کو شروع کیا تھا اسکو سلوقس اول اور اسکے جانشینوں نے جاری رکھا یعنی متعدد آزاد شہری ریاستیں ایشیا میں قائم کرتے رہے۔ اور ان بادشاہوں کو کاہنوں اور موبدوں اور ہیاکل سے متعلق خدام کی جماعتوں اور بڑے بڑے تعلقداروں اور جاگیرداروں اور ان لوگوں سے جو شاہی زمینوں پر آباد کیئے گئے تھے کام پڑا۔ مگر ہر صورت میں انھوں نے ان زمینوں کو جو کسی شہری ریاست کو تفویض ہوئیں تھیں اپنے اختیار سے باہر نہ ہونے دیا۔ میں یہاں مختصر طور پر شہری ریاستوں کی اندرونی دستور یعنی انکی حکومت کی ساخت وترکیب کو بھی بیان کر دونگا۔ اور کسیقدر تفصیل سے یہ بھی لکھونگا کہ ان ریاستوں کو اصولی یا عملی طور پر بادشاہ وقت سے کس قسم کا تعلق اور واسطہ تھا۔ ان بیانات کو ختم کرنے کے بعد انٹی اوکس چہارم کی پالیسی بیان کرونگا جسکے دور حکومت میں سیاست داخلی وخارجی دونوں اپنے حد کمال کو پہنچی تھیں۔

جسوقت اسکندر اعظم نے اپنا یہ مقصد ظاہر کر دیا کہ وہ مقدونیہ۔ یونان اور ایران (195)
کی قوموں کو ملا کر ایک نئی قوم جو دنیا میں ہر مقام کو اپنا وطن سمجھے تیار کریگا تو غالباً سلوقس اول

اسکندر کی خدمت میں زیادہ تقرب حاصل ہوگیا ہوگا اور اسکندر اپنے اس سپہ سالار کی زیادہ قدر کرنے لگا ہوگا۔ یورپ اور ایشیا کی قوموں کو آمیز کرنیکا خیال ایسا تھا جس پر اسکندر کے اراکین دولت کو سخت اختلاف تھا۔ چونکہ اسی زمانہ میں سلوقس کو ترقی ہوئی تھی اسلیئے قیاس ہوتا ہے کہ سلوقس اس بارے میں اسکندر کا ہم خیال تھا۔ اور یہ امر اس واقعہ سے اوبھی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ جب اسکندر کے مرنے پر وراثت کا جھگڑا اٹھا تو سلوقس نے ان لوگوں کا ساتھ دیا جو سلطنت کو اسکندر کے خاندان میں قائم رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سلوقس برابر اسی مقصد کے حاصل کرنے میں سرگرم رہا۔ مگر جب دیکھا کہ اس نزاع میں زیادہ مبتلا رہنے سے سوائے اسکے کچھ نہ ہوگا کہ بغیر کوئی بڑا کام دکھائے موت کے حوالے ہونا پڑیگا تو وہ ولایت بابل کو جسکی سند حکومت اوسکو ملی تھی روانہ ہوگیا۔

اسکندر کے مقدونی سپہ داروں میں سلوقس ہی ایک ایسا افسر تھا جس نے اسکندر کی موت کو اس بات کا پیغام نہ سمجھا کہ یونانی سپہ سالار جنکی شادیاں ایرانی شہزادیوں سے ہوئی تھیں اپنی بیویوں سے قطع تعلق کرلیں۔ اسکندر کی موجودگی میں سوسہ کے شہر میں جو شادیاں بڑی دھوم دھام سے رچی تھیں انہیں شہزادی افاما بادشاہ بلخ سپتامنیس کی بیٹی سلوقس کے عقد میں آئی تھی۔ اس بیوی سے سلوقس کا فرزند انتی اوکس اول پیدا ہوا جو سلوقس کے بعد اسکا جانشین ہوا۔ اسلیئے سمجھنا چاہیئے کہ سلوقس نے جس شاہی خاندان کی بناڈالی وہ شروع ہی سے نصف یونانی اور نصف ایرانی تھا۔ چونکہ ایشیا کی قوموں میں یونانی خصائل وعادات پیدا کرنیکا طریقہ اس خاندان نے انتی گونس اور اسکندر سے ورثہ میں پایا تھا اور اپنے افسر دودمان وبانی خاندان سلوقس کا عملدرآمد بھی اسی طریقہ پر دیکھا تھا اس لیئے شاہان سلوقیہ نے اس مسلک کو ایک مدت تک پیش نظر رکھا اور انتی اوکس چہارم کے انتقال کے بعد جو ۱۶۴ء ق م میں پیش آیا انکی کوششیں ہمیشہ اسی طرف رجوع رہیں کہ ایشیا کو یونان کا خطہ بنادیں۔

(۱۹۶) یونانی طرز کی شہری ریاستیں جو سلوقس اول نے اپنی قلمرو میں قائم کیں انکی تعداد مورخ ایپیان نے اونسٹھ لکھی ہے۔ یہ شہر اور انکی ریاستیں خاصکر ملک شام کے اس علاقہ میں تھیں جو رود فرات اور بحر شام کے بیچ میں پڑتا تھا تو اس کل علاقہ کو سلوقس اول نے دوسرا مقدونیہ بنانے کی کوشش کی۔ اسکے فرزند انتی اوکس اول نے جسکو ۲۹۳ ق م میں

سلطنت کے مشرقی علاقوں کی حکومت باپ کی طرف سے ملی تھی کوشش کی کہ ان علاقوں میں بھی یونانی طرز کے شہر بنا کر انکو ترقی دے ۔ اور اسی بادشاہ اور اسکے فرزند انتی اوکس ہتیوس کی توجہ اور سرگرمی سے ایشائے کوچک کے اندرونی حصوں میں یونان کی شہری معاشرت کا لوگوں میں رواج ہوا ۔ اور انکی عملداری کے اس حصہ میں جو ایشیائے کوچک سے شروع ہو کر یونانی مقبوضات کی پشت سے گذرتا ہوا انتولیا کے ساحل تک چلا گیا تھا بیسیوں نئے شہر ان دونوں بادشاہوں کی توجہ سے تیار ہو گئے ۔ تعمیر بلاد کا یہ سلسلہ انتی اوکس ثانی کا دور ختم ہونے پر بھی جو سنہ ۲۴۶ ق م میں پیش آیا بند نہیں ہوا ۔ گو اس زمانہ میں اسکی طرف توجہ کسی قدر کم ہو چلی تھی مگر اسکے دو پشتوں بعد یعنی انتی اوکس چہارم کے زمانہ میں پھر نئے شہر تعمیر کرنے کی طرف توجہ ہوئی اور علاقہ فلسطین میں جو حال میں سلاطین سلوقیہ کے قبضہ میں آیا تھا نئے شہر تیار کیے گئے ۔

سلوقیہ کے داخلی مسلک سیاسی کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہیلاس (یونان و مقدونیہ) کے شہری طرز معاشرت کو ایشیا میں منتقل کرنا چاہتے تھے ۔ حکیم ارسطاطالیس و اسکندر اور غالباً پولی بیوس بلکہ تمام اہل یونان کے اس خیال سے انکو بھی اتفاق تھا کہ جو لوگ شہروں میں نہیں رہتے وہ بالکل ناشایستہ و غیر متمدن ہوتے ہیں ۔ چنانچہ اسی خیال کی بنیاد پر انھوں نے اپنی عملداری میں یونانی وضع کے لیئے شہر آباد کر کے تمدن کی روشنی پھیلانی چاہی ۔

شروع شروع میں جسوقت مقدونیہ والوں کا قبضہ ان ملکوں پر ہوا جو بعد کو شاہان سلوقیہ کی قلمرو میں شمار ہوئے اسوقت ان ملکوں کی سیاسی حالت کیا تھی اس کا صحیح صحیح نقشہ ذہن میں اترنا آسان نہیں ۔ اتنا ضرور ہے کہ ایسے شہر جن سے یونانیوں کے
نزدیک شہر مراد ہو سکتی تھی ان ملکوں میں موجود نہ تھے ۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ (۱۹۷)
ان ملکوں میں شہر موجود ہی نہ تھے ۔ اگر بابل ۔ سوسہ ۔ ہگمتانہ (ہمدان) ۔ پرسی پولس ۔ (اصطخر) سے جو کہ مرکز حکومت رہ چکے تھے قطع نظر کیجا دے تو بھی اور بہت سے شہر ان ملکوں میں موجود تھے ۔ مثلاً شام میں دریائے فرات سے چودہ میل کے فاصلہ پر بمبائکی کا پرانا شہر تھا ۔ یہاں ایک نہایت شاداب و سرسبز گھاٹی میں شامی دیبی اتارگیتس کا بت خانہ تھا ۔ یہ مقام عجیب و غریب تھا ۔ مصنف لوسیان کی کتاب جنکی نظر سے گذری ہو گی انھوں نے پڑھا ہو گا کہ اس بت خانہ تک پہنچنے کی راہیں اور روشیں

کیسی عریض تھیں۔ جا بجا پتھر کے لنگم (فالی) جو پھل لاٹھ کی وضع کے نصب تھے۔ جا بجا
بچھی بھون جو بہت پوتر سمجھے جاتے تھے واقع تھے۔ بت خانہ میں ایسی رسومات ادا کیجاتی تھیں
جنکو لکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ بت خانہ کے پروہت خنثیٰ ہوتے تھے۔ یہ صرف
پوجا کے متعلق ہی خدمات انجام نہ دیتے تھے بلکہ اپنے ناپاک مذہب کی اشاعت دُور دُور تک
کرتے تھے۔ اور بت خانہ کے متعلق جو ایک انبوہِ کثیر لونڈی غلاموں (ہیرودلی) کا ہوتا تھا
ان پر حکومت بھی کرتے تھے۔ یہ غلام قرب و جوار کی زمینوں میں جو بت خانہ کی املاک سے
ہوتی تھیں کھیتی کرتے تھے اور اسکی آمدنی سے خود انکا گذارہ اور بت خانہ کے مصارف
چلتے تھے۔ مذہبی طریقے کے ان مقامی انتظاموں کو جو مدت سے چلے آتے تھے ایرانی
فرمانرواؤں نے بہت احتیاط سے برقرار رکھا تھا۔ اسی طریقہ سے یہودیہ میں بھی عمل کیا گیا
تھا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ جسوقت یہودیہ میں جدید انتظام قائم ہوا تو کل مخلوق
بیت المقدس کے احبار اور قوم کے سرداروں اور بنی لاوی کی سپردگی میں دیدی گئی اور شریعت
موسوی کے نام سے جو قانون تھا وہ کل یہودی رعایا کیلئے قانون دیوانی و فوجداری قرار پایا
یہ ہی طریقہ مقدونیہ والوں نے بھی ایشیائے کوچک میں اختیار کیا۔ استرابو نے کپادوسیہ کے
علاقہ کومانا میں شہر ما کے جو حالات لکھے ہیں قریب قریب وہ ہی حالات بیسیوں چھوٹے
اور بڑے شہروں کے تھے جنکو سلوقس نے آباد کیا تھا۔ ما کے شہر کی نسبت استرابو (۱۹۸)
لکھتا ہے کہ "یہ شہر قابل دید ہے۔ لیکن اسکے اکثر باشندے ایسے ہیں کہ یا تو انکے سر پہ
کوئی دیوتا سوار رہتا ہے یا وہ بت خانہ کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ سب کتونیا کی نسل کے لوگ ہیں
اور گو بالعموم بادشاہ کے تحت میں ہیں لیکن ان پر براہِ راست حکومت کرنیوالا ہیکل کا سردار
کاہن ہے۔ یہ کاہن ہیکل اور ہیکل کے غلاموں کا بالکل مالک ہے۔ میں جسوقت اس شہر میں
آیا تو ان غلاموں کی تعداد زن و مرد شامل کر کے چھ ہزار تھی۔ ہیکل کے متعلق بڑی بڑی
اراضیات ہیں جنکی آمدنی کاہن وصول کرتا ہے۔ بادشاہ وقت کے بعد اس کاہن سے
بڑھکر کوئی صاحب اقتدار نہیں۔" ایسا ہی ایک ہیکل زیوس کا وینا سیا کے شہر میں تھا
جس سے متعلق تین ہزار غلام تھے۔ اور زمین تھی جسکی سالانہ آمدنی ۱۵ ٹیلنٹ یعنی قریب
بیس ہزار ڈالر کے کاہن وصول کرتے تھے۔ اسطرح شہر تیانہ کے قریب زیوس اسبامیوس
اور شہر کتونیا میں اپولو اور قونیہ کے پاس ماآ زیزمینی اور شہر کستابلہ میں ارتمیس پیرسیہ کے

بڑے بڑے ہیکل اور بت خانے تھے۔ بحر اسود والے شہر کومانا میں ماکا بت خانہ تھا۔ اسکے بازار نہایت آباد تھے اور اراضیات بہت وسیع تھیں۔ اور مندر کے متعلق چھ ہزار غلام اور کنیزیں تھیں۔ جوان کنیزیں باوجودیکہ حرام کاری کرتی تھیں پھر بھی بھگت سمجھی جاتی تھیں اسیطرح زیلا کے شہر میں اناتیس کا اور کابیرا میں مین کا اور آئی بیرا میں سیلینی کا اور ادلبا میں زیوس کا اور پیسی نوس میں بڑی ماتا کا مندر تھا۔ اور اور بہت سے شہروں میں متعدد دیوتاؤں کے بت خانے علاقہ جات۔ فرانجیا۔ پی سیدیا۔ لایدیا۔ فلسطین۔ شام و بابل میں جا بجا واقع تھے۔ سلاطین سلوقیہ نے سلطنت حاصل کرتے ہی دیکھا ہوگا کہ تمام عملداری میں متعدد کیش و مذہب کے لوگ اپنی اپنی جماعتیں علحدہ قائم کیئے ہوئے آباد ہیں۔ اور ہر فرقہ اور گروہ کا مذہبی قانون جدا ہے اور ہر فرقہ ایک با اختیار مذہبی حکومت کے تحت (۱۹۹)
میں ہے اور یہ مذہبی حکومت وہ ہے جو مدت سے پسندیدہ چلی آتی ہے۔ غرض اس ناصواب طرز حکومت نے ایرانیوں ہی کے زمانہ میں تمام ملک کی سیاسی و مالی ترقی کی حالت کو رفتہ رفتہ ایسا ناکارہ اور خراب کر دیا تھا جیسے کہ بند پانی کا حال ہوتا ہے کہ جتنا پرانا ہو اتنی ہی غلاظت و عفونت اُس میں ہو۔

جسوقت مقدونیہ والے ایشیا میں پہنچے ہیں تو سوائے پہاڑوں اور جنگلوں کے جہاں لوگ قبیلوں کی صورت میں بالکل آزاد اور خانہ بدوش رہتے تھے اور سلطنت کیلئے ہمیشہ باعث خوف ہوتے تھے باقی تمام ایشیا کی قومیں دیہات یا قریوں میں سکونت رکھتی تھیں۔ زمین اکثر دیہات کی اور دیہات والے ہمیشہ کسی سردار یا رئیس کی ملک ہوتے تھے۔ اگر یہ سردار یا رئیس اُسی جگہ کا رہنے والا ہوتا ہوگا تو ضرور اسکا علاقہ اسکے خاندان میں پرانے وقتوں سے چلا آتا ہوگا جسکو ایرانیوں نے بھی اپنے دور حکومت میں بجنسہ قائم رکھا ہوگا۔ اور اگر یہ سردار یا رئیس ایرانی ہوتا ہوگا تو ایرانی بادشاہوں کے حکم سے یہ علاقہ بطور جاگیر کے اسکو کبھی ملا ہوگا۔ تمام ملک شام اور ایشیائے کوچک میں آج تک جو ہیکل سنگین مناروں اور عالیشان مکانوں کے کھنڈر جو کبھی ان امیروں اور رئیسوں کے مکان ہونگے جا بجا نظر آتے ہیں۔ رئیس بڑے بڑے مکان بنواتے تھے۔ اور ہمسایوں سے پناہ میں رہنے کیلئے یا ضرورت اور موقع پر بادشاہ سے بغاوت اختیار کرنے کیلئے ان مکانوں کے گرد فصیلیں بنوا کر انکو ایک محفوظ و مستحکم مقام بنا دیتے تھے۔

جو رئیس یا سردار اس قسم کے محل اور قلعے تعمیر کراتے تھے تو ظاہر ہے کہ نہ وہ ایرانی بادشاہوں کے خیر خواہ ہوتے ہونگے اور نہ اُس نئی قوم کی اطاعت قبول کرنیکی نیت رکھتے ہونگے جو ایرانیوں کے بعد ملک کی مالک ہوئی تھی۔ پس سلاطین مقدونی نے حکومت سنبھالتے ہی اُنکے علاقے ضبط کرنے شروع کیئے اور جب قبضہ ہوگیا تو پھر اختیار تھا کہ جو چاہتے سو کرتے۔ چنانچہ ایرانی بادشاہوں کے زمانہ کیطرح یہ ضبط شدہ علاقے شاہی املاک خاص کا ایک حصہ بنا دیئے گئے پہاڑوں پر اور جنگلوں کے کنارے اور بت خانوں کے مقبوضہ علاقوں اور بڑے بڑے تعلقداروں کی جاگیروں اور شہروں کی حدود میں جو حکومت کا مرکز ہوتے تھے شاہی املاک کے گاؤں اور قریے اسطرح نظر آتے تھے جیسے کسی بڑے سمندر میں چھوٹے چھوٹے صدہا جزیرے نظر آئیں۔ یہ ہی شاہی املاک وہ بڑا سرمایہ تھی جسکی بدولت سلاطین سلوقیہ نے بہت سے شہر یونانی وضع کے اپنی عملداری میں قائم کیئے تھے۔

مذہبی شہروں کی ایسی رعایا جو کسی قسم کی مذہبی خدمت نہ رکھتی تھی یونانیوں کے (۲۰۰)
جدید انتظام حکومت میں ایک بڑا کارآمد وسیلہ ثابت ہوئی۔ یہاں تیرتھ کے مقامات قرب وجوار کے علاقوں کا تجارتی مرکز بنے ہوئے تھے۔ اور چونکہ وہاں مقررہ دنوں میں بازار لگا کرتے تھے اسلیئے صراف وساہوکار اور انکی مثل اور لوگ بہت آباد ہوگئے تھے۔ جب یونانیوں نے ایشیا میں آباد ہونا شروع کیا تو انھوں نے ایسی رعایا کو بہت قوت دی۔ اور رفتہ رفتہ سلوقی بادشاہوں کیلیئے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ ان مقامات میں ایک مجلس عام اور ایک کونسل اور چند عامل مقرر کرکے اس قسم کی رعایا کو ایک شہری انتظام میں منتظم کردیں اور اس طرح ایک شہری ریاست کھڑی ہو جائے۔

شہری ریاستوں کے ہاتھ میں بت خانوں کا انتظام چند قیود کے ساتھ رکھنا یونانیوں میں قدیم سے چلا آتا تھا۔ مثلاً دلفای اور دیلوس کے بت خانوں کا انتظام اُن ہی شہروں کے لوگ کیا کرتے تھے جن میں یہ بت خانے تھے۔ پس سلوقی سلاطین کیلیئے یہ ایک قدرتی تدبیر تھی اور جہاں تک ممکن ہوا انھوں نے اسپر اپنا عمل بھی رکھا کہ وہ بت خانوں کے کاہنوں اور خادموں کو قریب کی کسی شہری ریاست کا تابع کردیں۔ اور اسطرح ایک سیاسی مسئلہ کو جسمیں مذہب کا تعلق ہوگیا تھا اسطور پر حل کریں کہ اپنے حق میں بھی سہولت رہے اور یورپ والوں کے خیال کے مطابق بھی ہو۔ جہاں کہیں ایسا ممکن نہ ہوتا تھا وہاں بت خانوں کی

املاک رعایا کے نفع کیلئے بادشاہ اکثر ضبط کر لیا کرتے تھے۔ مثلاً زیوس والے بت خانہ کی موقوفہ املاک سے بٹیوکیلی کا موضع ضبط کر کے ایک شخص کو جسکا نام دیمی تریوس تھا تفویض کر دیا۔ اسی طرح زیوس ایرانی کے ہیکل کے متعلق جو زمین تھی اُسکے حصّے کر کے کلیروک کو یعنی ان اسامیوں کو دیدئیے جنکو سرکار سے زمین کے اور قطعات بھی ملے ہوئے تھے۔ زمین پر محصول قائم کیا اور قریب کی کسی شہری ریاست کے مالی انتظام کا اوسکو پابند کر دیا۔ غرض یہ ہی ایک دوسری شکل اُس عام حکمت عملی کی تھی جسکو پیش نظر رکھکر ایک بادشاہ کے بعد دوسرے بادشاہ نے اُن خزانوں پر اپنا "ناپاک" ہاتھ ڈالا جو کیعل۔ انا ئیس انا گیتیس ہوہ کے ہیکلوں اور بت خانوں میں جمع تھے۔

مذہبی اوقاف کو دنیا کے کاموں میں صرف کرنا ایک مشکل معاملہ تھا جسکو سلوقی بادشاہ بھی ہمیشہ ایک ہی ارادے اور قوّت سے آگے نہ بڑھا سکے کیونکہ جب کبھی ملک کے اندر یا باہر کوئی خطرہ پیش آتا تھا تو کاہنوں کا دل رکھنے کیلئیے بادشاہوں کو وہ احکام بھی منسوخ کر دینے پڑتے تھے جنکو وہ جاری کر چکے تھے بلکہ یہاں تک دیکھنے میں آتا ہے کہ بت خانوں کے اوقاف اپنا نفع شاہی جاگیروں اور تعلقوں سے پیدا کر لیتے تھے۔ اسکی مثال ایک کتبہ کی عبارت سے جسکو ڈاکٹر ٹیلر نے پڑھا ہے بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ کتبہ ارتمیس کے بت خانہ میں اندر کی ایک دیوار میں نصب ملا ہے۔ اور بت خانہ شہر ساردیس کے کھودنے سے برآمد ہوا ہے۔ عبارت کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص نیسی ہکیس غالباً کوئی مقدونی افسر یا روپیہ کمانے کا شوقین تھا جسکو بادشاہ اینتی گونس کے زمانہ میں ایک بڑا تعلقہ ملا تھا۔ اس تعلقہ میں ایک موضع تویل ہیورا شامل تھا جو ساردیس کے میدان میں واقع تھا۔ اس موضع کے ساتھ دو گاؤں ٹانڈو اور کمب دیلیپیا بھی تھے۔ ان تینوں موضعوں کی بابت نیسی ہکیس کو ۵۰ پونڈ سالانہ قریب کی ایک تحصیل میں جو اسی ضلع کی تھی داخل کرنے پڑتے تھے۔ ان موضعوں کے قریب ہی موضع کینارہ میں نیسی ہکیس کے پاس ایک قطعہ زمین کا تھا جسکی بابت ۳ پونڈ سالانہ مالگذاری داخل کرنی ہوتی تھی اسکے علاوہ تعلقہ میں ایک موضع پر یاسا سوسترا بھی شامل تھا جسکی سالانہ مالگزاری [illegible] پونڈ ضلع کی ایک دوسری تحصیل میں داخل کرنی پڑتی تھی۔ اور اس گاؤں کے پاس ہی ناگریوا کے مقام میں ایک اور قطعہ زمین کا تھا جسکی بابت ۳ پونڈ، شلنگ سالانہ ادا کرنے پڑتے تھے

علاوہ اِسکے تعلقہ میں ایک موضع ایو بھی تھا جو مشہور و معروف شہر اتودا کی حدود میں واقع (۲۰۲)
تھا۔ اسکی مالگزاری ۳ پونڈ ۵ شلنگ سالانہ اتودا کے خزانہ میں داخل کرنی پڑتی تھی۔ تعلقہ کا صدر مقام جہاں تعلقہ دار نیسی ہیکس کی سکونت تھی توبل ہیورا کے موضع میں تھا۔ پہلے کیفیت میں یہ گاؤں اور اسکے بعض مکانات جنہیں عدالت کے اہلکار رہا کرتے تھے اور چند باغات اور سبزہ زار جنہیں توبل ہیورا اور پرباساسوترا کی اسامیاں کاشت کرتی تھیں دو شخصوں کو جنکے نام پاپی تھیوس اور ایدر استوس تھے ملے ہوئے تھے۔ یہ دونوں شخص بھی مقدونی تھے۔ لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ بعد کو یہ سب چیزیں نیسی ہیکس کے قبضہ میں آگئیں۔ اتنے بڑے تعلقہ کا خوش نصیب مالک تمام مواضع و اراضیات و باغات وغیرہ پر قبضہ رکھنے کی وجہ سے اُنکی پوری اور خالص آمدنی وصول کرتا تھا اور اِس آمدنی کے علاوہ اپنی اسامیوں سے روپیہ غلہ اور بیگار لینے کا بھی پورا حق رکھتا تھا۔ یہ آمدنی اسقدر تھی کہ اگر چاہتا تو ایرانی جاگیرداروں کی طرح جنکی جاگیروں سے اب مقدونیوں نے انکا قبضہ اٹھا دیا تھا رئیس بنکر لایدیا میں سکونت اختیار کرلیتا۔ چنانچہ بہت سے یونانی و مقدونی تعلقداروں نے بھی ایشیا میں زندگی بسر کرنیکا یہ ہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ لیکن نیسی ہیکس کو "حقوق" حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ اسکو جو کچھ درکار تھا وہ روپیہ تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ ارتمیس کے ہیکل واقع ساردس میں آیا اور ہیکل کے خزانہ سے ۱۳۲۵ پونڈ کا دستاویزی قرضہ حاصل کیا۔ دیوار میں جو کتبہ نصب ہے اُسکا مضمون یہ ہی ہے کہ نیسی ہیکس نے اپنے تعلقہ کے کل حقوق ہیکل ارتمیس کے نام اِس شرط کیساتھ بیع کئے ہیں کہ تعلقہ مذکور کو پھر خریدنے کا حق اُسے حاصل رہے۔ جب نیسی ہیکس قرضہ ادا نہ کرسکا تو اُسکی اس ناقابلیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہیکل کے خزانہ و اختیارات میں ترقی ہوئی۔

کچھ شبہ نہیں کہ اس قسم کے معاملات اکثر پیش آتے ہونگے اور اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا باتیں تھیں جنکی سلوقی بادشاہوں کو بہت احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ زمین کے بارے
میں جو تدبیر اُنھوں نے اختیار کی تھی اُسمیں نہایت احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیا (۰۳
تھا۔ اور یہ انکا فرض بھی تھا۔ کیونکہ شاہی اراضیات نہایت وسیع تھیں اور یہ ہی ان بادشاہوں کی آمدنی کا بڑا اور مستقل ذریعہ تھیں۔ سلوقی بادشاہوں کو معلوم تھا کہ ایسی زمینوں کو حاصل کرنے کے لئے جنکو وہ نفع کے ساتھ اپنے قبضہ میں رکھ سکیں ایرانی بادشاہوں کے وقت سے

ایک حد مقرر چلی آتی ہے کیونکہ یہاں وہ حالت نہ تھی جو مصر میں بطلیموسیوں کی تھی۔ یہاں سلطنت کے اہلکار و ملازم اسی قسم کے چلے آتے تھے جو ایرانی حکومت کے زمانہ میں تھے یہ لوگ خود انتظام کرنے کیلئے موزوں نہ تھے بلکہ انکا کام سابقہ انتظام کی نگرانی تھا۔ سلوقیوں نے اپنی استراپیوں (صوبوں) کی تعداد بڑھائی لیکن کسی استراپی (صوبہ) میں جسقدر ریکلی آرکیان (قسمتیں) یا ہیپارکیان (اضلاع) چلے آتے تھے انکی تعداد میں غالباً کمی نہیں کی۔ جو جماعت سلطنت کے کاروبار کیلئے اہلکاروں کی پہلے سے چلی آتی تھی اسکے ساتھ اپنی طرف سے اہلکاران مال اور ناظمان ہیاکل کی ایک خاص تعداد مقرر کی مگر باوجود اسکے تمام مالی۔ عدالتی۔ اور ہیکلوں کے متعلق فروعی معاملات و انتظام عمال موضع کے سپرد رکھنے پڑے۔ کہ مواضع کا انتظام ان بادشاہوں نے کس طریقہ پر کیا اسکا پورا پورا حال دریافت نہیں ہوتا۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مصر کے دیہات میں چند زمینداروں کو چن لیا جاتا تھا کہ وہ گاؤں والوں سے مالگذاری وصول کرنے اور انکا چال چلن درست رکھنے کے ذمہ دار رہیں اسیطرح سلوقیوں نے بھی کیا۔ اپنی عملداری میں ہر گاؤں میں کچھ لوگوں کو ان باتوں کا ذمہ دار بنا دیا۔ ان لوگوں کی حیثیت سرکاری اہلکاروں کی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ بطور ضامنوں کے ہوتے تھے کہ اگر کوئی بات خلاف ظاہر ہو تو ان ہی کی گردن دبائی جائے۔ اور یہ لوگ گاؤں والوں کی طرف سے نہیں بلکہ خاص بادشاہ کے طرف سے نامزد ہوتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون کے متعلق معلومات کی بہت قلت ہے اور اسکے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی طریقہ ایسا ضرور تھا کہ سب گاؤں والے اپنا اپنا لگان یکجا کرکے کل گاؤں کی مجموعی رقم سرکار میں پہنچا دیں۔

ہر جگہ جدا جدا انتظام کی پریشانیوں سے بچنے اور ملک پر اپنا قبضہ مستحکم رکھنے کا ایک عمدہ طریقہ سلوقی بادشاہوں نے یہ نکالا تھا کہ شاہی زمینوں کے قطعات یا معمولی زمینیں مع گاؤں اور گاؤں کی اسامیوں کے یونانی علاقہ داروں یا سفید وغیرہ کے لوگوں کو مالگذاری کی ایک رقم لگا کر تفویض کر دیتے تھے۔ چنانچہ نبیسی ہیکیں کے مقدمہ میں دیکھ چکے ہو کہ (۲۰۴)
گاؤں اور زمین پا کر وہ کسطرح مالگذاری ادا کرنیکا ذمہ دار ہوا تھا۔ اس انتظام کی بڑی خرابی جسکا تجربہ ایرانی بادشاہوں کو ہو چکا تھا یہ تھی کہ گاؤں کی اسامیوں سے سرکشی اور تمرد اس درجہ ظاہر نہیں ہوا کرتا تھا جسقدر کہ علاقہ داروں اور جاگیرداروں سے

یہ ہی چیزیں ظہور میں آتی رہتی تھیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ بادشاہ جن لوگوں کو شاہی زمین تفویض کرتے ان کو زمین کے پورے حقوق نہ دیتے تھے۔ چنانچہ جب نیسی میکس نے ہیکل آرٹیمس کے ہاتھ اپنے حقوق بیع کئے تو ہیکل کی طرف سے معاہدہ میں اسبات کا لحاظ رکھا گیا کہ اگر علاقہ بادشاہ نے ضبط کرلیا تو ہیکل کا کوئی نقصان ہونے پائے۔ برعکس اسکے جسوقت کوئی بادشاہ مالی مشکلات کے وقت شاہی املاک سے کسی گاؤں کو قطعاً بیع کردیتا تھا اور یہ گاؤں معہ زمین اور گاؤں والوں کے خریدار کی ذاتی جائداد ہوجاتے تھے تو پھر بادشاہ کے حکم سے یہ گاؤں اور اسکی زمین کسی شہری ریاست کی ماتحتی میں رکھہ دیجاتی تھی۔ اور خریدار کے حق میں یہ بڑی رعایت سمجھی جاتی کہ جس ریاست کو وہ پسند کرے اسی سے اسکی زمین اور گاؤں کا تعلق کردیا جائے۔ سلوقیوں کی حکمت سیاسی زمین یا تو کسی شہری ریاست کے تحت میں رہے یا بادشاہ کی ملکیت میں رہے اس مقصد کیلئے بہت کارگر تھی کہ بڑے بڑے کاہنوں اور جاگیرداروں نے جو اپنی ریاستیں بنا رکھی تھیں وہ رفتہ رفتہ فنا ہوجائیں۔ اسی حکمت کو رومانیوں نے بھی جسوقت سلوقیہ کی سلطنت ان کے قبضہ میں آئی جاری رکھا۔ اور بہت سے اوقاف جن کو سلوقیوں نے ضبط کرکے دنیا کے کاموں میں صرف کرنا شروع کیا تھا یا جنکو ضبطی کے بعد ضعف حکومت کے اخیر زمانہ میں کاہنوں نے واگذاشت کرالیا تھا رومانیوں کے قبضہ میں اسوقت آگئے جب کہ ایشیائے کوچک میں وہ سلوقیوں کے وارث بنے۔

بادشاہ کی جانب سے ایسے بیع یا ہبہ کے ذریعہ سے یورپ کے آبادکاروں نے کوئی نیا شہر بناکر یا کسی گاؤں کے پرانے باشندوں نے کسی آزاد شہری ریاست میں حقدار شہری بنکر ان زمینوں میں جو انکو تفویض ہوئی تھیں پورے حقوق مالکانہ حاصل کرلئے۔
اور آزاد شہریوں کو ان اسامیوں پر بھی جو ان زمینوں پر آباد تھیں حکومت کرنیکا اختیار (۲۰۵)
مل گیا۔ مگر یہ اختیار ایسے قوانین کی پابندی کے ساتھ ملا جو اس بارے میں خاص انکی آزاد ریاست یا کل سلطنت میں نافذ تھے۔ اس طریقہ سے بادشاہوں کے حقوق اور اختیارات اپنی زمینوں اور اسامیوں پر سے اٹھ گئے کیونکہ یونانی طرز کا جو شہر بنتا تھا وہ ایک نیا شہر ہی نہ ہوتا تھا بلکہ ایک نئی ریاست بھی ہوتا تھا جسکا حاکم بااختیار کوئی بادشاہ نہ ہوتا تھا۔ یا یہ کہئے کہ حاکم بااختیار صرف بادشاہی نہ ہوتا تھا بلکہ اختیارات حکومت ریاست کے ایسے جمہور کے ہاتھ میں بھی ہوتے تھے جسکو نظم ونسق ریاست میں

رائے دینے کا اختیار ایک مجلس عام کے ذریعہ سے حاصل ہوتا تھا اور وہ جملہ معاملات ملکی کی تحریکوں
کو بحث کے بعد طے کرتا تھا اور نظمِ حکومت کی جملہ خدمات اپنی طرف سے ایک کونسل و چند عاملوں
کے سپرد کر دیتا تھا۔ اور تمام داخلی و خارجی تدابیر سیاست اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ تمام
سرکاری تحریرات یونانی زبان میں ہوتی تھیں۔ دیوانی و فوجداری کا پورا قانون و ضابطہ
یونانی قانون و ضابطہ کے نمونہ پر بنا ہوا تھا۔ جمناشیا قائم کئے گئے تھے جن میں ورزشوں اور
گانے بجانے کی تعلیم اور جلسے ہوا کرتے تھے۔ یہ چیزیں یونانی تعلیم کی خصوصیات سے تھیں۔
جن دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے وہ بھی انکی پسند اور انتخاب کے ہوتے تھے اور مفبوضہ ملکوں
کے دیوتاؤں اور دیبیوں کے علاوہ یونان کے دیوتاؤں کی پرستش بھی کی جاتی تھی لیکن
اپنے شہر کیلئے جو سب سے بڑا دیوتا تجویز کرتے تھے وہ زندہ بادشاہ یعنی شہنشاہِ وقت ہوتا
تھا۔

سلطنت سلوقیہ کا کوئی باشندہ شہنشاہی کے نظم و نسق میں رائے دینے کے ایسے
حقوق نہ رکھتا تھا جیسے کہ ایک شہری ریاست کے باشندے کو اپنے شہر کے سیاسی معاملات
میں رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ یعنی سلوقیوں کی شہنشاہی ایک ایسی ریاست تھی جسمیں شہری
حقوق داری نہ تھی مثلاً اگر اس شہنشاہی میں کوئی ایتھنز کا رہنے والا آباد ہوتا تو چاہے وہ
یہاں کسی صوبہ کا والی ہی کیوں نہ مقرر کر دیا جاتا مگر وہ صرف ایتھنز کا حقوق دار شہری سمجھا
جاتا تھا البتہ اگر اسکو اس شہنشاہی کے کسی آزاد شہر کے حقوق عطا ہو جاتے تو پھر وہ اس شہر کا
حقوق دار شہری سمجھا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھنا چاہیئے کہ سلوقیوں کی شہنشاہی
(۲۰۶) میں جسقدر آزاد شہری ریاستیں تھیں اسی قدر شہری حقوق داریاں بھی تھیں اور جس قدر
شہری حقوق داریاں تھیں اسی قدر آزاد شہری ریاستیں تھیں۔

پس ہر شہری ریاست کی خوشی پر تھا کہ اغیار کے متعلق خواہ وہ یونانی ہوں یا
ایشیائی۔ ملک کے اصلی باشندے ہوں یا پردیسی اپنی جماعت سیاسی میں شامل کرنے
نہ کرنے کی جو تدبیر چاہے اختیار کرے۔ انکو اختیار تھا کہ اپنے شہریوں اور غیر شہریوں
میں باہمی رسم ازدواج کی ممانعت کردے۔ اور یہ بھی اختیار تھا کہ ایسے لوگوں کو جو حرام
کی اولاد سمجھے جاتے تھے اگر چاہے تو اپنا شہری بنا دے۔ چونکہ ان ملکوں کے قدیم
حالات کے بارے میں مصر کے قدیم کے حالات کی طرح پپائی تحریرات کا کوئی ذخیرہ موجود

نہیں ہے اسلئے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ سلوقیوں کی شہنشاہی میں مختلف قومیں کس حد تک باہم
مخلوط ہوئیں اور اِس اختلاط نسل سے کیا نتیجے پیدا ہوئے۔ دو باتیں البتہ صاف نظر آتی
ہیں (۱) ایک یہ کہ مختلف شہری ریاستوں کے شہریوں میں شادی بیاہ اکثر ہوتے رہتے تھے
اور قانوناً ایسے ازدواج میں کوئی نقص نہ سمجھا جاتا تھا۔ (۲) دوسرے یہ کہ یونانیوں
اور مقدونیوں یا یہودیوں اور ایرانیوں کے قرب سے زراعت پیشہ لوگوں کی نسل میں
کوئی بڑا انقلاب پیدا نہیں ہوا۔ یہ زراعت پیشہ لوگ قریب قریب غلامی کا درجہ رکھتے
تھے اور معاشرت کے لحاظ سے اِس درجہ پستی میں تھے کہ آزاد شہری انکو اپنے زمرہ میں
شامل نہ کرتے تھے۔ لیکن برخلاف اِسکے جب یورپ کے لوگوں نے اپنا وطن چھوڑکر انکے
ملک میں آباد ہونا شروع کیا تو پھر ملک والوں میں وہ بے چینی محسوس ہوئی جو مصر کے
فلاحین میں نہیں ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اُنکے ملک (ایشیا) میں جس کثرت سے یورپ
کے لوگ گھس آئے تھے وادیٔ نیل میں ایسا نہ ہوا تھا۔ علاوہ اسکے یونانیت کو اپنا
اثر پھیلانے کیلئے عمدہ وسائل جیسے یہاں ملے مصر میں نہ ملے تھے۔ کیونکہ خیال یہی ہے
کہ ایشیا کی صدہا شہری ریاستوں میں باہمی ازدواج کی رسم جاری تھی اور یونانیوں کا خون (۲۰۷)
مختلف قوموں میں ملگیا تھا خواہ وہ فرلیجیا یا لایدیا کی رہنے والی تھیں یا شام و بابل
کی خواہ وہ یہودی تھیں یا ایرانی۔ ہم کو مان لینا چاہیے کہ کم سے کم مردوں کی زبان
یونانی تھی گو خاص طرز کی ہو۔ یونانی نام اختیار کرنے انکو بالطبع مرغوب تھے۔ ڈیلوس
کے کاغذات میں جو دوسری صدی قبل مسیح کے ہیں شہر بمبایکی کے چند باشندوں کے نام
آئے ہیں۔ بمبایکی کا شہر اُسوقت ایک آزاد یونانی ریاست کی حیثیت رکھنے لگا تھا
اور اسکا نیا نام بھی یونانی ترکیب کا ہائرو پولس یعنی مُبارک شہر" رکھ دیا گیا تھا۔ باوجود
اسکے یہاں کے لوگوں کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر انکی سامی النسل بیویوں
کے نام بھی انکے ساتھ بیان نہ ہوئے ہوتے تو اُن یونانیوں کے ناموں میں جو ایشیاء
میں پیدا ہوئے تھے اور ان بمبایکی یونانیوں کے ناموں میں ہرگز تمیز نہ ہو سکتی۔
فی الواقع اِن میں کچھ لوگ خالِص یونانی تھے جنہوں نے شامی عورتوں سے شادی
کرلی تھی۔ یورپ والوں کے مختلف شہر جو ملک شام میں کثرت سے اور باقی ایشیاء
میں کسیقدر کمی کیساتھ قائم ہوئے انکے گرد دوغلی نسل کی آبادیاں شروع ہی سے

نظر آنے لگی تھیں جن سے اتنا نفع ضرور تھا کہ دو مختلف اور مقابل تمدنوں میں جو شدید فرق
نظر آرہا تھا اُسمیں کیقدر کمی ہوگئی اور اس صورت میں یونانی خیالات و رسم رواج ایسا خمیر
بن گئے جس نے ایشیا کی تمام قوموں میں اپنا اثر تہ تک پہنچا دیا۔ اس قسم کی بیداری ایشیا کے
ان ملکوں میں جو یورپ سے بالکل ہی متصل تھے تیسری صدی قبل مسیح میں ترقی پر تھی۔ اور
اگر کہیں روما کے لوگ قرطاجنہ کے امیر لشکر حنابعل سے شکست کھا جاتے یا یونانیوں کا اقبال
سو دو سو برس اور ایشیا میں قائم رہ جاتا تو پھر تاریخ کی صورت کچھ اور ہی دیکھنے میں آتی۔
مگر یونانی ایشیا میں "امن لیکر نہیں آئے تھے۔ تلوار لیکر آئے تھے" وہ اس لئے
آئے تھے کہ بہت سی بد مزاج و تند خو چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستیں ایک ایسے
ملک میں قائم کردیں جس کی بے شمار مخلوق سیاسی حیثیت سے بالکل مردہ حالت میں
اپنے دن بسر کرتی چلی آئی تھی۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے عہد متوسطی کے ملک
جرمانیہ سے بھی زیادہ ریاستوں میں ایشیا کے ٹکڑے ٹکڑے کردئیے وہ خود وہ ہی فرمانروا تھے (۲۰۸)
جو اس تمام وسیع اقلیم کی حکومت کے ذمہ دار تھے۔ یہ چیستاں حل ہو تو کیونکر ہو؟
مگر یہ چیستاں ظاہر ہی میں ایک معمہ ہے حقیقت میں اُسکا سمجھنا مشکل نہیں۔ حاکم
یا فرمانروا صرف اِن ہی زمینوں کا مالک نہوتا تھا جو شہری ریاستوں کی حدود میں پڑتی تھیں
بلکہ اِن شہری ریاستوں کا بانی بھی وہ ہی ہوتا تھا یا بانی نہوا تو بانی کی اولاد سے ہوتا تھا۔
اور اِن ریاستوں کا وہ ہی سرپرست و محافظ بھی سمجھا جاتا تھا۔ پس اسی بنا پر مستحق تھا کہ
کل ریاستیں اسکی مطیع رہیں اور اس کا احترام کریں۔ اس اطاعت و احترام کے ظاہر
کرنے کا جو طریقہ اسکندر اعظم سب کو بتا گیا تھا وہ ہی اِن ریاستوں نے بھی اپنے حاکم
و فرمانروا کیساتھ بلاعذر برتا۔ یعنی ان کو بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے اور زمین کو بوسہ دینے
(پروسکائی نے سیس) کی رسم ادا کرنیکی ضرورت ہوئی۔ اور اسکی ضرورت بھی ہوئی کہ جن خداؤں
کو پوجتے تھے انکے زمرہ میں اپنے بادشاہ کو بھی شامل کریں۔ اور زمین کے ایک ٹکڑے کو اُس پر
احاطہ کھینچکر اُسکے نام سے تبرک مانیں۔ اُسکا کوئی معبد یا قربان گاہ یا بت قائم کریں۔
خاص وقت پر ایک جلوس نکالا کریں اور ایک کاہن مقرر کریں کہ جسوقت بادشاہ کی پوجا
کیجائے تو وہ قربانی اور چڑھاوے وغیرہ کی رسمیں ادا کرے۔ غرض بندگی و نیاز کیشی
کی یہ تمام رسمیں سلوقس اوّل کے عہد میں جو بانیِ خاندان شاہی تھا پوری ہوچکی تھیں۔

اور جب اسکے لڑکے انتی اوکس اوّل کا زمانہ آیا تو اسنے حکم دیا کہ اسکے والد بزرگوار سلوقس کو جسوقت سے اس نے انسانی زندگی کو الوداع کہا ہے بلا قید مقام و ملک دیوتا مانا جائے اور اسکے بعد جب انتی اوکس ثانی تخت پر بیٹھا تو اسنے اپنے باپ انتی اوکس اوّل کو دیوتا ماننے کا حکم دیا اور اپنے لئے اور اپنی ملکہ کیلئے زندگی ہی میں دیوتائی کی عزت سے سرفراز کئے جانیکی خواہش کی۔ پس جو واقعات جن اسباب و وجوہ سے مصر میں پیش آئے تھے ان ہی اسباب وجوہ سے سلطنت سلوقیہ میں بھی ایک شہنشاہی عقیدہ اس مضمون کا شروع ہو گیا کہ نہ صرف سلطنت کے تمام صوبوں اور علاقوں کی رعایا شاہان مردہ و زندہ کو دیوتا مانے بلکہ جسقدر آزاد ریاستیں سلوقیوں کی عملداری میں ہیں وہ بھی بادشاہوں کو اسی درجہ پر تسلیم کریں۔

پس ہر ایک شہری ریاست کی دو حیثیتیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اصولی و عملی دونوں (۲۰۹ صورتوں میں اس سے عبارت ایک آزاد قوم سے تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک میونی سپلیٹی (یعنی ایک حلقہ سیاست بلدیہ) تھی جسکی حیثیت ماتحتی کی تھی۔ پہلی حیثیت سے ایک شہری ریاست کو اختیار تھا کہ چاہے وہ بادشاہ کی اطاعت قبول کرے اور چاہے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دے۔ دوسری حیثیت سے اسکا فرض تھا کہ بادشاہ کی مطیع رہے۔ اسی وجہ سے وہ بادشاہ کو خراج دیتی تھی جسکو خواہ اُن زمینوں کا محصول سمجھا جائے جو بادشاہ کی طرف سے تفویض ہوئی تھیں اور خواہ اُس حفاظت کا معاوضہ سمجھا جائے جو شاہی فوجیں ایسی ریاستوں کی کرتی تھیں۔ علاوہ اس صرف کے ہر ایک ریاست کو بادشاہ کو پوجنے کیلئے ایک کاہن اور ملکہ کو پوجنے کیلئے ایک کاہنہ اپنے صرف سے نوکر رکھنی پڑتی تھی۔ بادشاہ کا ایک وکیل (رزیڈنٹ۔ ایپس ٹیٹ) بھی ہر ایک ریاست کو رکھنا پڑتا تھا۔ یہ افسر علاوہ وکیل ہونیکے اگر شہر میں شاہی فوج مقیم ہوئی تو اُسکا سپہ دار (فرودارک) بھی سمجھا جاتا تھا۔ شہری ریاستوں کا دو حیثیتیں رکھنا اِس واقعہ سے بھی ثابت ہے کہ شہریوں پر صرف اِن ہی قوانین کی پابندی لازم نہ تھی جنکو وہ خود وضع کر کے منظور کرتے تھے بلکہ فرامین شاہی (پروستاگ ماتا) کا پابند رہنا بھی لازم تھا۔ اگر شاہی فرامین اور ریاستوں کے قانون میں کہیں اختلاف پڑ جاتا تھا تو شاہی فرامین کی تعمیل مُرجح سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہ وقت کو سمجھا جاتا تھا کہ (نعوذ باللہ) وہ خدا کی مثل مطلق العنان ہے۔ کسی ریاست کا

وہ خوف دار شہری تصور نہ کیا جاتا تھا بلکہ وہ محض باسیلیوس یعنے بادشاہ ہوتا تھا۔ صرف باسیلیوس کا خطاب بغیر کسی (ابھتنی کم یعنی) گروہی لقب کے شاہان سلوقیہ نے شروع میں استعمال کیا تھا۔ لیکن انکے بعد جو بادشاہ اس خاندان سے ہوئے انمیں سب سے پہلے انیتی اوکس چہارم نے اور اسکے بعد اور بادشاہوں نے اپنے نام کیساتھ ایسے لقب اختیار کئے جن سے انکی خاص خاص دیوتائی صفات ظاہر ہوں۔ مثلاً انتی اوکس چہارم نے اپنا لقب ایپی فانیز رکھا جسکے معنی اوتار یا مجسم دیوتا کے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی انھوں نے اپنے سکوں اور فرامین پر دو دو نام یا لقب نقش کرائے۔ ایک نام تو وہ ہوتا جسکا تعلق اس دنیا سے تھا جسمیں وہ بطور انسان کے زندہ تھے اور دوسرا نام وہ ہوتا جسکا تعلق عالم بالا سے تھا جسمیں وہ دیوتائی کا دعویٰ رکھتے تھے۔ یہ دونوں نام اسطرح شانہ بہ شانہ بیان کئے جاتے تھے جیسے کسی آدمی کے نام کے ساتھ اسکے شہر یا وطن کا نام شامل کیا جاتا ہے بہر صورت بادشاہ کا مرتبہ ایک آزاد شہری ریاست کے مرتبہ سے بڑھکر تھا۔ مگر باوجود اسکے (۲۱۰)
شہری ریاستوں کے مطالبات کا ان دیوتا بادشاہوں کو بہت لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ان ریاستوں میں بادشاہ وقت کا مقابلہ کرنیکی قوت موجود ہوتی تھی۔ اور اگر انکو بادشاہ کی طرف سے کسی امر میں پورا اطمینان نہ ہوتا تھا تو وہ دوسرے کو اپنا بادشاہ بنانے کیلئے آمادہ ہو سکتے تھے چنانچہ پارتھیا اور باکتریا کی شہری ریاستوں میں یہ ہی پیش آچکا تھا۔ یا وہ خراج دینے سے انکار کر سکتے تھے جیساکہ انتی اوکس اوّل کے زمانہ میں بعض شہری ریاستوں نے کیا تھا۔ پس بادشاہوں کو مجبوری تھی کہ شہنشاہی کی ان آزاد ریاستوں کیلئے جو شہنشاہی کے ماتحت بلدیہ حلقوں کی طرح تھیں آزادی و حریت کی پوری گنجایش رکھیں۔ ان آزاد ریاستوں کا جمہور بڑے بڑے کاموں میں معروف و سرگرم رہتا تھا۔ ریاستوں کا ملکی و عدالتی انتظام اور محصولوں کا وصول کرنا اسی کے ذریعہ سے عمل میں آتا تھا۔ غرض ان آزاد ریاستوں کے لوگوں نے انتظام سیاست و امور ملکداری میں وہ ذوق و شوق اور امنگ دکھائی جسکو ایشیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور ان ریاستوں کو سلوقیہ کی شہنشاہی میں وہ ہی منزلت و اہمیت حاصل ہو گئی جو رومانی شہنشاہی میں وہاں کے بلدیہ حلقوں (میونسپلٹیوں) کو حاصل تھی۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ریاستیں رومانی بلدیہ حلقوں ہی کی ایک نقل تھیں۔

رومانی شہنشاہی ابھی تک عالمِ وجود میں نہیں آئی تھی۔ مگر یہ اطالیہ ہی کی آزاد ریاستیں
تھیں جنھوں نے روما کی سرداری ورہبری کی بدولت متحد ہو کر ہنابعل کو شکست دی تھی اور پھر ہوپلی
اور مگنیشیا کی مشہور لڑائیاں جیتی تھیں۔ جسوقت اِن آزاد رومانی ریاستوں کے اتحاد کا مقابلہ سلطنت
سلوقیہ کی ایسی ہی ریاستوں سے کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سلوقیہ کی سلطنت میں ایسی کمزوریاں
موجود تھیں جنکا ایک دن اس سلطنت کے حق میں مہلک ثابت ہونا ضروری تھا۔ روما کی آزاد ریاستو
کے حقوقدار شہری جنکے نام فوجی فہرستوں میں درج تھے ان حقوقدار شہریوں سے کچھ بہت زیادہ
نہ تھے جو سلوقیہ کی آزاد ریاستوں میں فوجی خدمت کے لائق عمر رکھتے تھے۔ اسیطرح شاہی زمینیں
جو رومانی سلطنت کی آمدنی کا وسیلہ تھیں رقبہ اور آمدنی دونوں اعتبار سے سلوقیہ کی شاہی زمینوں
کے مقابلہ میں بہت کم تھیں۔ لیکن روما کو دو باتوں میں بڑی جیت تھی جنکے بیان کرنے سے وہ مجبوریاں (۲۱۱)
سمجھ میں آجائینگی جو سلوقیہ کی ایشیائی سلطنت کو لاحق ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ رومانی فوجوں میں
جن لوگوں کا نام درج ہو چکا تھا انکو چھوڑ کر اطالیہ میں بہت کم لوگ ایسے رہ گئے تھے جو فوجی
کام کر سکیں۔ یا یہ سمجھئے کہ اطالیہ میں کوئی ایسی دیسی رعایا موجود نہ تھی جسکو مغلوب ومحجوب رکھنے
کیلئے فوج کی ضرورت ہو۔ مگر سلوقیہ کی عملداری میں یہ حالت نہ تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ روما
کو اپنی کل فوجوں کو نقل وحرکت میں لانے کی بہت سہولت حاصل تھی مگر یہ بات سلوقیہ کو نصیب
نہ تھی۔ ایشیا میں آزاد ریاستیں بڑے بڑے فاصلوں پر واقع تھیں۔ انکے بیچ میں کہیں
پہاڑ اور کہیں جنگل حائل تھے۔ تجارت یا مزدوری پیشہ لوگ ایشیا کے خاص باشندے یا اور لوگ
جنکو لڑائی کے کام سے واسطہ نہ تھا یونانی یا یونانی نما ریاستوں میں آزاد شہریوں کے ساتھ
ساتھ آباد تھے۔ اور بادشاہِ وقت کو فوجی امداد پہنچانا یا نہ پہنچانا بالکل ان ریاستوں
کی مرضی پر موقوف تھا کسی قسم کی مجبوری نہ تھی۔ مگر اطالیہ میں یہ باتیں نہ تھیں۔ یہاں کسی
قسم کی پریشانی یا پراگندگی نہ تھی۔ ہر چیز مختصر اور گٹھی ہوئی تھی۔ ملک کی زراعت پیشہ رعایا جو
تھی۔ اور تمام ریاستیں پابند تھیں کہ روما کے طلب کرتے ہی جہانتک انکے مقدور میں ہو فوجیں
حاضر کر دیں۔ رومانیوں کو اپنی سرزمین سے جسمیں پیدا ہوئے تھے ہمیشہ مدد ملتی رہی۔ اور
جسطرح ہرکیولیز اور انتیوس دیو کی کشتی کا قصہ مشہور ہے کہ جبتک دیو کا پاؤں زمین پر لگا
رہا کوئی اسکو مغلوب نہ کر سکا۔ اسیطرح رومانی بھی جب کبھی گرے اطالیہ کی زمین نے پھر انکی
طاقت کو بحال کر دیا۔ سلوقیہ ایسی مخلوق پر حکومت کرتے تھے جو نہ کوئی قومی ترتیب رکھتی تھی

اور نہ کسی خاص ملک کیساتھ اسکو خصوصیت تھی۔ علاوہ اسکے ایشیا سے باہر سلوقیہ کا کوئی ملک یا وطن ایسا نہ رہا تھا جسکی طرف آخری حالت میں رجوع کیا جاتا۔ یہ غور کرنیکی بات ہے کہ ایشیا میں خاندان سلوقیہ کا کوئی اتنا ہمدرد نہ تھا جتنا ہمدرد ایک آزاد شہری اپنی ریاست کا تھا۔ اگر شریف طبیعتوں میں سلطنت کے ساتھ خیر خواہی کا کچھ خیال تھا بھی تو وہ سب سے پہلے اپنی اپنی ریاستوں کی خیر منانے کی وجہ سے تھا اور یہ بات کسیقدر زمانہ گذرنے کے بعد پیدا ہوئی تھی کہ خاندان فرمانروا کی خیر خواہی کو اپنی ریاست کی بدخواہی نہ سمجھا جائے۔ آزاد ریاستیں ہمیشہ اسی شش و پنج میں رہتی تھیں کہ اگر کسی معاملہ میں سلوقیہ سے قطع تعلق کر کے کسی اور بادشاہ یا بادشاہ وقت کے دشمن کی اطاعت قبول کی تو اسمیں فائدہ رہیگا یا نقصان۔ غرض سلطنت پر کیسا ہی نازک وقت آئے ان ریاستوں کو اپنے ہی نفع نقصان کی فکر ہو جاتی تھی۔ (۲۱۲)

یہ انتی اوکس چہارم کے عہد پرسود کا ایک واقعہ ہے کہ ایطالیہ میں تعلیم و تربیت پانے سے یہ بادشاہ ان سیاسی رموز و اسباب کو سمجھ گیا تھا جنھوں نے روما کی فوجی طاقت کو سب پر فضیلت دی تھی۔ اور چونکہ ایتھنز کے ساتھ اور ایتھنز کے فضل و کمال حکمت و فلسفہ اور شاعری کیساتھ اسکی طبیعت کو ایک قدرتی لگاؤ تھا اُسنے اپنے اس خیال کو کہ یونانی تعلیم و تربیت سب میں افضل ہے بہت پختہ کر لیا۔ اور ایشیا میں یونانیت کی اشاعت کو جو اسکے خاندان کا قدیم طریقہ تھا ایسی سرگرمی سے ترقی دینی چاہی جو پہلے کسی بادشاہ سے ظہور میں نہ آئی تھی یہ دیکھکر کہ ایشیائی قوموں کی مردہ اُمیدوں میں زندگی کے کچھ آثار پیدا ہو چلے ہیں اس نے سوچا کہ ایشیائی قوموں کو متحد کر کے اُن سے ایک قوم واحد بنانیکی سب سے بہتر تدبیر یہی ہے کہ کسیطرح ایشیا کو یونان بنا دیا جاوے۔ اب وہ اس جستجو میں ہوا کہ جو آزاد ریاستیں اسوقت ایشیا میں قائم ہیں انکو زیادہ استحکام کیساتھ اپنا محکوم بنائے۔ مگر اس حکومت کیلئے اسکے پاس کوئی حق بجز اسکے نہ تھا کہ وہ ان ریاستوں کا دیوتا ہے اور اس حیثیت سے تمام مخلوق پر اسکی اطاعت واجب ہے۔ مگر اتفاق سے یہ جستجو اور کوشش اسوقت عمل میں آئی جبکہ اسکو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جسکے مذہب میں بادشاہ کو دیوتا ماننے سے بڑھکر کوئی گناہ نہ تھا۔ سنہ۔ ق م میں فلسطین کا علاقہ مصر کے قبضہ سے نکلکر انتی اوکس چہارم کے قبضہ میں آگیا تھا اور اسوجہ سے اب یہودیوں سے اس بادشاہ کو واسطہ پڑا اور سب سے بڑی مشکل یہ نظر آئی کہ یہودی موحد تھے۔ گو خاص یروشلم میں اور سلطنت کے اور شہروں میں

(۲۱۴) ایسے یہودی بھی موجود تھے جو یونانیت کے خلاف نہ تھے مثلاً وہ جمناشیا کے کھیل تماشوں میں شریک ہوتے تھے اور اپنے لڑکوں کو یونانی فوجوں میں داخل کرتے تھے اور انکے یونانی نام رکھتے تھے لیکن جو یہودی اپنے دین میں پکّے تھے وہ اِس فعل کو کہ بادشاہ کو خدا بناکر پرستش کیا جاوے نہایت نفرت وکراہت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شہروں کو چھوڑ کر دیہات کے رہنے والے یہودی ہر ایک چیز سے جو غیر ملک والوں کی ہو سخت پرہیز کرتے تھے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ جسوقت انتی اوکس چہارم نے یروشلم کے شہر کو ایک یونانی شہر مع اختیارات حکومت قرار دیا اور موسوی قانون کی جگہ ایک دوسرا مکمل یونانی قانون رعایا میں جاری کرنا چاہا اور اپنی تصویر اولمپیا کے دیوتا زیوس کی شکل میں بیت المقدس میں رکھنی چاہی تو یروشلم کے لوگوں اور خاصکر دیہات اور قصبات کے یہودی باشندوں نے بغاوت کردی۔

یہ ہی انتی اوکس خاندان سلوقیہ کا وہ بادشاہ ہے جو دو مرتبہ اپنی فوج ظفر موج کو اسکندریہ کی دیواروں تک لے گیا تھا۔ ایک مرتبہ بطلیموسیوں سے اپنے حکم کے مطابق شرائط صلح لکھواکر واپس آیا۔ مگر دوسری مرتبہ جسوقت اسکندریہ پہنچا تو روما کے سفیروں سے ملاقات ہوئی جنکا افسر اُسکا پرانا دوست گائس پوپی لیوس تھا۔ اس رومانی افسر نے انتی اوکس کے سلام کا پورا جواب بھی نہ دیا۔ اور روما کی مجلس (سینات) کا ایک حکم اسکو پکڑا دیا اور کہا کہ اسکو فوراً پڑھو۔ انتی اوکس نے حکم پڑھا تو اسمیں لکھا تھا کہ فوراً مصر خالی کردو۔ یہہ حکم پڑھکر اسنے افسر سفارت سے غور کرکے جواب دینے کی مہلت چاہی مگر اسکے جواب میں ایک دوسری عجیب حرکت دیکھنی پڑی۔ پوپی لیوس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس چھڑی سے اسنے انتی اوکس کے گرد زمین پر ایک حلقہ کھینچا اور اس حلقہ سے یہ کہتا ہوا نکلا کہ بس "ہاں یا نہیں" یہ ہی جواب ہے جو کچھ کہنا ہو کہو۔ اس واقعہ سے چند ماہ پہلے ۱۶۸ ق م میں پدنا کے میدان جنگ میں سلطنت روما مقدونیہ کے بادشاہ پرسیس کو ایک لڑائی میں منہزم کرکے یونان میں اپنی آخری حریف کا جس سے واقعی خوف ہوسکتا تھا خاتمہ کر چکی تھی۔ اِس حالت پر غور کرکے انتی اوکس نے سوچا کہ اسوقت مقابلہ کے معنی یہ ہونگے کہ تنِ تنہا بے یار و مددگار ایک ایسے دشمن صعب کا سامنا کیا جائے جو اسوقت دنیا کا مالک ہوچکا ہے۔ پس اسکو یہ ہی جواب دیتے بن پڑا کہ "اچھا" لیکن اس جواب کے
(۱۴) معنی یہ تھے کہ سلوقیہ کی سلطنت عظمیٰ اب دنیا سے رخصت ہونا چاہتی ہے۔ اس کے بعد

جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ افریقہ یورپ اور ایشیا میں رود فرات سے لیکر بحر محیط تک ایک ہی ارادہ اور حکم تھا جسکے سامنے سب کے سر جھک جاتے تھے۔ یہ ارادہ اور حکم سلطنت روما کی گورنمنٹ کا ہوتا تھا۔ ایلالیہ میں تو روما کی اس عاقل وبامرد جماعت نے جسکا نام رومانی سینات تھا ایسا سامان پیدا کر کے اسکو مدت سے کام میں لانا شروع کر دیا تھا جس سے اسکے احکام کی تعمیل ہو سکے۔ لیکن یونانی دشمنوں نے اسکے مقابلہ پر جو سامان پیدا کیا اسکو رومانیوں نے اس معرکۂ عظیم میں جبکہ دنیا کی تسخیر کو اٹھے توڑ پھوڑ کر پراگندہ کر دیا۔ اور اب یہ کام آیندہ نسل کا ہوا کہ شہنشاہی کی غرض سے اس لوٹے اور بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ کر خاک سے اٹھائے اور اسکو درست کر کے اور ترقی دیکر پھر ایک شہنشاہی کی صورت قائم کرے۔

(۲۱۵)

ساتواں باب

شاہانِ انتی گونی کی شہنشاہی

ہیلینی قوم کی شہنشاہیوں میں جس شہنشاہی سے دولت روما کو سب سے زیادہ تکلیف اور سب سے کم تعلیم پہنچی وہ شاہان انتی گونی کی شہنشاہی مقدونیہ اور یونان کی تھی۔ ہم نے یہاں "مقدونیہ اور یونان" دونوں نام ساتھ لکھے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مقدونیہ کے جسقدر بادشاہ ہوئے یعنی فیلقوس ثانی سے لیکر بادشاہ پرسیوس تک وہ سب ان دونوں ناموں کی جگہ فقط ایک نام یعنی ہیلاس[1] کہا کرتے تھے۔ کیونکہ کبھی وہ اپنے اِس دعوے سے نہ ہٹے تھے کہ مقدونیہ در اصل ہیلاس کا ایک حصّہ ہے اور حصّہ بھی وہ جو اور تمام حصّوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ مقدونیہ ہی کے شاہان جلیل القدر

---

[1] ہیلاس کوئی ایسا ملک نہ تھا جسکی حدود اربعہ بیان میں آسکیں۔ بلکہ ہیلینی قوم کے لوگ جہاں جہاں آباد ہو جاتے تھے اُن مقاموں کے لئے ہیلاس کا لفظ بولا جاتا تھا شروع زمانہ میں یہ قوم تھسلی کے ایک چھوٹے سے ضلع میں آباد تھی اور صرف اسی ضلع کو ہیلاس کہا جاتا تھا جب یہ قوم یہاں سے اٹھکر دوسرے مقامات میں آباد ہوئی تو پھر اُن مقامات کو بھی ہیلاس کہنے لگے۔ چنانچہ ہیلاس خاص کا اطلاق اُس علاقہ پر ہونے لگا جسکے جنوب میں خلیج کورنتھ اور شمال میں دریا پنوی اور امبرالیا کا علاقہ تھا بعض مورخوں نے ایشیا و افریقہ و صقلیہ و ایطالیہ کے ایسے مقامات کو بھی جہاں ہیلینی قوم جاکر آباد ہوئی ہیلاس میں شامل سمجھا ہے۔ جب مقدونیہ والوں کو عروج ہوا تو انھوں نے بھی ہیلینی قوم سے رشتہ نکال کر اس سے ہمدردی رکھنے کے ثبوت میں مقدونیہ کو ہیلاس کا ایک حصّہ سمجھا۔ مگر رومانیوں نے ہیلینی قوم کے مقامات کو جنکا مجموعی نام آجکل گریس ہے ہمیشہ گریشیا یا گریکیا کہا اور اسکی وجہ یہ تھی کہ علاقہ ایپرس کی ایک قوم گریسی یا گریکی نام کی تھی جس سے رومانیوں کو سب سے پہلے واسطہ پڑا اور انھوں نے موجودہ گریس کو گریشیا یا گریکیا کے نام سے موسوم کیا۔ آجکل ہیلینی قوم کے گروہ جس ملک میں آباد ہیں اس کو گریس کہتے ہیں۔ ایشیائی زبانوں میں اس ملک کو بالعموم یونان کہتے ہیں۔ کہیں کہیں غریقیہ یا اغریقیہ بھی لکھا دیکھا ہے۔

(مترجم)

فیلقوس و اسکندر کے کارنامے تھے جن سے متاثر ہو کر یونان کی تمام ریاستوں نے مقدونیہ کو اپنا سردار و سرگروہ بنایا تھا۔ مقدونیہ سے مراد ایک شہنشاہی قوم تھی جس کے لئے اُسکے بادشاہ اُسکے امراء اور اُسکے عوام غایت درجہ خیرخواہی کا جوش رکھتے تھے اور اس کی ہر ایک چیز پر ناز کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں مقدونیہ کو ہیلاس سے وہ ہی نسبت تھی جو امریکائی لڑائیوں کے زمانہ سے پہلے ملک ورجینیا کو ریاستہائے متحدہ امریکہ سے رہی تھی۔ یہ نسبت ایسی نہ تھی جیسے کہ آسٹریا کو آسٹرو ہنگیری سلطنت سے ہے بلکہ اسکی مثال زیادہ تر پروشیا اور جرمنی کے تعلق میں نظر آتی ہے۔

رومانیوں کو مقدونی یونانی شہنشاہی سے جو کچھ تعلیم پہنچی وہ بہت قلیل تھی کیونکہ اس شہنشاہی کے پاس سکھانے کو جو کچھ تھا وہ بھی قلیل تھا۔ جس چیز میں مقدونیہ والے استاد مانے جاتے تھے وہ لڑنے کا فن تھا مگر اس میں رومانیوں نے خود ایسی ترقی کی تھی کہ مقدونیوں کی کچھ حقیقت نہ رہی تھی۔ مقدونیہ والوں نے لڑنے کے لئے فالنکس ایجاد کیا تھا (یعنی نیزہ بردار سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے قریب قریب صفوف میں اس طرح ترتیب دیتے تھے کہ ان کی برچھیاں چاروں طرف باہر کو نکلی رہتی تھیں تاکہ دشمن کو کسی طرف سے حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو) مگر رومانی فوج سوارہ کا یلغار اس بلا کا ہوتا تھا کہ فالنکس کی بھی ایک نہ چلتی تھی۔ یہ ہی حالت مقدونیہ والوں کی حکومت کے فن میں تھی کہ گو شاہان انٹی گونی کے پاس بظاہر ایسا سامان موجود تھا کہ وہ اس فن میں اپنا کمال دکھاتے مگر ہیلاس کی ریاستوں کو کسی ایک نظم حکومت میں منسلک کرنا ایسا ہی دشوار تھا جیسے نیزہ کی نوک پر کسی لعاب دار چیز کو
(۲۱۹) اٹھانا۔ غرض سلاطین انٹی گونی نے فن حکومت میں جو کچھ دوسروں کو سکھایا وہ ناکامیابی کا سبق تھا۔ مگر اس سے ان سلاطین پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب خود رومانیوں کی نوبت حکومت کرنیکی آئی تو جب تک ہیلاس مر نہ لیا اور اُسکی لاش کے ٹکڑے نہ کر لئے گئے اُس وقت تک رومانی کسی عمدہ اصول حکومت کے ساتھ ملک کا انتظام نہ کرسکے۔ سلاطین انٹی گونی اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے کہ جس قوم میں مقدونیہ والوں کی مثل رسم و رواج ہوں اور مذہب میں پختگی کے ساتھ کھرا پن بھی موجود ہو اسپر حکومت کرنے کا سب سے بہتر طریقہ مطلق العنان بادشاہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی بادشاہی ہے

جنکو بہ عبارت ارسطاطالیس ہکام دوری کی ایک دوامی حکومت سمجھنا چاہیے۔ پس شاہان
انتی گونی کو ضرورت نہ تھی کہ مقدونیہ کے لوگ ان کو دیوتا مانیں اور نہ مقدونیہ کے لوگوں
کو جو پشتہا پشت سے ایسے حقوق رکھتے چلے آئے تھے جنکو بادشاہ سلب نہ کر سکتے تھے
کوئی قانونی مجبوری تھی کہ وہ اپنے بادشاہوں کو دیوتا بناتے۔ پس یہ سمجھنا چاہیے کہ
ہیلینی قوم کے حکمراں خاندانوں میں سلاطین انتی گونی ہی ایسے تھے جنھوں نے محض انسانی
حیثیت سے حکومت کی اور جن لوگوں پر حکومت کی وہ ہمیشہ اُنکے خیر خواہ و مددگار رہے۔
ان بادشاہوں نے نہ تو مقدونیہ میں دیوتا بنکر حکومت کی کہ انکے لئے سب کچھ جائز
ہوجاتا اور نہ ہیلاس میں اپنی پوجا کیلئے کوئی بنا مت نکالا۔ اسکی وجہ ہم آگے چلکر بیان
کرینگے۔ بہرکیف رومانیوں کو اپنا علم و ہنر سکھا کر حلقہ بگوش بنانے کا شرف یونان کو
حاصل ہوا نہ کہ مقدونیہ کو اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ رومانی یونان کو مغلوب
کر چکے تھے۔ مقدونیہ والے ہر حال میں بہت کچھ گنوار کالٹھ ہی رہے۔ انھوں
نے شاعری۔ مصوری۔ تعمیر کے فنون میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا۔ دراصل یہ قوم
وہ تھی جسکے بڑے آدمی تو حکومت کرتے تھے اور چھوٹے آدمی کاشتکاری و سپہ گری
کا پیشہ رکھتے تھے۔ فیلقوس ثانی کی تخت نشینی سے لیکر (۳۵۹ ق م) سائنوسیفالس
کی لڑائی تک (۱۹۷ ق م) دس برس تو بڑی چیز ہیں پانچ برس بھی مشکل سے ایسے (۲۱۷)
نکلتے ہیں جن میں مقدونیہ کے صحیح الجثہ لوگوں کو کم سے کم ایک مرتبہ کسی نہ کسی علم کے
نیچے جمع ہوکر لڑنا نہ پڑا ہو۔ خواہ یہ لڑائی اپنے ملک کو دشمن سے بچانے کے لئے
ہوئی ہو اور خواہ اپنے بادشاہ کے دشمنوں سے شمال و جنوب۔ مشرق و مغرب
میں بڑی بڑی منزلیں طے کرکے تیغ آزمائی کا موقع ہوا ہو۔ ہیلاس کا کوئی شاذ ہی
حصہ ایسا نہ تھا جسمیں مقدونیہ کے مُردے دفن نہ ہوئے ہوں اور ایشیا کی کوئی
زمین ایسی نہ تھی جسپر مقدونیہ کے لوگ وطن چھوڑ کر آباد نہ ہوئے ہوں۔ اس
قوم کا کثیر الاولاد ہوکر تعداد میں جلد بڑھنا بھی اسبات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسکند
کے زمانہ سے لیکر جبکہ مقدونیہ کا ستارۂ اقبال پوری بلندی پر تھا اُس زمانہ تک کہ
دولت روما نے اسکی حکومت کو غارت کر دیا گو اس قوم کے لاکھوں آدمی لڑائی
میں کام آچکے تھے مگر جس وقت آخری لڑائی روما سے ہوئی ہے جسمیں مقدونیہ کا

خاتمہ ہوگیا تو ٢٩٠٠٠ مقدونی اِس آخری لڑائی کے میدان میں موجود تھے ۔ حالانکہ جسوقت اسکندر نے ایشیا فتح کرنے کیلئے فوجیں درست کی ہیں تو اسوقت خاص مقدونی سپاہ کی تعداد مذکورۂ بالا تعداد سے دو ہزار کم تھی ۔

روما کو سلاطین انٹی گونی سے جسقدر نقصان پہنچے تھے اور کسی ہیلینی خاندان شاہی سے نہ پہنچے تھے ۔ کیونکہ رومانیوں نے جن قوموں کو مغلوب کیا اِن میں مقدونی سب سے پرانے اور سب سے زیادہ آزمودہ کار لڑنے والے تھے جو ہروقت لڑائی کیلئے مسلح رہتے تھے ۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ مقدونیہ کے لوگ اپنے بادشاہوں کے بڑے خیرخواہ تھے اور دنیا میں اپنی قوم کو سب سے اونچے درجہ پر رکھنا چاہتے تھے جسوقت روما سے لڑائی شروع ہوئی ہے تو روما کے پاس ایک لاکھ فوج تھی ۔ اور مقدونیہ کو اس غنیم سخت کے مقابلہ کے وقت یہ مشکل درپیش ہوئی کہ ہیلاس کی حکومتیں جو مقدونیہ کو اپنا حریف مقابل سمجھتی تھیں یا اسکی ماتحتی میں تھیں وہ سب منحرف ہوکر مقابلہ پر آگئیں ۔ اور خود مقدونیہ کے لوگ بھی جو ایشیا یا افریقہ میں آباد ہوگئے تھے مقدونیہ کی امداد سے پہلوتہی کرتے رہے ۔ پھر بھی روما کی لڑائیوں کے اس سلسلہ میں شاہان انٹی گونی نے پہلی مرتبہ ۸ برس تک (٢١٢ - ٢٠٥) اور دوسری مرتبہ ۴ برس تک (٢٠٠ - ١٩٧) اور تیسری مرتبہ پھر چار برس تک (١٧١ - ١٦٨) رومانیوں کے مقابلہ میں نہایت پامردی و ثابت قدمی دکھائی ۔ اور ایسی ہمت سے کام لیا کہ جب تک پدنا کے مقام پر ان کی قوم کے کل ایسے لوگ جو لڑائی میں شریک ہونے کی عمر رکھتے تھے کام نہ آگئے اور انکا اخیر بادشاہ قید ہوکر حالت اسیری میں اور بادشاہ کا لڑکا ایک
محرر کی حیثیت رکھکر حالت گمنامی میں البا فوسین کے مقام پر مر نہ لیا اُس وقت تک ہتھیار (٢١٨)
نہ ڈالے ۔ رومانیوں نے مقدونیہ والوں پر فتح حاصل کرلی مگر مقدونیہ والوں سے ہمیشہ ڈرتے ہی رہے کہ کہیں بادشاہ کے ساتھ خیرخواہی کا جوش جو انکی طبیعت کا خاصہ تھا انہیں پھر عود نہ کر آئے ۔ چنانچہ اسی حالت پر غور کرکے روما کی مجلس (سینات) مجبور ہوئی کہ ایک رومانی پروکونسل کو اسکندر اعظم کے تخت پر بٹھا دے (١٤٨ ق م)

انٹی گونی خاندان گی اصل گو مقدونیہ سے تھی لیکن اُسکا نشوونما ایشیا میں ہوا اور تیسری پشت میں یہ خاندان ایشیا سے اٹھکر اپنے اصلی وطن مقدونیہ میں دوبارہ

آباد ہوگیا۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ ۳۲۳ ق م جس وقت اسکندر ایشیائے کوچک کی فتح کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوا تو اُسنے اس خاندان کے پہلے شخص انٹی گونس نامی کو علاقہ فراِیجیا کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس واقعہ کے دس برس بعد جب اسکندر کا انتقال ہوا تو اسوقت بھی انٹی گونس ملک فراِیجیا کا حاکم تھا۔ اب اس بھروسے پر کہ ایک بڑے ملک کا حاکم با اختیار ہے اور یہ حیلہ نکالکر کہ جملہ افواج اسکندری کی سپہ سالاری پر بھی نامزد ہو چکا ہے اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ سیاسی چالیں چلنی شروع کیں او۔ ایسی لڑائیاں لڑیں کہ ۳۱۲ ق م کے موسم بہار میں قطعی اندیشہ ہوگیا کہ انٹی گونس ایشیائے کوچک پر تو پہلے ہی سے مسلط ہے اب مقدونیہ پر بھی حکومت کا ڈنکا بجانے والا ہے۔ اور اگر مقدونیہ پر بھی اسکی حکومت ہوگئی تو وہاں کے لوگ اسکے مخالف نہیں بلکہ دوست اور مددگار ہو جاینگے اور پھر اسکندر نے جس وسعت وشان وشوکت کی حالت میں سلطنت چھوڑی تھی اُسی شان وشوکت کے ساتھ کل سلطنت کا انٹی گونس ہی مالک ہو جاویگا۔ یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ انٹی گونس اس قصد میں کیونکر ناکام رہا۔ اور جب اسی قصد کو دوبارہ عمل میں لانا چاہا تو کسطرح ایشیا کی حکومت کے ساتھ جان بھی گئی۔ ممکن ہے کہ اسکا یہ قصد محض طلب جاہ کا نتیجہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یونانی مقدونی سلطنت اب ایسی ہوگئی ہو کہ اُس کو تقسیم وتفریق سے بچانا امکان سے خارج ہوگیا ہو۔ بلکہ خیال تو یہ ہے کہ اسوقت مرکز سے باہر کی طرف رجوع کرنیوالی قوتیں ایسی زبردست تھیں کہ اگر اسکندر کی عمر اتنی وفا کرتی تو اسکو بھی اِن قوتوں کا تجربہ کرنا پڑتا اور شاید وہ اُن سے مغلوب بھی ہو جاتا
لیکن اس سے ہیلینی قوم کی تباہی میں کچھ کمی نہ ہوتی کیونکہ غزہ اور اپسوس کے (۲۱۹)
میدانِ جنگ میں اس بات کا فیصلہ ہوگیا تھا کہ ہیلینی کے ہم قوم مقدونی نہیں بلکہ ایک غیر قوم کے لوگ یعنی رومانی تمام دنیا کو متحد کرکے ایک حکومتِ واحد کے سمت میں لانے والے ہیں۔ پس انٹی گونس اول کی موت کے ساتھ ایک بڑی قوم کی آرزوئیں بھی درگور ہوگئیں۔

انٹی گونس کی بلند پروازیوں میں شریک اور ایک حدتک اُس کی شکست وبربادی کا موجب اسکا بیٹا دیمی تریوس تھا جسکا لقب پولی اورسٹیز (فاتح بلاد) تھا۔ غزہ کے معرکے میں جسطرح حکم دیا گیا تھا اسطرح حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اور اپسوس کے مقام پر بھی لڑائی میں ایسی تیزی وتندی دکھائی کہ باپ کی سلطنت برباد کرنے میں کچھ یوں ہی سی

کسر چھوڑ دی لیکن باپ کے مرنے کے بعد سمندر پر اسکا قبضہ قائم رہا جس کے معنی
یہ تھے کہ بحری کمک مانگنے والوں کے لئے وہ ایک بڑا وسیلہ ہے اور خود بھی جہاں
چاہتا ہے بحری لڑائی کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ شروع میں کئی برس تک کبھی کبھی
ادھر ادھر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتا رہا۔ کبھی بالکل بیکار رہا۔ اخیر میں یہ ارادہ کیا کہ
ایک مرتبہ پھر یونان و مقدونیہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے حالانکہ پہلے دو مرتبہ
باپ کی شرکت میں اس قسم کی کوشش بیکار ثابت ہو چکی تھی۔ اسوقت دیمی تریوس
کی جنگی طاقت پہلے موقعوں سے بھی کم تھی۔ اور دشمن بدستور اسکی تاک میں تھے۔
لیکن مقدونیہ کی حالت اب پہلی سی نہ تھی۔ انتی پاتر کا خاندان مقدونیہ پر اسوقت سے
حکومت کر رہا تھا جب سے کہ اسکندر (مقدونیہ سے رخصت ہوکر) ایشیا میں داخل
ہوا تھا۔ مگر اسوقت انتی پاتر کے لائق فرزند کیساندر کے ہاتھ میں حکومت کی باگ
نہ تھی۔ کیساندر کا انتقال ۲۹۷ ق م میں ہو گیا تھا۔ اسوقت کیساندر کی کمزور اولاد
جن میں نااتفاقی تھی مقدونیہ پر مسلط تھی۔ چنانچہ جسوقت دیمی تریوس نے ایتھنز کا
محاصرہ کیا تو کیساندر کے پست ہمت لڑکے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے یہانتک
کہ دیمی تریوس نے رسد بند کر کے شہر والوں کو فاقہ کشی کی نوبت تک پہنچا دیا (۲۹۵-۲۹۴)
اور وہ ایسے مجبور ہوئے کہ انھوں نے دیمی تریوس کی اطاعت قبول کر لی۔ ایتھنز فتح
کرتے ہی دیمی تریوس نے کیساندر کے لڑکوں کو حکومت سے معزول کیا اور خود مقدونیہ
کا بادشاہ اور یونانی ریاستوں کا سرگروہ بن گیا۔ دیمی تریوس کی بیوی کیساندر کی حقیقی (۲۲۰)
بہن تھی۔ اسلئے دیمی تریوس کا لڑکا جسکا لقب گوناتاس تھا انتی پاتر اول کا حقیقی
نواسا تھا۔ اور انتی پاتر ثانی جو اسوقت کیساندر کی اولاد میں اکیلا رہ گیا تھا انتی پاتر اول
کا حقیقی پوتا تھا۔ اسلئے دیمی تریوس (پولی اورسیتیز) کی نسبت تو یہ خیال درست تھا کہ
بجز اپنے باپ کی نامراد کوششوں کے اور کوئی حیلہ مقدونیہ کا تخت حاصل کرنے کیلئے
نہ رکھتا تھا لیکن اسکے لڑکے گوناتاس کی یہ حالت نہ تھی جسوقت انتی پاتر ثانی کا انتقال
ہو گیا تو پھر گوناتاس کے وارث تخت ہونے میں کسیطرح کا شبہ نہ تھا۔ انتی پاتر ثانی
کا انتقال ۲۸۸-۸۷ ق م کے درمیان کسی زمانے میں ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ دیمی تریوس
مقدونیہ سے نکال دیا گیا تھا۔ اور ریاستہائے یونان کی سرگروہی سے دست بردار ہو کر

ایشیا میں قید کر لیا گیا تھا جس سے تازیست رہا نہ ہوا۔ باپ کے قید ہونے پر گوناٹاس یونان میں تنہا رہ گیا مگر یونانی ریاستوں پر اپنی سرگروہی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مقدونیہ کا تخت ابھی اسکو نہ مل سکا اور ایپیرس کے بادشاہ پرہوس اور تھریس کے بادشاہ لائی سی ماکوس کا قبضہ چند سال تک رہا یعنی ۲۸۸ء سے ۲۸۴-۲۸۵ ق م تک مقدونیہ ان ہی دونوں بادشاہوں کے تسلط میں رہا۔ پھر لائی سی ماکوس اور بطلیموس کراونس نے ۲۸۳-۲۸۰ ق م تک ایک کے بعد دیگرے قبضہ رکھا۔ اسکے بعد تین برس تک قوم کلٹ کے غارتگروں نے اطراف شمال سے داخل ہوکر مقدونیہ کو تباہ کیا۔ بہر کیف ۲۷۷ ق م میں گوناٹاس کو اتنی قوت ہوگئی کہ وہ مقدونیہ سے اسکی مصیبتیں دور کرے اسکو اپنا صدر مقام یونان پر معرکہ آرائی کیلئے قرار دے۔ اور یورپ میں اس خاندان کا بانی ہو جائے جس نے مقدونیہ پر ۱۶۸ء عیسوی تک حکومت کی۔ ۱۴۶ء میں رومانیوں کو اس ملک پر کامل فتح حاصل ہوگئی۔

انٹی گونس اول اور اسکے فرزند دیمی تریوس نے اپنے سیاسی منصوبے اس زمانہ میں قائم کئے تھے جبکہ اسکندر کے امرائے لشکر میں اسکندر کے ترکہ پر لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اور اسکندر کی قائم کردہ سلطنت اپنی پوری شان و شوکت کیساتھ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ جس کسی میں لیاقت ہو شجاعت ہو۔ جسکا دل ہر قسم کے تذبذب سے خالی ہو وہ اُٹھے اور میرا مالک بن جائے۔ اسکندر کے بعد جو لوگ اسکی سلطنت کے مالک بنکر مسند حکومت پر بیٹھے انھوں نے ہمیشہ یہ آرزو رکھی کہ بادشاہ اور دیوتا بنکر دونوں حیثیتوں سے جہاں بانی کریں۔ محکوم رعایا اور ماتحت ریاستیں جسطرح اسکندر کے سامنے زمیں بوسی کرتی تھیں اسیطرح ان کے سامنے بھی زمیں بوس ہوں۔ یونان اور مقدونیہ پر قبضہ کرنے کا شوق اس خیال سے تھا کہ یہی دو ملک ایسے ہیں جہاں سے سپاہ میں بھرتی کرنے کیلئے آدمی اور ایشیا میں نوآبادیاں قائم کرنے کیلئے لوگ مل سکتے ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں ایشیا میں ایک سلطنت لامتناہی قائم کرنے کیلئے نہایت ضروری ہیں۔ یہ بادشاہ مقدونیہ سے بھی زیادہ یونان پر قبضہ رکھنے کی نیت رکھتے تھے۔ اور فی الحقیقت مقدونیہ کا دارالحکومت پیلا نہیں بلکہ یونان کا دارالحکومت ایتھنز ہی وہ شہر تھا جس کے

خواب دیمی تریوس کو نظر آیا کرتے تھے۔ اسکو اسبات پر فخر تھا کہ ۳۰۷ سنہ ق م میں اُسنے اِس شہر کو دشمن کی قید سے آزاد کیا تھا۔ مگر جسوقت اپسوس کی لڑائی کے بعد ایتھنز کے لوگوں نے اُس سے پہلو تہی کیا تو اسکو سخت مایوسی ہوئی۔ ۲۹۵-۲۹۴ سنہ ق م میں جسوقت اسنے پھر ایتھنز پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تو ایتھنزیوں کے ساتھ رعایت برتی حالانکہ مقابلے کے وقت ایتھنزیوں نے بہت سختی ظاہر کی تھی۔ دیمی تریوس کے باپ نے ایتھنز کی جو کچھ تعریف کی تھی اسکو دیمی، تریوس نے اِن الفاظ میں ادا کیا کہ "یہ شہر روشنی کا ایک منارہ ہے جس نے تمام دنیا کو منور کر رکھا ہے"۔ انتی گونس اوّل کے دل میں ایتھنز والوں کے علم و فضل اور کمالات کی قدر اسدرجہ تھی کہ ایشیا میں ان کی ایک چھوٹی سی بستی کو اُس نے ایسی رونق بخشی کہ رفتہ رفتہ وہ انتی گونیا (اور بعد کو انطاکیہ) کا عالی شان شہر ہو گئی۔ اور اسی شہر کو اقلیم اسکندری کا نیا دار الحکومت بنا کر امید کی کہ یہاں سے ایکدن ان تمام ملکوں پر جہاں اسکندر نے حکومت کی تھی خود بادشاہی کریگا۔

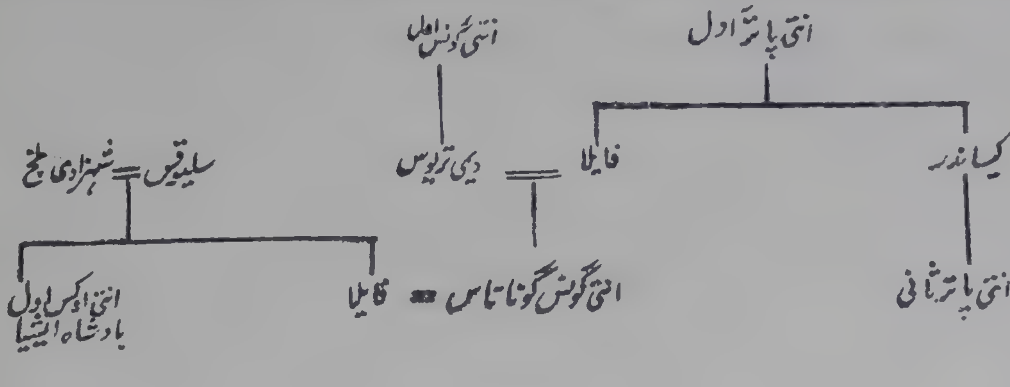
انتی گونس اوّل کی قسمت میں نہ تھا کہ جس ملک میں پیدا ہوا تھا اسپر سلطنت بھی کرتا۔ لیکن اسکے لڑکے دیمی تریوس کو یہ عزّت حاصل ہوئی کہ چھ برس تک (۲۹۴-۲۸۸ ق م) اپنے وطن میں حکومت کرے مگر اس زمانہ میں اُسنے قطعی ثابت کر دیا کہ وہ کیساندر یا انتی پاتر کی مثل سلطنت نہیں کرسکتا۔ ان بادشاہوں نے اہل مقدونیہ سے (۲۲۶)
بزرگانہ شفقت و محبت کیساتھ بادشاہ فیلقوس اور اسکے بزرگوں کا تتبع کر کے مقدونیہ پر حکومت کی تھی۔ مگر دیمی تریوس سے ایسا نہو سکا۔ اسنے اہل مقدونیہ کی پرانی رسوم کو کچھ نہ سمجھا۔ اور نہ ان پابندیوں کا خیال رکھا جو بادشاہ کے اختیارات پر اُن کے قدیم دستور کے مطابق پرانے وقتوں سے چلی آتی تھیں۔ اُسکا دربار نہایت پر تکلف و شاہانہ تھا جسمیں درباریوں کو خاص لباس پہننا اور خاص آداب شاہی بجالانے پڑتے تھے۔ اِس دربار کی تزک و شان کا حال بھی وہی تھا جو دور آخر میں اسکندر اعظم کے دربار کا تھا۔ بلکہ دورِ آخر کے بھی اُس حصے کا نمونہ تھا جبکہ جاہ و حشم نخوت و پندار میں وہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ غرض ایک بادشاہ پرست دربار قائم کر کے اور مقدونیہ کے خاص و عام میں زمیں بوسی کی رسم کا حکم دیکر دیمی تریوس نے مقدونیہ کے

لوگوں کو ناحق رنجیدہ خاطر کیا۔ اور اُنکے ایسے خیالات کو جو مدت سے دل میں گھر کر چکے تھے صدمہ پہنچایا۔ مقدونیہ والے سیدھے سادے بے تکلف لوگ تھے۔ ایسے لوگوں پر ایک مطلق العنان بادشاہی قائم کرنا ہی ڈیمی تریوس کے حق میں زوال حکومت کا پیغام ہوگیا۔ کیونکہ جسوقت باہر کے دشمنوں کو خبر لگی کہ ڈیمی تریوس مقدونیہ والوں ہی پر وار کرنیکا ارادہ رکھتا ہے تو ہر طرف سے انھوں نے فوجکشی کردی اور مقدونیہ والے اپنے بادشاہ کو چھوڑ کر اس غنیم کے ساتھ ہوگئے۔ اور اب مقدونیہ کے لوگوں میں سلطنت کے ان بلند پرواز منصوبوں کو آئندہ چلانے کا بھی کچھ شوق باقی نہ رہا تھا جو اسکندر اعظم نے انمیں پیدا کیئے تھے اور اسطرح پیدا کیئے تھے کہ ان کو کچھ معلوم ہی نہ ہوا تھا کہ کس راستے پر ان کو ڈالدیا گیا تھا۔

انٹی گونس گوناٹاس مشرق کی دلفریبیوں سے مطلق آشنا نہ تھا۔ اسکی جوانی کا ایک حصہ (۲۹۴-۲۹۰) ایتھنز میں گذرا تھا۔ یہاں ایک بری حرکت تو یہ کی تھی کہ دربار کی ایک حسین عورت ڈیمو سے آشنائی کرلی تھی۔ اور اچھی حرکت جس سے عزت ہوئی یہ کی تھی کہ حکیم زینو کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ یہ حکیم فلسفۂ رواقی کا موجد تھا۔ سنہ ۲۹۲ لغایتہ سنہ ۲۹۱ ق م میں بیوشیا کے علاقہ میں جو
لڑائیاں گوناٹاس کا باپ لڑا تھا انمیں گوناٹاس نے بھی نام پیدا کیا تھا۔ اور (۲۴
اپنی عمر کا وہ حصہ جبمیں طبیعت پختہ ہوتی ہے ایک سپہ سالار و مدبر سیاسیات کی حیثیت سے یونان میں بسر کیا تھا۔ (۲۸۸-۲۸۰ ق م) صرف ایک مرتبہ یعنی ۲۸۰ ق م میں بالکل مجبور ہو کر اپنی طبیعت کا وہ رنگ بھی دکھایا جس سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں اپنے باپ ڈیمی تریوس "فاتح بلاد" اور اپنے دادا انٹی گونس اول کا خون اسکی رگوں میں موجود ہے۔ یہ اسطرح ظاہر ہوا کہ جسوقت ایشیائے کوچک میں ایک موقع پر کوئی حاکم نہ رہا تو فوراً ایشیا پر قبضہ کرنے کو تیار ہوگیا۔ لیکن ماسوا اسکے اُسکے کام بالعموم ایسے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ملکۂ فایلا کا فرزند اور اپنے ماموں کیسانڈر اور نانا اینٹی پاٹر کے طریقۂ عمل کا پابند رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جسوقت سنہ ۲۷۷ ق م میں مقدونیہ سے کلٹ کی قوم کو پسپا کر دیا تو پھر اپنی ماں کے بزرگوں کے قدم بقدم چلکر مقدونیہ کا نظم حکومت قائم کیا۔

گوناٹاس کی حکومت بڑی مبارک ساعت سے شروع ہوئی تھی۔ یعنی سلطنت مصر سے اسکے دوستانہ مراسم قائم ہو چکے تھے۔ اسکا علم نہیں کہ یہ واقعہ کب اور کسطرح اور کیا معاوضہ پیش کر کے وقوع میں آیا۔ مگر نتیجہ اس دوستی کا یہ ہوا کہ یونان کے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے لگا۔ مقدونیہ کے تخت پر بیٹھتے ہی اپنا عقد اپنی حقیقی بھتیجی یا بھانجی فایلا سے کیا جو انتی اوکس اول کی (مسٹر) حقیقی بہن تھی۔ انتی اوکس سے حال ہی میں اس عقد کی وجہ سے ایک عہد نامہ اس مضمون کا فریقین میں ہوا کہ انتی گونس نے ایشیائے کوچک میں حکومت کے حق سے دست برداری کی اور انتی اوکس نے پسر سلیوقس ہونے کی حیثیت سے مقدونیہ کے تخت سے اپنا دعوے اٹھا لیا۔ اس عہدنامے کا ایک عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۰ برس تک (۲۷۷-۱۹۷) شاہان سلوقی سے مقدونیہ کے تاجداروں کو کامل پناہ میسر رہی۔ نہ کوئی لڑائی ہوئی اور نہ کوئی سازش مصر کے بادشاہوں سے مراسم دوستی گو اتنی مدت تک نہ رہ سکے جیسے کہ سلوقیہ سے

سلہ جو رشتہ داریاں مصنف نے اس سے پہلے اپنی کتاب میں بیان کی ہیں انسے ظاہر نہیں ہوتا کہ فایلا - انتی گونس گوناٹاس کی حقیقی بھتیجی یا بھانجی تھی۔ ذیل کا نقشہ مصنف کے بیان کے مطابق بنایا گیا ہے۔ (دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۲۲۰)



اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انتی گونس گوناٹاس نہ تو سلیوقس پدر فایلا کا حقیقی بھائی تھا اور نہ سلیوقس کی بیوی جو بلخ کی شہزادی تھی انتی گونس گوناٹاس کی حقیقی بہن ہو سکتی تھی۔ پھر کسطرح فایلا کو انتی گونس گوناٹاس کی حقیقی بھتیجی یا بھانجی سمجھا جاوے یہ عقل میں نہیں آتا۔

(مترجم)

رہے تھے پھر بھی دس برس (۲۷۷ - ۲۶۷ ق م) کا زمانہ امن وعافیت کا ایسا گذرگیا
کہ گونا تاس نے اپنی قوت کو استحکام دے لیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جس میں انتی گونس چپ چاپ
اپنی قوت بڑھاتا رہا۔ بیچ میں کسی قدر خلل اُسوقت پڑا جبکہ مقدونیہ اور ایپروس کا (۲۲۴)
بادشاہ پرہوس ایطالیہ سے واپس آکر مقدونیہ اور یونان کی حکومت کا دعویدار
ہوا اور پھر مقدونیہ اور یونان میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ لیکن جب آرگوس کی
لڑائی میں پرہوس مارا گیا تو پھر مقدونیہ اور ایپروس کی سلطنتوں میں پہلی سی
کشش نہ رہی۔ پھر بھی اس واقعے کے ۲۲ برس بعد تک یعنی جب تک موت نہ آئی
انتی گونس ایپروس کی حکومت کو اُن حکومتوں میں سمجھتا رہا جو اُس سے برسرِ پیکار
رہتی تھیں یا اگر ایسا ہوتا تو بھی اسکا دشمن ہو جانا ہر وقت ممکن تھا۔

انتی گونس کو دردانیوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جو ہر وقت مقدونیہ پر حملہ کرنیکی
دھمکی دیتے رہتے تھے۔ شمال مشرقی اطراف میں کلٹ کے غارتگر گروہ موجود تھے جنہوں
نے تھراسیا کو برباد کرکے بدنظمی کی وہ ہی شان پیدا کردی تھی جسمیں تمام یورپ اسوقت
مبتلا تھا۔ انتی گونس نے کلٹ اور دردانیوں کے دفع کرنے میں یونان کے ساتھ
فی الحقیقت بڑا سلوک کیا۔ ان دشمنوں کی زد سے اس ملک کو قطعی محفوظ کردیا۔
مگر یونانیوں نے اسکا احسان نہ مانا اور یہ اس سے ظاہر ہے کہ جسقدر مشکلات
انتی گونس یا اسکے جانشینوں کو پیدا ہوئیں انکی اکثر کا باعث یہ ہی تھا کہ یونان پر
اُس نے اپنا تسلّط قائم کرلیا تھا۔

انتی گونس نے جسطرح اپنے ہمقوم شاہان سلف کی مثل مقدونیہ کے ساتھ
سلوک اور وفاداری کا شعار رکھا تھا اسیطرح یونانیوں کے تعلق میں بھی اپنا
طریقۂ عمل پرانے طرز کا رکھا۔ یعنی یونان کی ریاستوں کو اپنا ماتحت مددگار بنانا
چاہا۔ اور ایسی ریاستوں میں جو خود اپنی حکومت کا انتظام کرتی تھیں ہر جگہ ایک
شخص کو اپنا وکیل یا نائب مقرر کرکے فی الواقع اُسکو ریاست کا حاکم بنا دیا اور
اس طریقے سے اپنی قوت میں استحکام پیدا کرنیکی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ جس ریاست
میں ایسا نائب مقرر کیا گیا ہوگا خاص وہاں کے مخالفوں نے اُسکو ایک غیر آئینی حاکم
شمار کیا ہوگا۔ فی الواقع یہ منصب تھا بھی ایسا کہ جو شخص اُسپر مقرر ہو ایک غیر آئینی

حاکم کی طرح عملدرآمد کرنے لگے۔ کیونکہ جب تک یہ حاکم ہر قسم کے قانون دیوانی و
فوجداری میں خلل نہ ڈالے اِس منصب پر قائم نہیں رہ سکتا تھا لیکن دکھانے کو قانون
کی پابندی قائم رکھی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ یہ حاکم اگر اپنی مدد کے لیئے مقدونیہ سے
فوج طلب کرتا تھا تو وہ خود اور اسکے ساتھی اس فوج کی آمد کے ذمہ دار ہوجاتے تھے (۲۲۵)
انتی گونس گوناتاس اور اسکے حکام ماتحت میں سے کم از کم چند لوگ ضرور حکیم
زینو کے شاگرد تھے۔ اس بارے میں یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ مثلاً جسطرح اسکندر اعظم
نے اپنے تئیں ایک مرد خوشخصال و نیک کردار سمجھکر جسکی نسبت اسکے استاد ارسطاطالیس
کا قول تھا کہ کسی حکومت میں کامل بادشاہی ایسے ہی شخص کو زیب دیسکتی ہے مگر اس
قول کے سوا استاد کے دیگر اصول سیاسیات سے جو اسکی تصنیفات میں خصوصیت
سے بیان ہوئے تھے مجبوراً قطع نظر کرکے بادشاہی قبول کی تھی اسیطرح انتی گونس
نے اپنے استاد زینو کے فلسفہ سے محض اتنا نتیجہ نکال لیا تھا کہ بادشاہی کا مستحق ایک
دانشمند کامل کے سوا دوسرا شخص نہیں ہوسکتا۔ اس مرد دانشمند کی عقل کے مقابلہ میں
ریاستوں کے قوانین کوئی چیز نہ تھے اور اگر وہ انکو نظر انداز یا انکے خلاف عمل کرتا تو
اِن قوانین میں اتنی قوت نہ تھی کہ اسکا مقابلہ کرسکتے۔ کیونکہ اس مرد عاقل کے
نزدیک یہ کل قوانین فطرت کے خلاف تھے اور اسلیئے وہ موجب خرابی تھے۔ یہ یقین
کیا گیا تھا کہ دانشمند سے کوئی خطا نہیں ہوسکتی۔ اور چونکہ وہ اپنے افعال میں اپنی
ذات سے ایک قانون ہوتا ہے اسلیئے اخلاق قانونیت پر غالب رہتا ہے۔ انتی گونس
نے اس طریقہ کو پسند نہ کیا کہ اپنے ہر ایک کام کو جائز ثابت کرنے کیلیئے انسان ہوکر
دیوتاؤں کے اختیارات حاصل کرتا اور گو حکیم زینو کے فلسفہ میں ویدانت کے مسائل
اسطرح بیان ہوئے کہ اگر کوئی شخص انتی گونس کو دیوتا بناکر پوجنا چاہتا تھا تو وہ
حارج نہ ہوتے لیکن خود انتی گونس پر کوئی قانونی مجبوری نہ تھی کہ وہ دیوتا ہی بنکر
ظاہر ہوتا۔ بلکہ اگر وہ ایسا کرتا تو اسی فلسفہ میں مذہب کے متعلق قدامت پرستی
کے جو احکام تھے اُنسے ٹکر کھانی پڑتی۔ پس انتی گونس کو اِس مضمون کے متعلق کہ
ماتحت ریاستوں کے سر پر غیر آئینی حاکم بٹھادیئے ہیں یا قانون کے خلاف چل کر
لوگوں پر خود زیادتی کرتا ہے یا دوسروں کو ایسی ہی زیادتی کی اجازت دیتا ہے۔

اپنے قلب وایمان کو تسلی دینے میں مطلق دشواری نہ تھی۔ مگر اسمیں اتنی بات سمجھنے کی قابلیت (۲۲۶)
ضرور موجود تھی کہ اگر اسکے افعال کو حکیم زینو نے جائز قرار دیدیا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا
چاہیئے کہ مقدونیہ اور یونان کے لوگوں کے ساتھ جو کچھ برتاؤ وہ کرے وہ سب روا ہوگا۔
مقدونیوں اور یونانیوں سے یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ انتی گونس کو فلسفہ زینو کا بڑا
گیان جائز سمجھ لینے کہ بس اس سے اب کوئی خطا یا ناصواب کام نہ ہوگا۔ اور اگر اس
سے کوئی نار وا کام ہوگا تو یہ سمجھ کر کہ وہ دانائی میں کامل ہے اسلئے ایسے کام کو درست
سمجھ لیا جائیگا۔ گو اسنے اپنی طرز حکومت کو فلسفہ کی بنیاد پر قائم کیا لیکن کوئی شہادت
ایسی نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ وہ مقدونیوں کے حق میں ایک محتاط بادشاہ یا
یونانی ریاستوں کا ایک لائق سردار نہ تھا۔ اور اگر اسکو اتنا موقع دیا جاتا کہ وہ یونانی
ریاستوں کے مسئلہ حکومت کو تنہا حل کرتا اور باہر سے کسی قسم کی دست اندازی نہوتی تو
بالکل ممکن تھا کہ اپنے فرائض منصب کا لحاظ کر کے جنکا خیال اسکے دل میں مضبوطی کیساتھ
موجود تھا اور تحمل اور بردباری کی قابلیتوں کو عمل میں لاکر جو اسکی طبیعت کا خاصہ
تھیں وہ حکومت کا کوئی ایسا طریقہ پیدا کر دیتا جس سے یونان کیلئے ایک بڑا زمانہ
امن وعافیت کا پیدا ہو جاتا۔

مقدونی شہنشاہی کا بانی اوّل فیلقوس ثانی تھا۔ یہ بادشاہ جسوقت یونانی
ریاستوں کا سرگروہ بنا تو دولت ایران نے اسکی مخالفت کی۔ مگر اس مقابلہ میں
شہنشاہ ایران ارتازرکسیز کی سیاسی تدابیر کے جواب میں جو مشکلات فیلقوس ثانی کو
پیش آئیں وہ ان مشکلات کے سامنے جو انتی گونس گوناتاس کے ماموں کیساندر
کو انتی گونس گوناتاس کے دادا انتی گونس اوّل کے وعدوں اور فوجوں سے اٹھانی
پڑتی تھیں یا بادشاہ مصر بطلیموس فیلادلفیوس نے اپنی سازشوں اور رشوتوں
اور عزیمتوں سے گوناتاس کی راہ میں پیدا کی تھیں بالکل خفیف تھیں۔

انتی گونس گوناتاس کے دور حکومت کے پہلے دس برس میں یعنی ۲۷۷ء سے ۲۶۷ء ق م
تک حالات کی جو صورت رہی وہ انتی گونس کی پیدا کی ہوئی نہ تھی۔ اور نہ فیلادلفیوس
اسکا ذمہ دار قرار پاسکتا ہے۔ یہ صورت فی الحقیقت بطلیموس اول سوتر کی پیدا (۲۲۷
کی ہوئی تھی۔ جسنے دیمی تریوس "فاتح بلاد" کی شکست کے زمانے میں (۲۸۷۔۲۸۶)

تمام یونانی سمندر پر اپنا قبضہ کرلیا تھا اور اِس قبضے کے ساتھ ہی جزیرہ والوں کا لیگ بھی اسکے قابو میں آگیا تھا۔ یہ سمندر اسوقت فیلا دلفیوس اور انتی گونس کی سلطنتوں میں ایک حد فاصل ہوگیا گو اِس حد کو صحت کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں۔ شروع میں انتی گونس نے سمندر پر حکومت کے معاملے میں زیادہ دماغ سوزی نہیں کی۔ اور حقیقت بھی یہ ہی ہے کہ ۲۶۶۔ ۲۶۵ ق م میں جو بحری معرکہ جنگ کریمونیدی کے نام سے شاہانِ مصر و مقدونیہ میں ہوا اسکا ابھارنے والا فیلا دلفیوس بادشاہِ مصر تھا نہ کہ انتی گونس بادشاہِ مقدونیہ فیلا دلفیوس کی سگی بہن آرسینوی جو فیلا دلفیوس کی ملکہ بھی تھی اس لڑائی کا اصلی سبب ہوئی تھی گو لڑائی شروع ہونے سے چار برس پہلے اسکا انتقال ہوچکا تھا۔ مگر جو مسلک سیاسی وہ قائم کرگئی تھی اُسی پر فیلا دلفیوس چلا۔ چنانچہ اسپارٹا کے بادشاہ اریوس اول اور اسکے حلیفوں سے یعنی اکائیا۔ ایلیس۔ مانتی نیا۔ فلیوس کی ریاستوں اور جزیرہ اقریطش کے ایک حصہ کی ریاست سے اور پھر ایتھنز سے اتحاد کرلیا اور جب اِن ریاستوں نے ملکر یہ تصفیہ کیا کہ یونان کو انتی گونس اور غیر آئینی حکام سے آزاد کیا جاوے تو پھر اُنکی مدد کی۔ اس لڑائی کی غرض فیلا دلفیوس اور اسکی ملکہ آرسینوی کے دل میں فی الواقع کیا تھی اسکا علم واقعی کسی کو نہیں۔ صرف قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر اس لڑائی کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ سوائے اسکے کچھ نہ تھا کہ انتی گونس کو پانچ برس تک سخت لڑائیوں میں مصروف رہنا پڑا۔ ایتھنز کی تباہی پوری پوری ہوئی اور اسپارٹا میں جو امن وامان بزور شمشیر پیدا کیا جاتا تھا وہ بخوبی قائم ہوگیا۔

علاوہ اسکے ایک اور بات بھی پیدا ہوئی جسکے پیدا ہونے کے سامان مدت سے ہورہے تھے۔ وہ یہ کہ ریاستہائے شہری میں جو قاعدہ مدت سے چلا آتا تھا
کہ یورپ میں کل یونان کی سرداری اِن ہی میں سے کسیکو حاصل رہے وہ بالکل مٹ گیا (۲۲۸)
اور اسکی جگہ یہ ہوگیا کہ جو بڑی تحریک پیدا ہوتی تھی وہ کسی شہری ریاست کی جانب سے نہ ہوتی تھی بلکہ ایک ایتھنی یعنی گروہ سے ہوتی تھی۔ خود مقدونیہ کے لوگ ایک گروہ (ایتھنوس) یا بہت سے گروہوں کا مجموعہ تھے۔ اس گروہ بندی کو وسعت دینے کا ممکن طریقہ یہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ جزیرہ نما میں جو اور گروہ آباد تھے انکو بھی شامل کرلیا جائے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اِن گروہوں کے علاوہ دو بڑے گروہ

ایٹولیا اور اکائیا کے تھے۔ ایٹولیا والے وسط یونان میں رہتے تھے۔ اور اکائیا والے پیلو پونے سس میں۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی گو اسکا اثر دور تک نہ پہنچا تھا کہ اور گروہوں کو اپنے گروہ میں شامل کرکے وسعت حاصل کرے۔ جس صورت میں کہ ایٹولیا والے پیلو پونے سس اور اکائیا والے وسط یونان میں زیادہ ملک حاصل کرنا چاہتے تھے اور اسی بناء پر اکثر آپسمیں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور جس صورت میں کہ دولت مقدونیہ نے کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو یعنی ۲۴۵ - ۲۴۱ ق م میں ایٹولیا کو اور ۲۲۰ - ۲۱۷ ق م میں اکائیا کو ایک دوسرے کے خلاف لڑائی میں مدد دی تھی۔ اور یہ دونوں گروہ بھی صرف ایک مرتبہ مقدونیہ کے خلاف ایک لڑائی میں شریک ہوئے تھے۔ تو پھر اکائیا نے ۲۲۴ ق م تک اور ایٹولیا نے ۲۳۰ ق م تک گروہوں (الحفی) اور ایسی شہری ریاستوں کو جو اپنے بل بوتے پر قائم نہیں رہ سکتی تھیں اسباب کا عمدہ موقع دیا کہ وہ مقدونیہ کی سیادت کی جگہ اکائیا یا ایٹولیا کی سیادت قبول کریں۔ ہر ایک نئے گروہ کی سابقہ شہری ریاستوں کی مثل یہ بھی خواہش ہوئی کہ وہ آزاد و خود مختار ہو۔ اکائیا اور ایٹولیا بھی اس بارے میں بالکل ہمخیال تھے۔ اس زبردست قوت کا مقابلہ انتی گونس کو کریمونیدی کی لڑائی کے بعد ہی نہیں بلکہ پہلے بھی کچھ کم پیش نہ آیا تھا۔

کریمونیدی کی لڑائی سے انتی گونس ایسا سرخ رو ہوکر نکلا کہ دس برس تک کسی گروہ کو اسکی سیادت پر اعتراض کرنیکی جرات نہیں ہوئی۔ اس زمانہ میں اسکا سب سے بڑا دشمن بطلیموس فیلادلفیوس ایک سخت و خطرناک ہنگامہ کے فرو کرنے میں جو علاقہ آئیونیا میں برپا ہوا تھا مصروف رہا۔ اس ہنگامہ کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ اسکے (۲۲۹
"لڑکے" بطلیموس نے اور اسکے امیر بحر تیمارہ کوس نے اس علاقہ میں بغاوت برپا کردی تھی۔ تیمارکوس کی مدد پر فیلادلفیوس کا دشمن انتی اوکس ثانی جو ہر وقت موقع کا منتظر رہتا تھا پہنچ گیا تھا۔ اور جزیرہ روڈس[1] کے لوگ بھی جو سمندر پر فیلادلفیوس کے

[1] ریاست روڈس اور فیلادلفیوس کی عداوت بلنکن برگ کی کتاب "لاکر دینیکے دوتیملی لندیٔن" سے ثابت ہے پر احتمال ہے کہ افیسوس کے مقام پر اکا خوستراتوس کے مقابلہ میں کریموناندیس کی شکست اسی شدید ہنگامہ سے متعلق ہے۔

حریفان مقابل تھے تیمارکوس کو مدد پہنچا رہے تھے لیکن ۲۵۵ ق م میں جسوقت یہ ہنگامہ فرو ہوکر صلح[1] ہوگئی تو انتی گونس سمجھ گیا کہ اب یونان میں نئے فتنے برپا ہونگے چنانچہ اسنے مصمم ارادہ کرلیا کہ ابتک تو سپر بنکر دوسروں کے وار سہے تھے اب خود تلوار بنکر دوسروں پر وار کرنا چاہئیے۔ اس خیال سے جنگی جہازوں کا بیڑا تیار کرنا ضروری سمجھا تاکہ بحر ایجین سے مصر کا تسلط اٹھا دے۔ یہ وہ سمندر تھا جسپر ۲۸۸ ق م سے پہلے اسکے باپ اور دادا کا قبضہ رہا تھا۔ اس قصد کی تکمیل کیلئے اسنے بادشاہ شام سے پھر مراسم دوستی پیدا کئے اور اپنے لڑکے اور وارث دیمی تریوس کی شادی بادشاہ شام انیتی اوکس ثانی کی بہن استراتونیکی سے کردی۔ جب یہ عقد ہوگیا تو اسنے بطلیموس کے افسران بحری سے کوس کے قریب لیوکولا کے مقام پر مقابلہ کیا اور ایک سخت بحری لڑائی میں (۲۵۳ ق م) اُن کو قطعی منہزم کردیا۔ اس سے ایک بڑا نفع تو یہ ہوا کہ جزیرے والوں کے لیگ پر سرداری حاصل ہوگئی۔ اور اس سے بھی بڑھکر یہ ہوا کہ اب اُسکا جنگی بیڑا یونان میں ہر طرح کا فتنہ فرو کرسکتا تھا اور بطلیموس کی حدود سلطنت میں ہر طرح کا فساد اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ اس اخیر بات کو تو اسطرح انجام دیا کہ اپنے سوتیلے بھائی دیمی ترایوس کو جسکا لقب "خوبرو" تھا سایرینی کے ملک پر چڑھائی کا حکم دیا۔ اسوقت میگاس کی موت (۲۵۰-۲۵۱) کی وجہ سے اُس ملک کا کوئی حاکم نہ رہا تھا اسلئے موقع اچھا دیکھکر ملک سایرینی کو مصر کے قبضے سے نکال لیا۔ دوسرے امر میں کامیابی کی صورت ایک اتفاق سے نہ ہوسکی۔ اور وہ اتفاق یہ تھا کہ ۲۵۱ ق م میں ابراتوس نے جو اکائیا والے لیگ کا ایک عجیب و غریب سردار تھا سیون کے شہر کو جو اس کا مولد تھا دفعتًا حملہ کرکے لے لیا تو اسنے بادشاہ مصر سے رشوت میں ایک میعادی رقم (۲۳۰)

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ گو میرے خیال میں ۲۴۲ ق م کی نسبت بھی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ دیکھو ہیلینی ایتھنز صفحہ ۱۹۷ حاشیہ ۲۔

[1] اس صلح کے بارے میں دیکھو "کتابہ گریکی" ۱۲-۲-۱۱۶۔ اسکا اثر ایتھنز میں (ہیلینی ایتھنز صفحہ ۱۱۹) اور اکائیا میں ظاہر ہے۔

لینی ہی منظور نہ کر لی بلکہ سیسون کی ریاست کو بھی قریب کے اکائیا والے گروہ میں شامل کر دیا۔ اور ان واقعات کے قلیل عرصہ کے بعد بھی بادشاہ مصر نے انتی گونس پر ایسا سخت حملہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلا حملہ بھی بہت معنی خیز تھا۔ ۲۵۱ ق م میں انتی گونس کا بھانجا الگزاندر اپنے ماموں کی طرف سے یونان کا والی تھا۔ مگر بلاشبہ بادشاہ مصر کے اغوا سے باغی ہو کر خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ کالکس اور کورنتھ کو جن پر اپنے ماموں کی طرف سے حاکم تھا اپنے تصرف میں لا کر اور مقدونی بیڑے پر قبضہ کر کے جنکے قیام گاہ کالکس اور کورنتھ کے بندر گاہ تھے۔ ان بندر گاہوں کو لڑائی کی غرض سے اپنا صدر مقام بنا لیا۔ اور فوراً اکائیا والوں سے سازش کر کے ارگوس اور ایتھنز کو خراج دینے پر مجبور کیا (یہ واقعہ ۲۵۰۔ ۲۴۹ ق م سے پہلے کا ہے)۔ اس شدید بغاوت نے انتی گونس کی بحری قوت کو بالکل کمزور کر دیا۔ اسمیں ہرگز شبہ نہیں کہ انتی اوکس ثانی کے دل میں جو بدخواہی مقدونیہ سے تھی اسی کی وجہ سے اس بغاوت میں شدت و تیزی پیدا ہوئی۔ کیونکہ ۲۴۹ ق م میں یا اس سے پہلے انتی اوکس نے مقدونیہ سے عہد شکنی کی اور مصر سے اتحاد کر لیا۔ لڑائی کے زمانہ میں جو مقامات فتح کئے تھے انپر اپنا قبضہ بھی قائم رکھا اور بادشاہ مصر فیلاڈلفیوس کی اکلوتی بیٹی برنیس سے عقد بھی ہو گیا۔ اس ملکہ کی قدر بادشاہ کی بیٹی ہونے کے علاوہ اسوجہ سے اور زیادہ ہو گئی کہ اپنے ساتھ بیکراں دولت اور جہیز لائی تھی۔ انتی اوکس کی اس تنگ ظرفی سے جو بعد کو حماقت بھی ثابت ہوئی بطلیموس کو موقع ملا کہ مقدونیہ سے لڑنے میں اپنی پوری طاقت سے کام لے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کا بیڑا پھر بحر ایجین کا مالک بن گیا اور جزیرہ والوں کا لیگ پھر قابو یافتہ ہو گیا۔ (۲۴۹ ق م) اسی زمانہ میں سائرینی میں دیمی تریوس "خوبرو" کو اس فریق نے ہلاک کر دیا جو بادشاہ مصر کا ہوا خواہ تھا۔ اور سائرینی کی نوجوان ملکہ برنیس کا عقد فیلاڈلفیوس کے لڑکے سے کر دیا جو باپ کے بعد تخت مصر کا وارث تھا۔ اور اس ترکیب سے حکومت سائرینی کو سلطنت مصر میں پھر شامل کر دیا جو میگاس پدر برنیس کی بغاوت کے زمانے سے (۲۷۴ ق م) مصر سے باغی ہو کر خود مختار ہو گئی تھی۔ بطلیموس بادشاہ مصر کی تدابیر میں پوری کامیابی

اسوقت ہوئی جس وقت اسکی بیٹی برنیس کے ہاں جسکی شادی انتی اوکس ثانی بادشاہ شام سے ہوئی تھی لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا سلطنت شام کا وارث تخت تھا کیونکہ برنیس کے عقد کے وقت یہ شرط ہوگئی تھی کہ اسکے بطن سے جو لڑکا ہوگا وہی اپنے باپ کے بعد تخت کا مالک ہوگا۔ اس لڑکے کی پیدائش سے ظاہر ہوتا تھا کہ بطالمہ مصر کا ستارۂ اقبال آیندہ اور بھی آب وتاب سے چمکنے والا ہے۔

مگر سنہ ۲۵۰ لغایت سنہ ۲۴۵ ق م میں گوناتاس کا دریائے اقبالمندی بالکل حالت جزر میں تھا اور الگزاندر اور ایراتوس بادشاہ یونان اور بحر ایجین میں فیلادلفیوس کے امرائے بحری نے وہ طوفان برپا کر رکھا تھا کہ گوناتاس کو اپنا سر اونچا کرنا دشوار تھا۔ مگر حسن اتفاق سے ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ گوناتاس پھر سنبھل گیا۔ اور وہ واقعہ یہ تھا کہ مصر اور ایشیا میں ایک لڑائی شروع ہوئی اور لڑائی کی وجہ یہ ہوئی کہ انتی اوکس ثانی کے مرنے پر اسکی پہلی بیوی ملکہ لاذقیہ نے جو اپنے شوہر کی حقیقی بہن بھی تھی اپنی سوت ملکہ برنیس اور اسکے شیرخوار بچہ کے مقابلہ میں لڑائی شروع کی تاکہ اپنے لڑکے سلیوقس کالی نیکوس کو تخت شام کا وارث بنائے۔ اسی زمانے میں فیلادلفیوس کی بے وقت موت سے لاذقیہ کو لڑائی کرنیکا اچھا موقع ملگیا۔ اور باوجودیکہ مصر کا بیڑا ملکہ لاذقیہ کو روک رہا تھا مگر اس خونخوار ملکہ کو برنیس اور اسکے بچہ کے ہلاک کرنے میں کامیابی ہوگئی۔ جب برنیس کو لاذقیہ نے ہلاک کرادیا تو برنیس کا بھائی یوارگتیس جو اپنے باپ فیلادلفیوس کے بعد مصر کا بادشاہ ہوا لاذقیہ کی اس بیرحمی پر غصہ سے اپنے آپے میں نہ رہا اور خود ایک لشکر جرار لیکر خشکی اور تری دونوں جانب سے لاذقیہ اور اسکے ساتھیوں پر
(۲۳۲) حملہ آور ہوا۔ اور ایک طولانی جنگ کا سلسلہ چھڑ گیا۔ مگر گوناتاس کے لئے یہ سلسلۂ جنگ بہت مفید ثابت ہوا اور اسکا اقتدار جو زوال پذیر ہوچلا تھا پھر سنبھل گیا۔ بہرصورت ملکہ برنیس اور اسکے دودھ پیتے بچے کے قتل کا دردناک واقعہ ان چند واقعات میں سے تھا جن میں خوش نصیبی نے گوناتاس کا ساتھ دیا تھا۔ دوسرا واقعہ جس نے گوناتاس کی قوت کو پھر سرسبز کردیا یہ تھا کہ اسکا بھانجا الگزاندر جوان مرگیا (۲۴۶ ق م) اور اسکے بعد ہی ایٹولیا والوں نے

بیوشیا کو فتح کرلیا ۔ اور الگزاندر کی بیوہ نیکیا نے فیصلہ کرلیا کہ کورنتھ اور اپنے متوفی
شوہر کے دیگر مقبوضات کو مقدونیہ کے حوالے کردے اور اپنا عقد گوناتاس کے
ولی العہد دیمی تریوس سے کرلے جسکی پہلی بیوی استراتونیکی علاوہ لاولد رہنے کے بدنام
بھی ہوچکی تھی۔ ۲۲۵ء ۔ ۲۲۳ء ق م میں ملکہ لاذقیہ کو ایشیا میں کامیابی ہوتی رہی
اور گوناتاس نے اپنے دیوتا پان کی تائید سے جزیرہ ڈیلوس کیساتھ دیگر جزائر
پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور اسطرح الگزاندر کی بغاوت سے جو مقامات گوناتاس کے
قبضے سے نکل گئے تھے وہ پھر اسکے قبضے میں آگئے ۔ اور مصر سے بھی معاملات
طے ہوکر اب گوناتاس کو صرف ایراتوس بادشاہ سیون سے سمجھنا رہ گیا ۔ مگر ایراتوس
اکائیا والا بڑا چلتا پرزہ تھا ۔ اسکو گوناتوس کب پاسکتا تھا ۔ چنانچہ ایراتوس نے
ایک رات حالتِ امن میں دھوکا دیکر کورنتھ پر حملہ کیا (۲۲۳ ق م) اور اسپر
قبضہ کرکے فوراً اسکو اور میگارا اور ایپی داروس اور تریزن کو اکائیا والے لیگ
میں شامل کردیا ۔ جب اِن مقامات کو اکائیا والے لیگ میں شامل کرلیا گیا تو
گوناتاس کو بھی اِس زیادتی کا جواب کرنا پڑا اور اُسنے ایٹولیا والوں سے ملکر
کوشش کی کہ اکائیا کے مقبوضات پر قبضہ کرکے نصف خود لے اور نصف ایٹولیا والو
کو دے ۔ ایراتوس نے گوناتاس کا یہ قصد دیکھتے ہی اس خطرے سے بچنے کی یہ تدبیر
نکالی کہ کل ذمّہ داری ایسے شخص کے سر ڈالدی جسکو واقعی ذمّہ دار ہونا چاہیے
تھا یعنے یوارگتیس بادشاہِ مصر کو ۲۴۲ء کیلئے اکائیا والے لیگ کا سالارِ اعظم
خشکی و تری دونوں کا مقرّر کرادیا ۔ اسی سال یوارگتیس کو ملکہ لاذقیہ کے فرزند
کالی نیکوس بادشاہِ شام پر فتح حاصل ہوئی تھی ۔ اور اسنے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ
لاذقیہ نے جو سلسلۂ جنگ چھیڑ دیا تھا اسکو کسی طرح صلح کرکے ختم کردے ۔ مگر اسکی
یہ کوشش کہ ایراتوس کو مدد پہنچائی جائے سرسبز نہوئی ۔ ایراتوس اسوقت
ایتھنز کو آزاد کرنے کیلئے لڑ رہا تھا ۔ بحرِ ایجین میں گوناتاس سے یوارگتیس کا
امیر البحر سوفرون دست و گریباں تھا ۔ مگر گوناتاس پھر ایک آزمودہ کار لڑنے
والا تھا ۔ اسنے سوفرون کو جزیرہ اندروس کی قریب شکست دیدی ۔ بحرِ ایجین
مقدونیہ ہی کے قبضہ میں رہا ۔ اسی اثناء میں ایٹولیا والوں نے جو مقدونیہ کے

حلیف تھے اور ہیوشیا پر مسلط ہو کر بہت ہی خطرناک ہو گئے تھے اولمپیاس کو کئی معرکوں میں شکست دی۔ اولمپیاس علاقہ ایپیروس کی با اختیار ملکہ تھی۔ اس کامیابی سے ایٹولیا والے بالکل تیار ہو گئے کہ تمام علاقہ اکرنانیہ کو اپنے لیگ میں شامل کریں گوناٹاس بادشاہ مقدونیہ نے سوچا کہ اب لڑائی بند کرنی چاہیئے۔ یوارگیٹیس بادشاہ مصر اور کالی نیکوس بادشاہِ شام کا بھی ایسا ہی قصہ ہوا۔ اور یہ طولانی سلسلہ لڑائی کا سنہ ۲۴۲-۲۴۱ ق م میں اس بناء پر کہ جو شخص جس چیز پر قابض ہے اسپر قابض رہے ایک صلح نامہ کے بعد خاتمہ کو پہنچا۔ گوناٹاس کے قبضہ میں آرگوس۔ ہرمیونی فلی یوس۔ ایجائنا۔ میگالوپولس اور ارکومینوس علاقہ پیلوپونیس میں اور ایتھنز صرف یونان متوسط میں رہے۔ اور بحر ایجین میں یوبیا اور جزائر سائکلیڈیس اور بظاہر ایتھنز کی نوآبادیاں یعنی لمنوس۔ امبروس اور اسکائیروس رہے تھسالیہ پہلے ہی سے اسکے قبضہ میں تھا۔ اور دیمی ٹریاس۔ کالکیس اور پیریوس میں اسکی فوجیں موجود تھیں۔ اور ان ریاستوں میں جو یونان کی زنجیر پا سمجھے جاتے تھے صرف کورنتھ کا علاقہ ایسا تھا جو اسکے قبضہ سے نکل گیا تھا۔ سنہ ۲۴۰ و ۲۳۹ ق م میں انٹی گونس گوناٹاس نے ۳۴ برس بادشاہ رہکر اسّی برس کے سن میں انتقال کیا اور ۳۴ برس میں سے دس برس وہ مقدونیہ کا بادشاہ رہا۔

میں نے انٹی گونس گوناٹاس کا تذکرہ کسیقدر تفصیل سے کیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس عجیب و غریب شخص کے حالات کو بقید زمانہ لکھنا صرف
(۲۳۴) حال کی تحقیقات سے ممکن ہوا ہے اور اسکے دورِ حکومت کے واقعات بھی ایسے ہیں جنکا بخوبی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اِس بادشاہ کو وہ مشکل زمانہ ملا تھا جبکہ یونانیوں کی شہنشاہی قریب زوال آچکی تھی۔ اہمیت میں اسی کے مساوی دوسرا زمانہ وہ تھا جبکہ اسکندر اعظم نے بادشاہوں کو دیوتا بنانیکا طریقہ جاری کیا تھا اوپر جسقدر حالات بیان ہوئے ہیں میری دانست میں اونسے بخوبی ظاہر ہو گیا ہے کہ سلطنت مقدونیہ میں اتنی قوّت نہ تھی کہ وہ گوناٹاس کے سیاسی طریقوں کی پابند ہو کر اور سلطنت مصر کی طرف سے مخالفت کی حالت میں یونان پر قابو رکھ سکتی۔ سنہ ۲۴۲-۲۴۱ ق م میں مقدونیہ کی کامیابی کے بعد بھی مصری فوجیں

تھریس اور بحر مارمورہ اور ای اونیا میں اور اکثر جزیروں میں جو بحر ایگین میں
دور تک واقع تھے مثلاً ساموس۔ لیسبوس۔ تھیسوس اور سوماتھرکی میں جمی ہوئی
اٹولیا کے قبضہ میں کچھ حصّہ اکرنانیہ کا اور دولوپیا۔ اینیانیہ۔ مالیس۔ دوریس
دوکریس۔ فوکس رہے اور بیوشیہ سے بھی قریب کا واسطہ رہا تھسلی میں یہ اکلیہ
اور اور دلفای مع اپنی "مجلس ہمسایگان" (امفکتیونی کونسل) کے اٹولیا (۳۵
والوں کا ساتھ دیتے رہے۔ پس جسوقت مقدونیہ کے بادشاہ دیمی تریوس ثانی
نے اولمپیاس کی لڑکی فیتھیا سے عقد کیا اور اکرنانیہ کا وہ حصّہ جسکو اپیروس سے
تعلّق تھا اپنے قبضہ میں کرلیا (۲۴۰-۲۳۹) اور جب اٹولیا اس چال سے
مات کھاکر اکایا سے جاملا تاکہ مدافعت ومحاربت میں ایک دوسرے کا مددگار رہے
تب اٹولیا اور اکایا کے لیگوں کی حدودِ ارضی جو اسوقت مقدونیہ کے خلاف ہوگئے
تھے ایک دوسرے سے آ لگئیں۔ اور اسطرح ملیں کہ خلیج کورنتھ کو بالکل بیچ میں لے لیا
اِن لیگوں میں سے ایک نے تو باوجود گوناٹاس کی سخت مخالفت کے اور دوسرے
نے اوسکی اعانت واشارہ سے طاقت پکڑی تھی۔ گوناٹاس نے اٹولیا والوں کی
لگام ڈھیلی چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ اِن سے اِسکو ہمیشہ مصر اور اپیروس اور اکایا کے
مقابلہ میں مدد لینی پڑتی تھی۔ اب حالت یہ ہوئی کہ اپیروس کو تدبیر امور ملکی میں مقدونیہ
کا ایساہی پابند ہونا پڑا جیسے کہ ۲۹۵ قم میں پیرہوس کی تخت نشینی سے پہلے
حال رہ چکا تھا۔ لیکن اکایا اور اٹولیا کے دونوں لیگ ان دونوں حکومتوں سے
یعنی اپیروس اور مقدونیہ سے برابر کی جوڑ ہوکر لڑ چکے تھے۔ ۲۳۸ میں ان لیگوں
نے درآنحالیکہ مصر انکا مددگار نہ تھا پھر مقدونیہ کا مقابلہ کیا جسکی کمک پر اسوقت
اپیروس موجود تھا۔ لیکن یونان کے متعلق گوناٹاس کی تدابیر سیاست میں ناکامی کا اندازہ
اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ سے ۲۰ برس پہلے ایتھنز اور اسپارٹا نے بھی
یونانی ریاستوں پر گوناٹاس کی طرح قابو پانے کی جرأت کی تھی لیکن یہ جرأت اس
حالت میں کی تھی کہ مصر بلکہ غالبًا اپیروس بھی ایتھنز اور اسپارٹا کا طرفدار ہوکر لڑائی
میں مصروف ہوا تھا۔
خاص وجہ اس عجیب فرق کی جو ان ریاستوں اور لیگوں کے تعلّقات میں

پیدا ہوا یہ تھی کہ اس درمیانی زمانہ میں کہ اکایا والوں نے ایٹولیا والوں کی مثال
کا تتبع کرکے قوت حاصل کی اور اپنے لیگ میں غیر قوموں اور ریاستوں کو شامل کرنا
شروع کیا اکایا والوں کو کوئی نون یعنی لیگ کی حیثیت مدت سے حاصل تھی لیکن
۲۵۱ ؁ تک اُنکے لیگ میں بیوشیا کے لیگ کی مثل جیسے کہ ۳۸۷ ؁ سے پہلے اس کی
صورت تھی اور ایٹولیا والوں کے لیگ کی مثل جیسے کہ لفائی پر قبضہ ہونے سے قبل
(۲۹۲) اُسکی صورت تھی صرف وہ ہی گروہ شریک ہوتے تھے جو خاص اکائی قوم سے
ہونے تھے۔ ایٹولیا والوں نے اپنے علاقوں کو ولفائی کی "مجلس ہمسایگان" کی مدد سے
وسعت دی تھی۔ اکایا والوں کو ترقی کیلئے اِس قسم کا کوئی وسیلہ نصیب نہ تھا۔ ان کے
لیگ کی وسعت اور اسمیں "غیر" قوموں کی شرکت کا باعث ایک "غیر" شہر یعنی سکیون
(۲۳۶) کا ایک شہری ایراتوس نامی ہوا سکیون سب سے پہلا غیر شہر تھا جو اکائی لیگ میں شامل
ہوا۔ ایراتوس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس لیگ کی سرداری حاصل کرنے میں جس قدر
اختیارات ملنے کا موقع ملتا ہے وہ ریاست سکیون کا ایک غیر آئینی حاکم ہونے میں
حاصل نہ تھا کیونکہ یہ منصب اسوقت تک حاصل رہ سکتا تھا جب تک کہ نیمی کے کاہن
کی طرح آخرکار قتل نہ ہوجائے یا گوناٹاس بادشاہ مقدونیہ کی نظروں سے نہ گرجائے۔ ایراتوس
کی کوشش سے اس لیگ کے قدم ایک غیر قوم کی زمین پر پہنچ گئے اور وہاں ترقی
کیلئے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ اکائی شہروں کے اتحاد میں جو بڑی شرط ہمقوم
ہونے کی چلی آتی تھی وہ منسوخ کردیجائے۔ چنانچہ اسکی جگہ محض مشارکت رکھنے
کا وعدہ لیگ کی شرکت کیلئے کافی سمجھا گیا۔ اسکے ساتھ ہی یہ پرانا خیال بھی جو مدت
سے دلوں میں جاگزیں تھا کہ کسی ریاست کا شہری ہونا اس ریاست کے شہریوں
کے ساتھ ہم قوم ہونیکی دلیل ہے متروک کیا گیا۔ اس خیال کے ترک کرتے ہی لیگ
کیلئے ترقی کی وہ راہیں کھل گئیں جو نہ شہری ریاستوں کو حاصل تھیں اور نہ گروہی
ریاستوں کو۔ اور اس کا نفع ایٹولیا اور اکایا والوں نے جہانتک ممکن ہوا اٹھایا۔
یہ لوگ اس نکتہ کو بخوبی سمجھے ہوئے تھے کہ ایک لیگ کے نظم حکومت کے لئے
جسمیں آجتک کی ترقیاں شامل ہوں جملہ ادارات سیاسی (انسٹی ٹیوشن) کا جن
سے شہری حکومت کا تعلق ہو موجود رکھنا ضروری ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ایٹولیا

والوں نے جسوقت ۳۲۲ سنہ - ۳۱۴ سنہ میں اپنا لیگ قائم کیا انھوں نے اپنی قوم کے
تیس پرانے گروہوں اور اپنے متعدد مواضعات کو چھوڑ کر انکی جگہ بیس یا چالیس
شہروں کو اپنے انتظام میں کر لیا۔ مگر اُنھوں نے ابواب سیاست کا لیگ میں
برابر موجود رکھنا ہی ضرور نہ سمجھا بلکہ اسکی ضرورت بھی سمجھی کہ ان کے طریقۂ مشارکت
میں ایسی ریاستوں میں سے ہر ایک ریاست کو جو پہلے سے قائم چلی آتی ہے انتخاب
ونیابت کی اغراض کے لئے ایک فرد بسیط مانا جاوے۔ اسکا ذکر اوپر آچکا ہے کہ (۲۳۷)
بیوشیہ کے لیگ میں یا یونانی لیگ میں جسکو فیلقوس ثانی نے قائم کیا تھا ایسا نہیں
کیا گیا تھا۔ اِن میں جو ارکان مختلف مقامات سے نائب و نمایندے بنکر مجلس لیگ
میں بیٹھتے تھے انکو حق نیابت ایسے مقامات کی تعداد آبادی کا لحاظ کر کے دیا گیا
تھا۔ اور نیابت کی اغراض کیلئے شہر نہیں بلکہ اضلاع جدا جدا افراد قرار دئے
گئے تھے۔ اور جب کسی ایک ہی ضلع میں کئی کئی چھوٹے شہر نیابت کی غرض سے شامل
سمجھے گئے تھے تو ان شہروں کو شکایت پیدا ہوئی تھی کہ ایک ناگوار فرق اور تمیز
پیدا کر کے انکے ساتھ بدسلوکی کیگئی ہے۔ چنانچہ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکے
دل پھر گئے اور وہ بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔ یہ امر کسی یقین کیساتھ بتانا ممکن
نہیں کہ اکائی شہروں میں مساوات کس درجہ موجود تھی۔ صرف اسقدر اطلاع ملتی
ہے کہ ووٹ لینے کا طریقہ شہر وار تھا۔ لیکن یہاں میری رائے میں ہم کو اس نتیجہ پر
پہنچ جانیکی اجازت ہے کہ اس اصول پر ہر ایک شہر کیلئے محض ایک ووٹ رکھا گیا
ہوگا۔ کیونکہ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ پرانی اکائی شہروں نے جسوقت
سکیون کورنتھ - میگالوپوس اور آرگوس کے بڑے شہروں کو اپنے لیگ میں شریک
کیا ہوگا تو انھوں نے اِن کثیر الآباد شہروں میں انکی آبادی کی نسبت سے انکے
ووٹوں کی تعداد قائم کر کے اپنے تئیں اسی درجہ کو پہنچایا ہوگا جو درجہ بیوشیہ کے
چھوٹے چھوٹے چھیل والے شہروں کا ہوا تھا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ یہ ہی نتیجہ اکائیو
کی مجلس نائبین (سائنود) کے بارے میں نکالنا درست ہوگا جو متعلقہ شہروں
سے چند آدمیوں کو باری باری منتخب کر کے بنائی جاتی تھی۔ بلکہ انکی ابتدائی
مجلس کے بارے میں بھی جسکو سن کلیتوس کہتے تھے یہ ہی نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا۔

جسمیں تیس[۳۰] برس سے اونچی عمر کے تمام شہری شریک ہو سکتے تھے۔ بلکہ یہ ہی نتیجہ
ایٹولیا والوں کی دونوں مجلسوں کے بارے میں بھی نکالنا درست معلوم ہوتا ہے جسمیں
سے ایک کو معمولی اور دوسرے کو غیر معمولی مگر دونوں کو ابتدائی مجلسیں کہنا
مناسب ہے۔ مگر یہ نتیجہ ایٹولیا والوں کی کونسل کے بارے میں درست نہیں سمجھا
جاسکتا کیونکہ اِس کونسل کے ارکان کی تعداد متعلقہ شہروں کی وسعت کے اعتبار (۲۴۸)
سے قائم کیگئی تھی۔ پس اِس اعتبار سے اکایا اور ایٹولیا کے لیگ پرانے لیگوں
کے مقابلہ میں ایک برعکس صورت دکھاتے تھے۔ اکایا اور ایٹولیا کے لیگوں کو یہ امید تھی
کہ اسوقت شہری ریاستیں مرکز سے باہر کی طرف نکلنے کیلئے جو قوت ظاہر کر رہی ہیں
اُس قوت کو کسی طرح مائل بہ مرکز کر دیا جائے اور اسکے لئے یہ ہی طریقۂ عمل مناسب
سمجھا کہ شہری ریاستوں کی زمین پر اپنے طریقۂ مشارکت کو مستحکم بنیاد پر قائم کر دیں۔

اس کام کو وہ ایک خاص حد تک انجام دیسکے اور اسکے انجام دینے میں
اسوجہ سے زیادہ آسانی ہوئی کہ انکے ہر ایک گروہ میں اس بات کی کمی تھی کہ کوئی شہری
ریاست جسکو سیاسی اور معاشی اقتدار پہلے سے حاصل ہوتا ایسی موجود نہ تھی شہری
ریاستوں میں مساوات کا ہونا ایسی چیز نہ تھا جو اکایا اور ایٹولیا کے اصلی واقعات اور حالات
سے نظر کھا جاتا۔ پس یہ اصول قرین انصاف معلوم ہوا کہ بلالحاظ اُس طاقت کے جو
ارسطاطالیس نے بیان کی تھی ہر ایک شہری ریاست کو مجمع مشارکت میں صرف ایک
ووٹ دینے کا اختیار ہو اور اسکے ساتھ ہی مشارکت کی مجلس خاص (دیمی ارگی
ابو کلیٹی) اور مشارکت کی انتظامی جماعت (استراٹیگس۔ ہی پارک۔ معتمد ریاست
خزانچی۔ و خزانہ داروں) کو انتخاب ارکین کے اختیارات بھی حاصل ہوں۔
اس سے پہلے زمانہ میں بیوشیہ اور ہیلاس کا لیگ تھیبس اور مقدونیہ کی قوت
سے جو بہت بڑھی ہوئی تھی قائم ہوا تھا۔ اور ان با اقتدار ریاستوں نے اس بات
کی احتیاط رکھی تھی کہ اِن لیگوں کے آئین و قواعد میں اپنا حق پیشوائی قائم رہے۔ اسکے
برعکس اکایا اور ایٹولیا کے لیگ اسمیں شبہ نہیں کسی قدر ریاستہائے مشمولہ کی باہمی
مصالحت کا نتیجہ ضرور تھے۔ لیکن اُنکے قائم ہونے کا اصلی سبب استبداد خارجی
تھا۔ شروع میں تحریک مشارکت کی بنیاد کسی ایک شہر کی کوشش پر نہیں

(۲۳۹) رکھی گئی تھی۔ بلکہ اسکی بنیاد ایسی ضرورت پر رکھی گئی تھی جو سب کو محسوس ہو رہی تھی اسوجہ سے اکائی لیگ کا صدر مقام ایجیوم اور ایٹولیا کے لیگ کا صدر مقام تھرمون کے شہر قرار پائے جہاں تمام گروہ بلا تکلف ملاقات کر سکتے تھے جیسے کہ اسوقت امریکہ میں واشنگٹن۔ اوٹاوا۔ اور کان بیرا کے شہر ہیں۔ یونانی لیگوں کی تاریخ میں یہ بات کسیقدر نئی تھی۔

ان یونانی لیگوں کی اور خصوصیات بھی ایسی ہیں جن میں سیاست خارجہ کے متعلق نئی نئی باتیں پیدا کرنے کی قوت موجود تھی اور یہ امر قریب ناگزیر تھا کہ اس زمانہ میں جبکہ انتظامی لیاقت اعلیٰ درجہ کی پیدا ہو گئی تھی تمام ریاستیں کسی سلسلۂ حکومت شاہی میں منتظم کر دی جاویں۔ پس جسطرح بیوشیہ کے لیگ میں گیارہ بیوتارک اور تیسری صدی قبل مسیح کے اکرنانی لیگ میں سات جرنیل ہوتے تھے اسیطرح ایٹولیا والوں میں جب سے کہ انکا لیگ قائم ہوا تھا اور اکایا والوں میں سرداری صرف ایک شخص کو ملتی تھی۔ اسلئے ہر ایک کام باہمی اتفاق و یگانگی سے اسطرح انجام دیا جاتا تھا کہ کسی اور صورت میں ایسا ممکن نہ تھا۔ اور یہ وہ چیز تھی جسکا عدم خواہ سیاسیات داخلی میں محسوس نہ ہوتا لیکن معاملات خارجہ میں ہمیشہ موجب نقصان رہتا۔ چونکہ زمانہ کا طرز اب بادشاہی حکومت کا ہو گیا تھا۔ اسلئے آزاد ریاستوں کو بھی اس طرز کی کسیقدر رعایت کرنی ضروری ہوئی۔ مگر یہ رعایت بہت ہی پس و پیش کے بعد ایک ایسی شرط کیساتھ ملی جس نے حکومت شاہی کے زہر سے اسکی بہت کچھ سمیت دور کر دی۔ وہ شرط یہ تھی کہ ایک ہی شخص بیچ میں ایک ایک سال چھوڑ کر لیگ میں جرنیل کے عہدہ پر رہ سکتا ہے۔ یعنی اگر ایک سال وہ شاہ بے تاج بنکر سرداری کرتا تھا تو دوسرے برس اسکی حیثیت محض ایک معمولی شہری کی ہو جاتی تھی۔

اسکے علاوہ ایک اور شکل میں یہ بات صاف ظاہر ہوتی تھی کہ اکایا کے لوگ شاہی طرز حکومت سے بدگمان ہیں اور غیر آئینی حاکم کے تسلط سے جیسا انٹی گونس گوناٹاس نے یونانی شہنشاہی کی بنیاد رکھی تھی انہیں نفرت کا مادہ موجود ہے۔ کسی شہر کا ایک غیر آئینی حاکم کے تسلط میں رہنا اور اسکے ساتھ ہی ایسے شہر کا

لیگ میں شامل ہونا ایک قسم کا اجتماع ضدین تھا۔ لیکن اس قسم کے اجتماع کی
ضرورت مشارکت کے قوانین بلاشبہ پیدا کرتے تھے۔ ان قوانین مشارکت
سے مراد چند عہد نامے تھے جو ۲۰۵ ق م ریاستہائے قدیم سے اور بعد کو نئی (۲۴۰)
ریاستوں سے ہوئے تھے جو لیگ میں شامل ہوئی تھیں۔ یا ان قوانین کے مندرجہ حلف نامے تھے
جو وقتاً فوقتاً خاص خاص مجالس وضع قوانین نے تیار کئے تھے۔ ان قوانین مشارکت
کی پابندی بھی ہر ایک ریاست کے لوگوں پر ایسی ہی لازمی تھی جیسے کہ انکی خاص
ریاست کے قوانین کی تھی جنکو ریاست کے لوگوں نے خود وضع کیا تھا۔ مگر باوجود
اسکے ہر ایک ریاست آزاد تھی جس طرز حکومت کو اپنے لئے پسند کرے اسکو اختیار
کرے۔ لیگ کو کوئی خاص طرفداری نہ عمومی طرز حکومت سے تھی اور نہ عدیدی طرز
حکومت سے۔ البتہ جو طریقہ لیگ کے کام کا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ دولتمند
لوگوں کے ذریعہ سے حکومت ہونے کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ لیگ کا بڑا کام یہ تھا کہ تمام
ریاستوں کے مقامی نظم حکومت میں ایک قسم کی یکسانی پیدا کردے۔ جو کام اس نے
اپنی مشمولہ ریاستوں کے حق میں سب کیلئے قابل تعریف کیا وہ روپیہ کا انتظام تھا
چنانچہ سکہ کا معیار قرار دینا حکام لیگ سے متعلق کر کے اس کا جاری کرنا ریاستوں
کے اختیار پر چھوڑا۔

اکایا اور ایٹولیا کے لیگوں کے آئین و دستور کو دیکھنے سے یہ امر بھی منکشف
ہوتا ہے کہ انتی گونس گوناتاس کے مسلک سیاسی نے اسکی جان اور اسکے ملک کے
خطرناک دشمن پیدا کرنے میں کیا بڑا حصہ لیا۔ یہ سچ ہے کہ گوناتاس کا لڑکا دیمی تریوس
ثانی اکایا اور ایٹولیا سے ایسا جی توڑ کر لڑا کہ انکو آگے قدم بڑھانے کی جرأت
نہیں ہوئی۔ ایٹولیا سے لڑکر اسکے مقبوضات کا بڑا حصہ چھین لیا۔ دیمی تریوس (۲۴۱)
کے یہ معرکے وہ تھے کہ اگر ریاست اپیروس اسکا ساتھ چھوڑ کر اکایا اور ایٹولیا
سے نہ ملجاتی یا اگر ایلیریا کے قزاق جنکو دیمی تریوس نے اپیروس کی تاخت وتاراج
پر آمادہ کردیا تھا رومانیوں کو برانگیختہ کر کے انکو بحر ایڈریاٹک عبور کرنے پر مجبور
نہ کردیتے یا اگر دردانی قوم مقدونیہ پر خروج کر کے دیمی تریوس کو لڑائی میں
شکست دیکر ہلاک نہ کردیتی تو یقیناً دیمی تریوس بزور شمشیر اکایا اور ایٹولیا کے

دونوں لیگوں کو بالکل فنا کر دیتا۔ لیکن یہ "اگر و مگر" کے ساتھ قیاسات اسوجہ سے کئے جاتے ہیں کہ متعدد سیاسی اشکال کا پیدا ہونا اور مقدونیہ کی اس کشمکش میں کہ کسطرح یونان کی سرگروہی اسکو ملجاوے ہر طرح کی پیچیدگیوں کا پیدا ہونا بالکل ممکنات سے تھا۔ مگر اسوقت ان پیچیدگیوں کا نتیجہ مقدونیہ کے حق میں ایسا مضر نکلا کہ لیگوں کو پوری کامیابی و سرسبزی کا موقع ملگیا۔

لیکن وہی چیز جو ان لیگوں کی کامیابی و سرخروئی کا موجب ہونی چاہیئے تھی وہی انکی تباہی کا باعث ہوگئی۔ پولی بیوس مورخ اکائی سردار ایراتوس کی رائے سے اتفاق ظاہر کر کے اس تباہی کی خاص وجہ ایٹولیا والوں کو قرار دیتا ہے۔ اور قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسکا یہ خیال بہت کچھ صحیح ہے اکایا کیلیئے یہ ایک نہایت نازک وقت تھا۔ جن اصول پر اسکا لیگ قائم ہوا تھا اسکے متعلق اسوقت یہ پیچیدہ مضمون زیر بحث تھا کہ اسپارٹا اور ایتھنز اپنی ریاستوں کو اکائی لیگ کی دیگر ریاستوں کیساتھ مساوی الدرجہ سمجھیں۔ لیکن یہ دونوں ریاستیں اکائی لیگ کی مشمولہ ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھیں۔ اور ان ریاستوں کو اس میں کلام تھا کہ اوروں کو اپنے برابر سمجھیں۔ غرض جسوقت اکایا والے اس مشکل میں مبتلا تھے ایٹولیا والوں نے یہ حرکت کی کہ اکایا والوں کو اس مشکل میں چھوڑ کر مقدونیہ کے نئے بادشاہ انتی گونس دوسن سے اپنے حق میں مفید شرائط کر کے ایک عہد نامہ لکھدیا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آرکیدیا میں جسقدر شہر انکے پاس تھے (مثلاً تیلیا۔ مانتی نیا۔ ارکومیوس۔ کافیلی۔) ان سب کو اسپارٹا کے حوالے کردیا۔ اور اسپارٹا کے نوجوان بادشاہ کلیومنیز کو موقع دیا کہ وہ پیلوپونیسس میں اکایا والوں کے جسقدر مخالفین تھے
انکو اپنے علم کے نیچے جمع کر کے ایک مرتبہ پھر اسپارٹا کو یونان کا سرگروہ بنانے میں (۲۴۲)
کامیابی کے ساتھ کوشش کرے۔ اس مضمون کے متعلق دوسرا خیال یہ ہے کہ کلیومنیز بادشاہ اسپارٹا کے پنجے سے بچنے کیلئے اکایا کے لیگ نے انتی گونس دوسن کی پناہ لی اور اس لیگ کی تباہی کا باعث بادشاہ مصر بطلیموس ثالث کی دست اندازی ہوئی۔ اسنے اسپارٹا اور ایتھنز۔ اور ایٹولیا کو دوستی کا اظہار کر کے

اور رشوت دیکر اوبھارا۔ اور وہ بہت خوش ہوتا اگر اکایا بھی علیحدہ ہوکر اس بات کا موقع دیتا کہ کل یونان متفق ہوکر انتی گونس دوسن کا مقابلہ کرتا۔ بہرکیف اس وقت معاملات کی جو صورت تھی اسمیں جسقدر فائدہ کی باتیں پیدا ہوئیں وہ سب دوسن کا حصہ ہوگئیں۔ اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ فائدہ جو کچھ ہوا وہ غیر واجبی تھا۔ دوسن اس موقع پر جو کچھ کرسکتا تھا وہ اُسنے کیا یعنی وہ اور ریاستوں کے ساتھ اس بات کا ضامن ہوگیا کہ ایتھنز اس معاملہ میں کسی کی طرف نہ ہویگا۔ مگر اس صورت نے اکائی لیگ کے سردار ایرانوس کو ایک بڑے فائدے سے محروم کردیا۔ کیونکہ وہ ایتھنز کو اپنے لیگ میں شامل رکھنا چاہتا تھا۔ دوسن کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ اور اگر وہ ۲۲۲ ق م میں سلیسیا کے مقام پر کلیومینز پر فتح پانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نہ مرجاتا تو تاریخ میں جسقدر نام پیدا کرچکا تھا اُس سے کہیں زیادہ نام پیدا کرلیتا۔ اس نازک زمانہ میں جس لیاقت اور دانشمندی سے اس نے کام کیا اُس کی قدر سلطنت مصر کی کمزوری اور پست ہمتی کو دیکھکر اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے۔ مصر کی پست ہمتی کیلئے سوائے اسکے کوئی عذر نہ تھا کہ بادشاہ بطلیموس یوارگتیس کا حال میں انتقال ہوگیا تھا اور انتی اوکس بادشاہ شام نے مصر کو دبدبے دکھانے شروع کردئے تھے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انتی گونس دوسن کو جسقدر اچھے موقع ملے اُس نے اپنے کام میں تاحد امکان لیاقت صرف کی۔

انتی گونس دوسن نے ریاستہائے یونان کے معاملات کو جس طریقے سے طے کیا اس میں سب سے مخصوص بات یہ تھی کہ فیلقوس اعظم نے اپنے زمانہ میں یونانی ریاستوں کی جو مجلس عام قائم کی تھی اُسکو پھر زندہ کردیا۔ اور تمام ریاستوں کے نائب باضابطہ طریقے پر پھر کورنتھ میں جمع ہونے لگے۔ (۲۲۴ ق م)۔ انھوں نے بادشاہ مقدونیہ کو اپنا سرگروہ منتخب کیا۔ اس کے بعد (۲۲۴)
یہ قاعدہ قرار دیا کہ ہیلاس کا سرگروہ جو مقام اور وقت مقرر کریگا اسی کے مطابق یہ مجلس ہمیشہ اپنا اجلاس کیا کریگی۔ جن ریاستوں سے مجلس قائم ہوئی تھی اُنکے نام شمار کرنے سے معلوم ہوجائیگا کہ مقدونی دور میں ہیلاس کی

دستوری ترقی کس طور پر عمل میں آئی۔ ہیلاس کی اِن ریاستوں میں مقدونیہ۔ تھسالیہ۔ اپیروس۔ اکرنانیہ۔ لوکریس۔ فوکس۔ بیوشیہ۔ یوبیا۔ اکایا۔ اور غالبًا جزیرے والے بھی شامل تھے۔ انمیں مقدونیہ کی حیثیت ایک بادشاہی حکومت کی تھی باقی سب لیگ تھیں۔ فیلقوس نے اپنے زمانہ میں جسوقت مجلس قائم کی تھی تو شہری ریاستیں ہی سب کچھ تھیں مگر اب اُنکی صورت شہری ریاستوں کی نہ رہی تھی بلکہ لیگوں نے اُنکو اپنا حصہ بنا لیا تھا۔ اسکا حال معلوم نہیں کہ اس ترکیب میں جو افراد قائم ہوئی تھیں اُن میں ہر فرد میں ووٹوں کی تعداد برابر رکھی گئی تھی یا ہر فرد کے رقبہ کی مناسبت سے ووٹوں کی تعداد قرار پائی تھی جیساکہ فیلقوس کے زمانے میں ہوا تھا۔ قیاس غالب یہ ہے کہ رقبہ کی مناسبت سے ووٹوں کی تعداد قرار دی گئی تھی بہر صورت مقدونیہ کے نائب اس مجلس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور مقدونیہ کے فائدے کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اور تھسالیہ اور دیگر ریاستہائے ماتحت کو اپنا ہم خیال بناکر مجلس کے جلسوں میں کثرت رائے اپنی طرف کر لیتے تھے۔ فیلقوس اپنے زمانہ میں اور انتی گونس دوسن اپنے وقت میں مقدونیہ پر بادشاہی کرنے کے علاوہ یونان کے سرگروہ بھی تھے۔ مگر اس ہیلینی لیگ کی حیات ثانی میں کوئی ایسی جماعت انتظامیہ نظر نہیں آتی جیسے کہ پرانے لیگ میں حفاظت عامہ کیلئے ایک مجلس بنائی گئی تھی۔ لیکن اب ایسی کسی مجلس کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔
کیونکہ جسوقت اس جدید لیگ میں مجلس عامہ اجلاس نہ کرتی تھی اسوقت تمام (۳۴
مشمولہ لیگوں کے حکام (جرنل) قدرتی طور پر ان لیگوں کے نمایندے سمجھے جاتے تھے پس اِن حکام (جرنیلوں) کا بھی انتی گونس دوسن کے انتظام میں جو لیگ سے متعلق تھا لحاظ کیا گیا تھا۔

انتی گونس گوناتاس کی حکمت عملی کی تردید میں جمہوریت کا جوش و خروش ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اور یہ امر اس غور و فکر سے ظاہر ہوتا ہے جو انتی گونس دوسن سے اس معاملہ میں ظاہر ہوا۔ لیگ کے عام مجمعوں (اسیمبلیز) میں جو پرانا طریقہ چلا آتا تھا کہ سیاسیات خارجہ کے اہم معاملات کو یہ مجمعے ہی طے کریں اس طریقے کو انتی گونس دوسن نظرانداز نہ کر سکا۔ پس جو مجلس لیگ (سائنود)

اُس نے قائم کی وہ فیلقوس کی مجلسِ لیگ (سا ینود) سے فرق رکھتی تھی بالخصوص
اس اہم معاملہ میں کہ اگر اُس نے اعلانِ جنگ یا صلح یا اسی قسم کے دیگر معاملات میں حکم
صادر کیا ہے تو اُس کی تعمیل کیلئے حکام لیگ کی منظوری لازمی ہوتی تھی۔ اور بظاہر جو
حکام ایسے حکم کی منظوری دیتے تھے کم سے کم اُن پر اُس حکم کی تعمیل ضروری تھی غرض
دوسرے لفظوں میں یہ سمجھنا چاہیے کہ دوسن کی مجلسِ لیگ (سا ینود) کو اس کے
عام مجمعوں (اسمبلیز) سے وہی نسبت تھی جو اکایا والی مجلس لیگ (سا ینود)
کو سنکلیتوس سے تھی۔ پس قدرتی طور پر جو گروہ لیگ میں شامل ہو چکے تھے
اُن کی اتنی بھی مجال نہ تھی کہ جب چاہیں اُس گروہ بندی سے نکل جائیں۔ لیگ
کے دشمنوں سے جا ملنا تو چیزِ دیگر تھا۔ پس ایسی صورت میں اگر کسی گروہ نے
مجلس لیگ (سا ینود) کے اُس فیصلہ کو کہ جنگ شروع کیجائے تسلیم کرنے سے
انکار کر دیا ہے تو پھر اعلان جنگ پر اس گروہ کو صرف ایک بے طرفی کی حالت اختیار
کرنی پڑتی تھی۔ فیلقوس کے زمانے میں اگر کسی حلیف ریاست کا کوئی سپاہی ایسی
لڑائی سے جو بہ اتفاق رائے شروع کیگئی ہے غیر حاضر ہو جاتا تھا تو اُس ریاست
کو جسکا وہ سپاہی ہوتا تھا جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ سوار کی غیر حاضری پر ۳۰
درا گما عزلی ہتیار رکھنے والے پیدل کی غیر حاضری پر ۲۰ درا گما اور معمولی پیدل کی
غیر حاضری پر ۱۰ درا گما اور ملاح کی غیر حاضری پر ۷ یا ۸ درا گما جرمانہ دینا ہوتا تھا۔ اب
صورت یہ تھی کہ لیگوں کو اختیار تھا کہ وہ ملکر کام کرنے سے انکار کر دیں اور کسی قسم کے
تاوان یا جرمانہ کے مستوجب نہوں۔ اسمیں گویا انھوں نے آپس میں لڑنے کے اختیار
سے اور باہر کی ریاستوں سے سازش کرنے کے اختیار سے دست برداری کرلی تھی (۲۴۵)
لیکن ڈپلومیسی کا صیغہ یعنی ریاستہائے غیر سے سیاسی تعلقات میں چالیں چلنے کا
اختیار انھوں نے بالکل ہی لیگ کے سرگروہ کے ہاتھ میں نہ چھوڑا تھا۔ گو اِس
بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ کسی باہر کے بادشاہ سے نامہ و پیام نہ کرینگے۔ اندرونی
معاملاتِ ریاست میں کسی قسم کی دست اندازی کا اختیار انھوں نے اپنے سرگروہ
کو نہ دیا تھا۔

ہر گروہ کے ذاتی و مقامی خیالات کا پاس کر کے یہ فیاضانہ رعایتیں انٹی گونس دوسن

سے عمل میں آئی تھیں تاکہ کل یونان پر شاہانِ مقدونیہ کی سرگروہی کو ہمیشہ کیلئے مستحکم کرنے کے بارے میں پوری کوشش ہو سکے۔ اقوام عالم کی تاریخ میں انتی گونس دوسن سے پہلے کسی فاتح نے اپنی قوت کو ایسے شریفانہ طریقہ پر نہیں برتا۔ یہ واقعہ ہے کہ دوسن نے یونانی ریاستوں میں اسدرجہ سلوک پیدا کر دیا تھا کہ لیگ قائم کرنے کی جو غرض تھی یعنی ضرورت کے وقت سب ملکر دشمن کا مقابلہ کریں وہ ہی باقی نہ رہی تھی۔ یہ باہمی سلوک اُسنے اِس درجہ پیدا کر دیا تھا کہ اگر وہ دیمی تریاس کالکس اور کورنتھ کے شہروں سے جنکو ہیلاس کی بیڑیاں کہا جاتا تھا مقدونی فوجوں کو اٹھا بھی لیتا اور نئے بلاد مفتوحہ ارکومیوس۔ اسپارٹا اور میسینی کو بجائے مرکزی حکومت کے گروہوں کے لیگ میں شامل کر دیتا اور اُسکا اقبال بھی ایسا بلند نہ ہوتا جیسا کہ فی الواقع وہ تھا تو بھی یہ تصور کرنا دشوار تھا کہ ہیلینی لیگ کبھی کسی سے لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہوتا۔ لیکن دوسن جس بات کی نسبت فی الحقیقت اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ جسوقت لڑائی کے میدان میں وہ دشمن کا مقابلہ کرتا ہو تو لیگ کے جو گروہ اسکے ساتھ ہو کر لڑائی میں شریک نہیں ہوئے ہیں وہ لڑائی میں کسی طرف نہ بولیں۔

بہرکیف یہ ہی وہ چیز تھی جس کو ۲۲۰ سنہ ق م کے معرکہ میں فیلقوس پنجم یعنی انتی گونس دوسن کا جانشین حاصل رکھ سکا۔ ایٹولیا والوں نے جب بار بار لڑائی کا تقاضا کیا تو فیلقوس نے آخر کار ہیلینی لیگ کی مجلس سے لڑائی کی منظوری حاصل کرلی ایٹولیا والے جانتے تھے کہ فیلقوس اس وقت مقدونیہ کی بادشاہت کے ساتھ یونان کی سرگروہی بھی رکھتا ہے مگر بالکل نوجوان اور ناتجربہ کار ہے اسلئے موقع ہے کہ اس کے استحقاقِ سرگروہی پر جس کی حالت ابھی تک نازک ہے ایک وار کیا جائے۔ چنانچہ ایک لڑائی کا سلسلہ چھڑ گیا جس کو "جنگ معاشرت" کہتے ہیں (۲۲۰ - ۲۱۷)۔ اگر دوسن اس لڑائی کو لڑنے کیلئے زندہ ہوتا تو ایٹولیا والوں کو محض اپنی فوج کی کثرت سے پامال کر دیتا اور تمام یونانی ریاستوں کو متفق کر کے تن واحد بنانے کے کام کو بھی ختم کر جاتا۔ فیلقوس پنجم نہایت جوانمردی و خوش تدبیری سے لڑائی میں مصروف ہوا۔ کیا دوست اور کیا دشمن سب نے اُس کی شجاعت کی داد دی۔ لیکن لڑائی کا

نتیجہ ظاہر ہونے سے پہلے حنابعل سپہ دار قرطاجنہ اور اہل روما کی لڑائی اب اس اہم
درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ یونانی ریاستوں کے مسئلۂ سرگروہی کے حل کرنے میں اس جنگ کے
حالات پر غور کرنا اور اُنکا لحاظ کرنا بھی ایک لازمی امر ہوگیا۔

اسکے بعد جب صلح کی غرض سے ایک مجلس قائم ہوئی تو اس مجلس میں
نیو پاکتس کے اگیلاس نے ذیل کی تقریر کی " بس۔ اب یونان کو متحد و متفق ہو جانا
چاہئیے۔ کسی یونانی ریاست کو دوسری یونانی ریاست پر حملہ نہ کرنا چاہئیے۔ اگر وہ
آپس میں مل کر امن و آشتی کیساتھ رہ سکیں تو اسپر خدا کا شکر کریں۔ جس طرح دریا اترنے
میں سہارے کے لئے لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اسیطرح اب ایک دوسرے
کی دستگیری کر کے اپنی ریاستوں کو غنیم کی دست برد سے بچاؤ۔ اسکی توقع رکھنی کہ
ہم میں ہمیشہ سلوک رہیگا کسی قدر زیادتی کی بات ہوگی مگر کم سے کم اس وقت تو
سب دوست بن جاؤ۔ یہ وہ وقت ہے کہ تمام یونانی ریاستیں اپنی آنکھوں دیکھ رہی
ہیں کہ کیسی بے شمار فوجیں اس وقت لڑائی میں مصروف ہیں۔ اور دیار مغرب میں
جو کشمکش اس وقت برپا ہے وہ کیسی ہیبت ناک ہے۔ پس جب حالت یہ ہے تو باہم
متفق ہو کر اپنی حفاظت و حصانت پر ہمہ چشم و ہمہ گوش ہو جاؤ۔ کوئی شخص جو آجکل
کی حالت کو معمولی نظر سے بھی دیکھیگا اُس کو مطلق شبہ نہیں رہیگا کہ آگے کیا ہونیوالا
ہے۔ مغرب کے موجودہ معرکۂ عظیم میں خواہ روما قرطاجنہ کو مغلوب کرے اور خواہ
قرطاجنہ روما کو محکوم بنائے مگر غلبہ جس کسی کو ہوگا وہ محض الیطالیہ اور صقلیہ کو اپنا
غلام بنانے پر قناعت نہ کریگا بلکہ آگے بڑھکر لڑائیوں کا ایسا جال پھیلائیگا جسمیں
ہم کو اپنی خیر نظر نہیں آتی۔ پس تمام یونان کو ہوشیار و خبردار رہنا چاہئیے اور (۲۴۷)
سب سے زیادہ فیلقوس بادشاہ مقدونیہ کو۔ اے بادشاہ تیری سب سے
بڑی قدر و قیمت اس میں ہے کہ اس وقت تو تمام یونانیوں کا سرگروہ اور محافظ ہے
یونانی ریاستوں کو غارت کرنے سے پرہیز کر۔ اُن کو اتنا کمزور و ناکارہ نہ بنا کہ
وہ کسی لشکر کش کا قدم آتے ہی اسکا شکار ہو جاویں۔ بلکہ تیرا فرض ہے کہ جسطرح
تو اپنے تن بدن کو دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی چیز اس کو بے چین تو نہیں کرتی اسیطرح
یونان پر بھی حفاظت کی نظر رکھ۔ اور جس طرح تو اپنے فوائد کو سوچتا ہے اسیطرح

یونان کے ہر رکن کے نفع ونقصان پر بھی غور کر۔ اگر تو نے ان باتوں کو پیش نظر رکھا تو پھر کل یونان تیری خیر منائیگا۔ ہر ایک یونانی تیری دوستی و خیر خواہی کا دم بھریگا اور تیرے ہر کام میں بڑی مدد کریگا۔ دول خارجہ دیکھ لینگے کہ ہر ایک یونانی کو تجھ پر کیسا بھروسہ ہے اور پھر وہ تجھ پر یا اُن پر حملہ کرتے ہوئے ڈرینگے۔ اگر تجھکو کشور کشائی اور جنگ جوئی میں نام آور ہونے کا شوق ہے تو پھر اسکے لئے دوسرا امیدان کھلا ہے۔ ذرا مغرب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ اور ذرا اُس ہنگامہ عظیم پر نظر کر جو اسوقت ایطالیہ میں برپا ہے۔ یہ وہ لڑائی ہے کہ اگر تو تدبیر ولیاقت کو کام میں لائے تو اس وقت فریقین مقابل میں ثالث اور حَکَم بنکر ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور موقع پاتے ہی چوٹ کرکے دونوں لڑنے والوں کو اپنا محکوم بنا سکتا ہے۔ اگر تیرے دل میں اس قسم کا کوئی ارمان ہے تو سمجھ لے کہ اس سے بہتر موقع پھر نصیب نہ ہوگا۔ لیکن جہانتک یونانیوں سے تیری مخالفتیں اور لڑائیاں ہو رہی ہیں اُن کو کسی اور وقت کے لئے جو فرصت کا نکلے ملتوی کردے۔ اور یہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ کہ یونانیوں سے تو جب چاہے لڑائی کرے اور جب چاہے صلح۔ مگر اسکے ساتھ یہ بھی سمجھ لے کہ اُفقِ مغرب پر جو گھنگور گھٹا اس وقت امنڈی ہے وہ بڑھکر یونان اور یونان کے ہمسایہ ملکوں پر بہت جلد چھانے والی ہے۔ اور اس بات کا خوف ہے کہ ہماری لڑائیاں اور ہماری صلحیں اور یہ بچوں کے کھیل جو اس وقت ہم کھیل رہے ہیں یہ سب دفعتًا کافور ہونے والے ہیں۔ اور جسوقت یہ بلا سر پر آگئی تو پھر سب یہی دعا مانگتے (۲۴۸
نظر آئینگے کہ یارب کسی طرح ہم کو لڑنے اور صلح کرنے اور اپنے معاملات کو جو کچھ بھی وہ ہوں خود فیصلہ کرنے کی طاقت بلا وساطت غیرے عنایت کر۔"

اس مقررِ خوش بیان نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل سچ تھا۔ اور فیلقوس اُسکی نصیحت پر کاربند بھی ہوا۔ لیکن جسوقت روما سے لڑائی پیش آئی تو اس ہی تقریر کرنے والے کے ہم وطن ایٹولیا کے لوگ وہ نکلے جنھوں نے بادشاہ مقدونیہ پر عقب سے حملہ کرکے وہ ہی نتائج پیدا کر دئے جنکا خوف تھا۔ یعنی ۲۱۲ سنہ ق م کے بعد پھر کوئی زمانہ ایسا نہ آیا کہ یونانی کسی مسئلہ سیاسی کو جو اُن میں پیدا ہوا ہو بغیر دوسرے کا حکم لئے فیصلہ کر سکے ہوں۔ "جنگ معاشرت"

کے بعد مقدونیہ نے اس بات کا آخری موقع کہ یورپی ہیلاس میں ایک ریاست پیدا کرے ہاتھ سے کھودیا۔

تمت

اشاریہ

(ضروری اطلاع - یہاں جو صفحات درج ہوئے ہیں وہ کتاب میں حاشیہ کے صفحات ہیں نہ کہ پیشانی کے)۔

تمت

صحت نامہ یونانی شہنشاہیت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
فہرست مضامین			
۲	۹	سرگروہوں	سرگروہیوں
۴	۲۱	۳۵۵ سنہ	۳۹۵ سنہ
۸	۱۲	سلیبوفس	سلیوقس
متن کتاب			
۲	۲۲	غالب" ہے	غالب رہے"
۳	۱۵	کس	کسی
۱۱	۱۴	ڈھلکے	ڈھکیلے
۳۳	۷	ابتولیا	ایتولیا
۹۱	۲۳	بے قاعدہ	بے فائدہ
۱۰۱	۱۰	خوہ	خود
۱۰۲	۸	لولوں	لوگوں
۱۰۴	۷	اُس	اِس
〃	۸	اُس	اِس
〃	۱۰	اُس	اِس
〃	۱۱	اُس	اِس
۱۰۵	۱۷	غامص	غامض
۱۲۳	۳	ایرستھرا	ابرستھرا
〃	۳	پرنکایدی	برنکایدی
۱۲۸	۱۲	پڑا	پڑتا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۲۶	۲۳	یوبیمورس	یوبیمیرس
۱۴۰	۱۸	اپنی	اپنے
۱۵۶	۱	ہم کہ	اب ہم کو
〃	۳	فراغنہ	فراعنۂ
۱۵۸	۸	۷۰ سنہ	۲۷۰ سنہ
۱۷۶	۱۴	لولوالعزمی	اولوالعزمی
۱۸۴	۲۱	تگراتیس	تگرائیس
۱۸۶	۱۲	موبدوں	موبّدوں
۱۸۸	۱۵	لئے	نئے
۱۹۶	۸	کے	کی